اِسلام
اور
جدید معاشی مسائل
جلد پنجم
اِسلامی بنکاری اور دورِ حاضر میں اِس کی عملی شکل
۵
شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم
اِدارہ اِسلامیات

اِسلام

اور

جدید معاشی مسائل

جلد پنجم

اِسلامی بنکاری اور دورِ حاضر میں اِس کی عملی شکل

اِسلام
اور
جدید معاشی مسائل

جلد پنجم

اِسلامی بنکاری اور دورِ حاضر میں اِس کی عملی شکل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ترتیب و تالیف
مولانا مفتی محمود احمد صاحب
دارالافتاء جامعہ اشرفیہ۔ لاہور

اِدارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۴۳۹۹۱، ۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور جدید معاشی مسائل

جلد پنجم

اسلامی بنکاری اور دور حاضر میں اس کی عملی شکل

اشاعت اول

جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ ـــــ جون ۲۰۰۸ء

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+
۱۹۰- انارکلی، لاہور - پاکستان .... فون ۷۲۴۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵
موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی - پاکستان ..... فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے
ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی
دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

اِسلامی بینکاری

کی بُنیادیں

ایک تعارف

(An introduction to Islamic finance)

انگریزی تصنیف:

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی جسٹس محمد تقی عثمانی مدظلہم

اردو ترجمہ:

جناب مولانا محمد زاہد صاحب

عرضِ مترجم

جدید تجارت اور بینکاری کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل کر رہا ہے۔ علم کی اس شاخ میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ۱۹۹۸ء میں آپ کی اسلامی تمویل پر ایک کتاب "An Introduction to Islamic Finance" نظر سے گزری۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ اس میں ذکر کردہ مباحث جتنے بینکرز، دوسرے پروفیشنلز اور انگریزی دان طبقے کے لئے مفید ہیں اس سے زیادہ علماء کرام، دینی علوم کے طلبہ، بالخصوص فقہ و افتاء کے شعبوں میں کام کرنے والوں کے لئے مفید ہیں، لیکن ان حضرات کی اکثریت انگریزی زبان میں بے تکلف مطالعے پر قادر نہیں ہوتی۔ خیال ہوا کہ اس کتاب کی افادیت کا دائرہ ان حضرات تک وسیع کرنے کے لئے اسے اُردو کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ بنام خدا یہ کام شروع کر دیا گیا۔ اب یہ ٹوٹی پھوٹی خدمت کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کام کے دوران سب سے زیادہ مشکل انگریزی اصطلاحات کے اُردو متبادل تلاش یا منتخب کرنے میں پیش آئی، اس لئے کہ ہم نے اپنی معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی سے جس طرح اُردو زبان کو بے دخل کیا ہوا ہے اس کی وجہ سے ان شعبوں میں لگی بندھی اُردو اصطلاحات متعارف نہیں ہو سکیں۔ حتی الامکان قابلِ فہم الفاظ منتخب کیے گئے ہیں اور قوسین میں اصل انگریزی اصطلاحات بھی ذکر کر دی گئی ہیں۔ آخر میں ایک فرہنگ بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بعض مقامات پر حاشیے میں بھی اصطلاحات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

ہر بشری کام میں کمی کوتاہی رہ جانا ایک فطری امر ہے، خصوصاً اگر وہ اس ناچیز جیسے ناقص ہاتھوں سے انجام پایا ہو۔ اُمید ہے کہ قارئین ترجمے کی خامیوں سے مطلع فرمانے میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔ حق تعالیٰ اس حقیر کوشش کو نافع اور مقبول بنائیں۔

محمد زاہد
خادم الطلبہ
جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ، فیصل آباد
Zahidimdadia@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی الہ وصحبہ اجمعین، و علی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین۔ امابعد:

گزشتہ چند عشروں سے مسلمان اپنی زندگیوں کی اسلامی اصولوں کی بنیاد پر تعمیرِنو کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمان یہ بات شدت سے محسوس کررہے ہیں کہ گزشتہ چند صدیوں سے مغرب کے سیاسی اور معاشی تسلط نے انہیں خاص طور پر سماجی۔ معاشی (Socio Economic) شعبے میں خدائی ہدایت پر عمل سے محروم کررکھا ہے، اس لئے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد مسلم عوام اپنے اسلامی تشخص کے احیاء کی کوشش کررہے ہیں تا کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق منظم کرسکیں۔

معاشی شعبے میں مالیاتی اداروں کو اسلامی شریعت کے مطابق بنانے کے لئے ان میں اصلاح کرنا ان مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج تھا۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں پورا کا پورا مالیاتی نظام ہی سود پر مبنی ہو، غیر سودی بنیادوں پر مالیاتی اداروں کی تشکیل ایک بڑا کٹھن کام تھا۔

جو لوگ شریعت کے اصولوں اور اس کے معاشی فلسفے سے پوری طرح واقف نہیں ہیں وہ بعض اوقات یہ خیال کرتے ہیں کہ بینکوں اور مالیاتی اداروں سے سود کا خاتمہ انہیں تجارتی سے زیادہ خیراتی ادارے بنادے گا جن کا مقصد بغیر کسی منافع کے تمویلی خدمات (Financial Services) مہیا کرنا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ مفروضہ بالکل غلط ہے۔ شریعت کی رو سے ایک محدود دائرے کے علاوہ غیر سودی قرضے عام حالات میں تجارتی معاہدوں کے لئے نہیں بلکہ امدادِ باہمی اور خیراتی سرگرمیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ جہاں تک تجارتی بنیاد پر سرمایہ کی فراہمی (Commercial Financing) کا تعلق ہے تو اس مقصد کے لئے اسلامی شریعت کا اپنا ایک مستقل سیٹ اپ ہے۔ اس میں بنیادی اصول یہ ہے کہ جو شخص دوسرے کو رقم دے رہا ہے اسے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ دوسرے فریق کی محض مدد کرنا چاہتا ہے یا اس کے منافع میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ اگر وہ صرف مقروض کی مدد کرنا چاہتا ہے تو

اسے کسی بھی اضافی رقم کے دعوے سے دستبردار ہونا ہوگا۔ اس کا اصل سرمایہ محفوظ اور مضمون ہوگا (یعنی اسے اصل سرمایہ لینے کا بہرحال استحقاق ہوگا خواہ دوسرے فریق کو خسارہ ہی کیوں نہ ہو) لیکن اصل سرمائے سے زائد کسی منافع کا اسے استحقاق نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ دوسرے کو رقم اس لئے مہیا کرتا ہے کہ وہ حاصل ہونے والے منافع میں بھی شریک ہو تو وہ حقیقۃً حاصل ہونے والے منافع کے پہلے سے طے شدہ متناسب حصہ کا مطالبہ کرسکتا ہے، لیکن اگر اسے اس میں کوئی خسارہ ہو جائے تو اس میں بھی اسے شریک ہونا ہوگا۔

لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ تمویلی سرگرمیوں سے سود کے خاتمہ کا یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ مہیا کرنے والا (Financier) کوئی نفع نہیں کما سکتا۔ اگر سرمایہ کی فراہمی کاروباری مقاصد کے لئے ہے تو نفع اور نقصان میں شراکت کے اصول پر یہ مقصود حاصل کیا جاسکتا ہے جس کے لئے اسلام کے تجارتی قوانین میں شروع ہی سے مشارکہ اور مضاربہ مقرر کیے گئے ہیں۔

تاہم کچھ ایسے سیکٹرز بھی ہیں جہاں مشارکہ اور مضاربہ کسی وجہ سے قابلِ عمل نہیں ہیں۔ ایسے سیکٹرز کے لئے معاصر علماء نے بعض دوسرے ذرائع بھی تجویز کیے ہیں جنہیں فائنانسنگ کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسے مرابحہ، اجارہ، سلم اور استصناع۔

گزشتہ دو عشروں سے فائنانسنگ کے طریقے اسلامی بینکوں اور اسلامی مالیاتی اداروں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ ذرائع مکمل طور پر سود کے قائم مقام نہیں ہیں اور یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ انہیں بھی بالکل اسی طریقہ سے استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے سود، بلکہ ان ذرائع کے اپنے اصول، اپنا فلسفہ اور اپنی شرائط ہیں، جن کے بغیر انہیں شریعت کی رو سے طریقہ ہائے تمویل (Modes of Financing) کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ہوگا، اس لئے ان ذرائع کے بنیادی تصور اور متعلقہ تفصیلات سے ناواقفی اسلامی فائنانسنگ کو سود پر مبنی روایتی نظام کے ساتھ خلط ملط کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔

یہ کتاب میرے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جن کا مقصد اسلامی فائنانسنگ کے اصول اور قواعد وضوابط کے بارے میں بنیادی معلومات مہیا کرنا ہے، خاص طور پر فائنانسنگ کے ان طریقوں کے بارے میں جو اسلامی بینکوں اور غیر مصرفی تمویلی اداروں (Non Banknig Financial Institutions) میں زیرِ استعمال ہیں۔ میں نے ان ذرائع تمویل کی تہہ میں موجود بنیادی اصولوں، ان ذرائع کے شرعی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہونے کے لئے ضروری شرائط اور ان کے عملی انطباق میں پیش آنے والی عملی مشکلات اور شریعت کی روشنی میں ان کے ممکنہ حل پر بحث کی ہے۔

دنیا کے مختلف حصوں میں متعدد اسلامی بینکوں میں شریعہ نگران بورڈز کا ممبر یا چیئر مین ہونے کی حیثیت سے میرے سامنے ان کے طریق کار کے بہت سارے کمزور پہلو آئے جس کا بنیادی سبب شریعت کے متعلقہ اصول اور قواعد کا واضح ادراک نہ ہونا ہے۔اس تجربے نے موجودہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی ضرورت کا احساس بڑھا دیا، جس میں میں نے متعلقہ موضوعات پر عام فہم اور سادہ انداز میں بحث کی ہے جسے عام قاری، جس کو اسلامی تمویل کے اصولوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا، بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ حقیر سی کوشش اسلامک فائنانس کے اصول اور اسلامی اور روایتی بینکاری میں فرق سمجھنے میں سہولت فراہم کرے گی۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر اپنی رضامندی کا ذریعہ اور قارئین کے لئے نافع بنائیں۔

وما توفیقی إلا باللہ۔

محمد تقی عثمانی

۱۴۱۹/۳/۴ھ
29/06/1998

چند بنیادی نکات

اسلامی طریقہ ہائے تمویل (Modes of Financing) پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی اصولوں کے متعلق چند نکتوں کی وضاحت کر دی جائے جو اسلامی طریقہ حیات میں پورے معاشی سیٹ اپ کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ا۔ آسمانی ہدایت پر ایمان

سب سے اہم اور اوّلین عقیدہ جس کے گرد تمام اسلامی تصورات گھومتے ہیں یہ ہے کہ یہ کائنات صرف اور صرف ایک خدا کی پیدا کردہ اور اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔اس نے انسان کو پیدا کیا اور زمین پر اسے اپنا نائب بنایا تا کہ وہ اس کے احکامات کی تعمیل کے ذریعے مخصوص مقاصد کو پورا کرے۔اللہ تعالیٰ کے یہ احکامات، عبادات یا چند مذہبی رسوم تک محدود نہیں ہیں بلکہ ہماری زندگی کے تقریباً ہر پہلو کے ایک بہت بڑے حصے پر حاوی ہیں۔ان احکامات میں نہ تو اتنی جزوی تفصیلات طے کی گئی ہیں کہ انسانی سرگرمیاں ایک تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہ جائیں اور انسانی سوچ کا کوئی کردار باقی نہ رہے اور نہ ہی یہ احکامات اتنے مختصر اور مبہم ہیں کہ زندگی کا ہر شعبہ انسانی علم اور خواہش کے رحم و کرم پر رہ جائے۔ان دونوں انتہاؤں سے دور رہتے ہوئے اسلام نے انسانی زندگی کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک متوازن سوچ پیش کی ہے۔ایک طرف تو اس نے انسانی سرگرمیوں کا ایک بہت بڑا حصہ انسان کے اپنے عقلی فیصلوں پر چھوڑ دیا ہے جہاں وہ اپنی سوچ، مصلحت اور حقائق کے تجزیہ کی بنیاد پر خود فیصلے کر سکتا ہے،[1] دوسری طرف اسلام نے انسانی سرگرمیوں کو ایسے اصولوں کے ایک مجموعہ کے ماتحت کر دیا ہے جو ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل ہیں اور انسانی تخمینوں پر مبنی مصلحت کی سطحی دلیلوں کی بنیاد پر ان کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔

خدائی احکامات کے اس انداز کے پیچھے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ انسانی عقل اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود سچائی تک رسائی کی لامحدود طاقت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔اس کی کارکردگی کی بھی آخر کار ایک حد ہے جس سے آگے یہ اچھی طرح کام نہیں کر سکتی یا غلطیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔انسانی

(۱) اصطلاح میں اسے مباحات کا دائرہ کہا جاتا ہے۔اس میں انسان کسی بھی پہلو کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا شرعاً پابند نہیں ہوتا۔(مترجم)

زندگی کے بہت سے مقامات ہیں جہاں عقل اور خواہشات عموماً گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور عقلی دلائل کے بھیس میں غیر صحت مند وجدانات و جذبات انسان کو گمراہ کر کے غیر تعمیری اور غلط فیصلے کرا لیتے ہیں۔ ماضی کے تمام وہ نظریات جنہیں آج غلط اور مغالطہ آمیز قرار دیا جا چکا ہے ان کے بارے میں اپنے اپنے وقت میں عقلی دلائل پر مبنی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا تھا، لیکن صدیوں بعد ان کے غلط ہونے کا انکشاف ہوا اور انہیں عالمی سطح پر مضحکہ خیز اور لغو قرار دے دیا گیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ خود عقل کے پیدا کرنے والے نے اسے جو دائرہ کار سونپا ہے وہ لامحدود نہیں ہے، کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں انسانی عقل پورے طور پر راہ نمائی نہیں کر سکتی یا کم از کم اس میں غلط پذیری کے امکانات ضرور ہوتے ہیں۔ انہی مقامات پر خالقِ کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر وحی نازل کر کے انسانوں کو راہ نمائی اور ہدایت عطا فرمائی ہے، اس لئے ہر مسلمان کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد مصطفیٰ ﷺ پر وحی نازل کر کے جو ہمیں ہدایات دی ہیں ان پر ظاہراً و باطناً (In letter and Spirit) عمل ہونا چاہئے اور کسی کی عقلی بحث یا ذاتی خواہش کی بنیاد پر انہیں نظر انداز یا ان کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی، لہٰذا تمام انسانی سرگرمیاں ان احکاماتِ الٰہیہ کے ماتحت ہونی چاہئیں اور ان میں بیان کردہ حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے ہی عمل ہونا چاہئے۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف اسلام چند عمومی اخلاقی تعلیمات، چند رسوم یا چند عبادات تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ہر شعبۂ حیات کے متعلق تعلیمات و ہدایت پر مشتمل ہے جن میں سماجی۔معاشی شعبے بھی شامل ہیں۔ اللہ کے بندوں سے صرف عبادات میں ہی حکم بجا لانے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اپنی معاشی سرگرمیوں میں بھی اس کی فرمانبرداری ضروری ہے اگرچہ یہ چند ظاہری فوائد کی قیمت پر ہی ہو، اس لئے کہ یہ ظاہری فوائد معاشرے کے اجتماعی مفاد کے خلاف ہوں گے۔

۲۔ سرمایہ دارانہ اور اسلامی معیشت میں بنیادی فرق

اسلام منڈی کی قوتوں (طلب و رسد) اور مارکیٹ اکانومی کا منکر نہیں ہے، حتیٰ کہ ذاتی منافع کا محرک بھی ایک معقول حد تک قابلِ قبول ہے، ذاتی ملکیت کی بھی اسلام میں بالکلیہ نفی نہیں کی گئی، اس کے باوجود اسلامی اور سرمایہ دارانہ معیشتوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ لادین سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں ذاتی ملکیت اور ذاتی منافع کے محرک کو معاشی فیصلے کرنے کی بے لگام طاقت اور لامحدود اختیارات دے دیئے گئے ہیں اور ان کی آزادی کو کسی قسم کی دینی تعلیمات کے ذریعے کنٹرول نہیں کیا گیا۔ اگر کہیں کچھ پابندیاں ہیں بھی سہی تو وہ خود انسانوں کی عائد کردہ ہیں جن میں جمہوری قانون سازی کے

ذریعے تبدیلی کے امکانات ہوتے ہیں اور یہ جمہوری ادارے انسان سے بالاتر کسی اتھارٹی کو قبول نہیں کرتے۔ اس صورتِ حال نے بہت سی ایسی سرگرمیوں کی گنجائش پیدا کر دی ہے جو معاشرے میں ناہمواری پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ سود، جوا اور سٹہ بازی دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ غیر اخلاقی اور مضر اشیاء وخدمات کی پیداوار کے ذریعے پیسہ کمانے کی خاطر غیر صحت مند انسانی جذبات کو استعمال کیا جاتا ہے، نفع کمانے کا بے لگام جذبہ اجارہ داریاں پیدا کرتا ہے جن سے منڈی کی قوتیں (طلب ورسد) یا تو جامد ومفلوج ہو جاتی ہیں یا کم از کم ان کے فطری اور قدرتی عمل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام جو منڈی کی قوتوں پر مبنی ہونے کا دعویدار ہے عملاً طلب اور رسد کو اپنے فطری طریقہ کار سے روکتا ہے، اس لئے کہ طلب اور رسد کی یہ طاقتیں اجارہ داری کی نہیں بلکہ کھلی مسابقت کی فضا میں صحیح کام کرتی ہیں۔ سیکولر کیپٹل ازم میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص معاشی سرگرمی کے بارے میں اس بات کا پورا احساس موجود ہوتا ہے کہ یہ معاشرے کے اجتماعی مفاد میں نہیں ہے پھر بھی اسے محض اس وجہ سے جاری رہنے دیا جاتا ہے کہ وہ ایسے بااثر حلقے کے مفاد کے خلاف ہے جسے اکثریت کی بنیاد پر مقننہ میں تسلط حاصل ہے۔ چونکہ جمہوری حکومت سے بالاتر کسی بھی اتھارٹی کا مکمل طور پر انکار کر دیا گیا ہے اور "TRUST IN GOD" کے اصول کو (جو ہر امریکی ڈالر پر لکھا ہوا ہوتا ہے) سماجی معاشی شعبے سے بالکل بے دخل کر دیا گیا ہے اس لئے کوئی مسلمہ آسمانی ہدایت موجود نہیں جو معاشی سرگرمیوں کو کنٹرول کر سکے۔

اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو روکنے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ خدائی اتھارٹی کو تسلیم کر کے اس کے احکامات کی اطاعت کی جائے اور انہیں ایسی مطلق سچائی اور مافوق الانسان ہدایات کے طور پر قبول کیا جائے جن پر ہر حالت میں ہر قیمت پر عمل کیا جانا ضروری ہو۔ بس یہی بات ہے جو اسلام کرتا ہے۔ ذاتی ملکیت، ذاتی نفع کا محرک اور مارکیٹ کی قوتوں کو تسلیم کرنے کے بعد اسلام نے معاشی سرگرمیوں پر خاص خدائی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ یہ پابندیاں چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگائی گئی ہیں جن کا علم لامحدود ہے اس لئے انہیں کسی انسانی اختیار کے ذریعے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ربا، قمار، ذخیرہ اندوزی، ناجائز اشیاء اور خدمات کا لین دین، جو چیز اپنے پاس ہے نہیں اس کی بیع (Short Sale) کی ممانعت یہ سب ان خدائی پابندیوں کی چند مثالیں ہیں۔ یہ سب پابندیاں مل جل کر معیشت پر ایک مجموعی اثر مرتب کرتی ہیں جس کے نتیجے میں معاشی توازن، دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشی سرگرمیوں کے مواقع ملنے میں مساوات وجود میں آتی ہیں۔

۳۔اثاثوں پر مبنی فائنانسنگ
(Asset-O Backed Financing)

اسلامی فائنانسنگ کی چند اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ حقیقی اثاثوں پر مبنی فائنانسنگ ہے۔ فائنانسنگ کا روایتی سرمایہ دارانہ تصور یہ ہے کہ بینک اور مالیاتی ادارے صرف زر (Money) یا زر کی دستاویزات (Monetary Papers) کا لین دین کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں بینکوں اور مالیاتی اداروں کو اشیاء کی تجارت کرنے اور کاروباری سٹاک رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی، جبکہ اسلام زر (Money) کو مخصوص صورتوں کے علاوہ کاروباری مواد تسلیم نہیں کرتا۔ زر (نقود) کی اپنی ذاتی اور داخلی افادیت نہیں ہوتی، یہ صرف آلہ تبادلہ (Medium of Exchange) ہے اور اس کی ہر اکائی اسی کرنسی کی دوسری اکائی کے سو فیصد برابر ہے،[1] لہٰذا ان کی اکائیوں کے آپس کے تبادلے کے ذریعے نفع کمانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نفع اسی صورت میں کمایا جا سکتا ہے جبکہ زر کے عوض ایسی چیز کی خرید و فروخت کی جائے جس کی ذاتی افادیت بھی ہو یا مختلف کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے (مثلاً پاکستانی روپے کا تبادلہ امریکی ڈالر کے ساتھ کیا جائے) ایک ہی قسم کی کرنسی یا اس کی نمائندگی کرنے والے کاغذات (جیسے بانڈ وغیرہ) کا لین دین کر کے حاصل کیا جانے والا نفع سود اور حرام ہے، اس لئے روایتی مالیاتی اداروں کے برعکس اسلام میں فائنانسنگ ہمیشہ غیر نقد (Illiquid) اثاثوں پر مبنی ہوتی ہے جس سے حقیقی اثاثے اور سامانِ تجارت (Inventories) وجود میں آتے ہیں۔

شریعت میں فائنانسنگ کے اصل اور مثالی ذرائع مشارکہ اور مضاربہ ہیں۔ جب ایک سرمایہ مہیا کرنے والا (Financier) ان دو ذرائع کی بنیاد پر سرمایہ شامل کرتا ہے تو یہ لازمی ہوتا ہے کہ اس سرمایہ کو ذاتی افادیت رکھنے والے اثاثوں میں منتقل کیا جائے۔ نفع انہیں حقیقی اثاثوں کی فروختگی سے حاصل کیا جائے گا۔

سلم اور استصناع پر مبنی فائنانسنگ سے بھی حقیقی اثاثے وجود میں آتے ہیں۔ سلم کی صورت میں فائنانشر (سرمایہ فراہم کرنے والا) حقیقی اشیاء حاصل کرتا ہے جنہیں مارکیٹ میں بیچ کر وہ نفع حاصل کر سکتا ہے۔ استصناع کی صورت میں فائنانسنگ کچھ حقیقی اثاثے تیار کرنے

---

(۱) مثلاً ایک پاکستانی روپیہ دوسرے پاکستانی روپے کے سو فیصد برابر سمجھا جائے گا خواہ ان میں ایک نیا ہو دوسرا پھٹا پرانا، یا ایک ابھی دیا جا رہا ہو دوسرا ایک سال کے بعد۔

(Manufacturing) ہی کی بدولت مؤثر ہوتی ہے، جس کے صلے میں فائنانشر منافع حاصل کرتا ہے۔

تمویلی اجارہ (Financial Lease) اور مرابحہ کے بارے میں آگے متعلقہ ابواب میں یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ یہ اصل میں فائنانسنگ کے طریقے نہیں ہیں، البتہ بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انہیں نئی شکل دی گئی ہے جس سے انہیں بعض شرطوں کے ساتھ طریقۂ تمویل (Mode of Financing) کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، جہاں مشارکہ، مضاربہ، سلم اور استصناع بعض وجوہ کی بنیاد پر قابلِ عمل نہ ہوں۔

مرابحہ اور اجارہ (لیزنگ) والے فائنانسنگ کے طریقوں پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا آخری نتیجہ سودی قرضے سے مختلف نہیں ہوتا۔ یہ اعتراض ایک حد تک درست بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کے شریعہ ایڈوائزری بورڈز اس نکتے پر متفق ہیں کہ یہ فائنانسنگ کے مثالی طریقے نہیں ہیں اس لئے انہیں صرف ضرورت کے موقع پر ہی استعمال کرنا چاہئے اور وہ بھی شریعت کی طرف سے مقرر کردہ شرائط کا پورا پورا دھیان رکھتے ہوئے۔ اس سب کے باوجود مرابحہ اور اجارہ بھی مکمل طور پر اثاثوں پر مبنی فائنانسنگ کے طریقے ہیں اور ان طریقوں پر کی جانے والی فائنانسنگ سودی فائنانسنگ سے درجِ ذیل وجوہ کی بنیاد پر واضح طور پر مختلف ہو جاتی ہے:

(۱) فائنانسنگ کے روایتی طریقے میں تمویل کار (فائنانشر) اپنے گاہک (Client) کو سودی قرضے کی بنیاد پر رقم دیتا ہے، اس کے بعد اس کو اس بات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے کہ گاہک (Client) وہ رقم کیسے استعمال کرتا ہے، اس کے برخلاف مرابحہ کی صورت میں فائنانشر اپنے گاہک کو رقم فراہم ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے وہ بذاتِ خود وہ چیز (Commodity) خریدتا ہے جس کی کلائنٹ کو ضرورت ہوتی ہے (بعد میں وہ گاہک کو زیادہ قیمت لگا کر اُدھار پر بیچ دیتا ہے) چونکہ مرابحہ کا یہ معاملہ اس وقت تک مکمل ہوتا ہی نہیں ہے جب تک گاہک (Client) یہ یقین دہانی نہ کرادے کہ وہ اس چیز کو خریدنا چاہتا ہے اس لئے مرابحہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ فائنانشر اپنے ہاں قابلِ فروخت اشیاء وجود میں نہ لائے۔ اس طرح مرابحہ کی پشت پر ہمیشہ حقیقی اثاثے موجود ہوں گے۔

(۲) روایتی فائنانسنگ سسٹم میں کسی بھی نفع آور مقصد کے لئے قرضہ جاری کیا جا سکتا ہے۔ ایک جواخانہ اپنے جوئے کے کاروبار کو ترقی دینے کے لئے بینک سے قرضہ حاصل کر سکتا ہے۔ فحش میگزین یا عریاں فلمیں بنانے والی کمپنی بھی اسی طرح کسی بینک کا اچھا گاہک بن سکتی ہے جیسے گھر بنانے والا۔

یوں روایتی فائنانسنگ خدائی اور دینی پابندیوں میں مقید نہیں ہے۔ لیکن اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے (مرابحہ اور اجارہ کے طریقے استعمال کرنے کی صورت میں بھی) ان سرگرمیوں کی نوعیت سے لاتعلق نہیں رہ سکتے جن کے لئے فائنانسنگ کی سہولت درکار ہے۔ یہ کسی بھی ایسے مقصد کے لئے مرابحہ نہیں کر سکتے جو شرعاً ناجائز یا معاشرے کی اخلاقی صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔

(۳) مرابحہ کے صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز (Commodity) پر مرابحہ ہو رہا ہے وہ فائنانشر نے خریدی ہو (چاہے کچھ دیر کے لئے ہی ہو اس کی ملکیت اور قبضہ میں آگئی ہو) جس کا مطلب یہ ہوا کہ فائنانشر اس چیز کو بیچنے سے پہلے اس کا رسک قبول کرتا ہے، فائنانشر کو ملنے والا نفع اسی رسک (ضمان) کا صلہ ہے، اس طرح کا کوئی رسک سودی قرضہ میں نہیں ہوتا۔

(۴) سودی قرضہ میں، مقروض نے جو رقم واپس کرنی ہوتی ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس مرابحہ میں فریقین کے درمیان جس قیمت پر ایک مرتبہ اتفاق ہو گیا ہے وہ متعین ہوتی اور رہتی ہے، لہٰذا اگر خریدار (بینک کا کلائنٹ) بروقت ادائیگی نہیں کرتا تب بھی بیچنے والا (بینک) اس تاخیر کی وجہ سے زیادہ قیمت کا مطالبہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ شریعت میں نقود پر گزرنے والے وقت کی قیمت کا تصور نہیں ہے۔

(۵) لیزنگ میں بھی فائنانسنگ کی پیش کش ایک قابل استعمال اثاثے کے ذریعے کی جاتی ہے۔ جو پراپرٹی اجارہ (لیز) کے طور پر دی گئی ہے وہ لیز کے پورے عرصہ میں موجر (فائنانشر) کے ضمان (رسک) میں رہے گی اس لئے اجارہ پر دی گئی یہ چیز اگر استعمال کرنے والے کی تعدی یا غفلت کے بغیر تباہ ہو جاتی ہے تو فائنانشر اور موجر (اجارہ پر دینے والا) یہ نقصان برداشت کرے گا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی طریقہ کار میں ہر فائنانسنگ حقیقی اثاثے وجود میں لاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات مرابحہ اور لیزنگ پر بھی اس حقیقت کے باوجود صادق آتی ہے کہ انہیں فائنانسنگ کا مثالی طریقہ نہیں سمجھا گیا اور ان پر عموماً اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے سودی قرضوں کے قریب ہونے کا اعتراض کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات معلوم ہی ہے کہ سود پر مبنی فائنانسنگ لازمی طور پر حقیقی اثاثے پیدا نہیں کرتی، اس لئے بینکوں اور مالیاتی اداروں کی طرف سے جاری کیے جانے والے قرضوں کے نتیجے میں زر کی جو رسد (Supply) وجود میں آتی ہے وہ معاشرے میں پیدا ہونے والی حقیقی اشیاء اور خدمات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی (بلکہ اس سے بڑھ جاتی ہے) اس لئے کہ یہ قرضے مصنوعی زر پیدا کرتے ہیں[1] جس کی وجہ سے اسی مقدار میں حقیقی اثاثے پیدا ہوئے بغیر زر

(۱) اس کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو: اسلام اور جدید معیشت و تجارت، ص ۱۲۳-۱۲۵۔

کی رسد بڑھ جاتی ہے بلکہ بعض اوقات کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ زر کی رسد اور حقیقی اثاثوں کی پیداوار میں یہ فرق افراطِ زر پیدا کرتا یا اس میں اضافہ کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں چونکہ فائنانسنگ کی پشت پر اثاثے ہوتے ہی ہیں اس لئے اس کے بالمقابل آنے والی اشیاء و خدمات کے ساتھ ہمیشہ اس کی مطابقت بھی ہوتی ہے۔

۴۔ سرمایہ اور تنظیم (Capital and Entrepreneur)

سرمایہ دارانہ نظریہ کے مطابق سرمایہ (Capital) اور آجر (Entrepreneur) دو الگ الگ عواملِ پیدائش ہیں۔ اول الذکر سود حاصل کرتا ہے جبکہ مؤخر الذکر نفع کا مستحق ہوتا ہے۔ 'سود' فراہمی سرمایہ کا متعین فائدہ ہے جبکہ نفع صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جبکہ زمین، محنت اور سرمایہ کو ان کا متعین فائدہ (لگان، اُجرت اور سود کی شکل میں) دینے کے بعد کچھ بچ جائے۔

اس کے برعکس اسلام سرمایہ اور آجر کو دو الگ الگ عواملِ پیداوار تسلیم نہیں کرتا۔ ہر وہ شخص جو کسی کاروباری ادارے میں (نقد شکل میں) سرمایہ شامل کرتا ہے وہ خسارے کا رسک بھی ضرور لیتا ہے اس لئے وہ حقیقی نفع کے ایک متناسب حصہ کا حق دار ہے، اس طرح کاروبار کے رسک کی حد تک سرمایہ اپنے اندر آجر ہونے کا عنصر بھی رکھتا ہے، اس لئے وہ سود کی شکل میں ایک متعین فائدہ حاصل کرنے کی بجائے نفع حاصل کرتا ہے۔ جتنا کاروبار کا نفع زیادہ ہوگا اتنا ہی سرمایہ کا فائدہ (Return) بھی بڑھ جائے گا۔ اس طرح سے معاشرے میں ہونے والی کاروباری سرگرمیوں کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع تمام ان لوگوں میں منصفانہ طور پر تقسیم ہو جاتے ہیں جو کاروبار میں اپنا سرمایہ شامل کرتے ہیں، خواہ یہ سرمایہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ جدید طریقِ عمل کے مطابق چونکہ بینک اور مالیاتی ادارے ہی ہیں جو اپنے ہاں جمع شدہ لوگوں کی امانتوں میں سے کاروباری سرگرمیوں کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں اس لئے معاشرے میں حاصل ہونے والے حقیقی منافع کا بہاؤ عام کھاتہ داروں (Depositors) کی طرف ایک منصفانہ تناسب کے ساتھ ہوگا، جس سے دولت ایک وسیع تر دائرے میں تقسیم ہوگی اور اس کے چند ہاتھوں کے اندر ارتکاز میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

۵۔ اسلامی بینکوں کی موجودہ کارکردگی

اسلامی تمویلی نظام کے خلاف بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ گزشتہ تین عشروں سے جو اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے کام کر رہے ہیں وہ معاشی سیٹ اپ میں حتیٰ کہ صرف فائنانسنگ کے

میدان میں بھی کوئی واضح نظر آنے والی تبدیلی نہیں لا سکے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بینکاری کے زیرِ سایہ ''تقسیمِ دولت میں انصاف'' (Distributive Justice) کے بلند بانگ دعوے مبالغہ آمیز ہیں۔

لیکن یہ تنقید حقیقت پسندانہ نہیں ہے، اس لئے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تنقید میں اس حقیقت کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا کہ اسلامی بینکوں کا روایتی بینکوں کے ساتھ تناسب دیکھا جائے تو اسلامی بینک سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس لئے ان کے بارے میں یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مختصر سے عرصے میں معیشت کے اندر کوئی انقلاب برپا کر دیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ اسلامی ادارے ابھی بچپن کی عمر سے گزر رہے ہیں، انہیں بہت ساری مجبوریوں کے اندر کام کرنا ہوتا ہے، اس لئے ان میں سے بعض تو اپنے تمام معاہدوں میں شریعت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتے، اس لئے ان میں طے پانے والے ہر ہر معاہدے اور معاملے کو شریعت کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو عموماً متعلقہ ملکوں کی حکومتوں، ٹیکسوں اور قانون کے نظام اور مرکزی بینکوں کا تعاون حاصل نہیں ہوتا، ایسی صورتِ حال میں انہیں حاجت یا ضرورت کی بنیاد پر بعض خاص رعایتیں اور رخصتیں دی جاتی ہیں جو شریعت کے اصل اور مثالی قواعد پر مبنی نہیں ہوتیں۔

ایک عملی ضابطۂ حیات ہونے کے ناطے اسلام میں احکام کے دو سیٹ ہیں۔ پہلا شریعت کے مثالی اہداف پر مبنی ہے جس پر معمول کے حالات میں عمل کیا جا سکتا ہے، دوسرا بعض رعایتوں اور سہولتوں پر مبنی ہے جو غیر معمولی حالات میں دی جاتی ہیں۔ اصل اسلامی نظام تو اول الذکر اصولوں پر ہی مبنی ہے جبکہ مؤخر الذکر ایک رخصت ہے جسے ضرورت کے موقع پر استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے اسلامی نظام کی اصل تصویر سامنے نہیں آتی۔

مجبوریوں اور پابندیوں میں رہنے کی وجہ سے عموماً اسلامی بینک دوسرے قسم کے احکام پر انحصار کرتے ہیں، اس لئے ان کی سرگرمیاں ان کے عمل کے محدود دائرے میں بھی کوئی واضح تبدیلی نہیں لا سکتیں۔ البتہ اگر پورا فائنانسنگ سسٹم مثالی اور اسلامی قواعد پر مبنی ہو تو یقیناً معیشت پر اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوں گے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ زیرِ نظر کتاب چونکہ موجودہ دور کے مالیاتی اداروں کے بارے میں راہ نما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس میں دونوں طرح کے اسلامی احکامات کو زیرِ بحث لایا گیا

ہے۔ شروع شروع میں فائنانسنگ کے مثالی اسلامی اصولوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، بعد میں ان ممکنہ بہتر سے بہتر گنجائشوں پر بحث کی گئی ہے جنہیں عبوری دور میں استعمال کیا جا سکتا ہے جہاں اسلامی ادارے موجودہ قانونی اور مالیاتی سسٹم کے دباؤ میں کام کر رہے ہیں، ان گنجائشوں کے بارے میں بھی شریعت کے واضح اصول موجود ہیں، اور ان کا بڑا مقصد نسبۃً کم قابلِ ترجیح راہِ عمل اختیار کر کے کھلم کھلا حرام سے بچنا ہے۔ اس سے اگرچہ صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کے بنیادی مقصد میں زیادہ مدد نہیں ملے گی لیکن یہ راہِ عمل صریح حرام سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے انجامِ بد سے محفوظ رہنے میں ضرور مددگار ہوگی، جو کہ ایک مسلمان کے لئے بذاتِ خود بڑا محبوب مقصد ہے، اگرچہ یہ فرد کی سطح پر ہی ہو۔ مزید برآں اس سے معاشرے کو مکمل اسلامی نظام قائم کرنے کے مثالی ہدف کی طرف تدریجاً بڑھنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس کتاب کا مطالعہ اسلامی شریعت کی اس سکیم کی روشنی ہی میں کیا جانا چاہئے۔

مشارکہ

تعارف

''مشارکہ'' اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی شریک ہونا (حصہ دار بننا) ہے۔ کاروبار اور تجارت کے سیاق وسباق میں اس سے مراد ایک ایسا مشترکہ کاروبار ہوتا ہے جس میں سب حصہ دار مشترکہ کاروباری مہم کے نفع یا نقصان میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ سود پر مبنی تمویل کا ایک مثالی متبادل ہے جس کے دولت کی پیدائش اور تقسیم دونوں پر دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جدید سرمایہ دارانہ معیشت میں سود واحد ذریعہ ہے جسے ہر قسم کی تمویل (فراہمیٔ سرمایہ) کے لئے بے دھڑک استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام میں سود چونکہ حرام ہے اس لئے اسے کسی قسم کی تمویل (Financing) کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اسلامی اصولوں پر مبنی معیشت میں مشارکہ بڑا جاندار کردار ادا کرسکتا ہے۔

سودی نظام میں فائنانشر (تمویل کار) کی طرف سے دیئے جانے والے قرضہ پر زائد واپس کی جانے والی مقدار پہلے سے طے کر لی جاتی ہے قطع نظر اس سے کہ قرض لینے والے کو نفع ہوتا ہے یا نقصان، جبکہ مشارکہ میں واپس کی جانے والی رقم کی شرح پہلے سے طے نہیں کی جاسکتی بلکہ اس میں منافع مشترکہ کاروباری مہم میں حاصل ہونے والے حقیقی نفع پر مبنی ہوتا ہے۔ سودی قرضہ میں سرمایہ فراہم کرنے والا (فائنانشر) کبھی بھی نقصان نہیں اُٹھاتا، جبکہ مشارکہ میں فائنانشر کو نقصان بھی ہوسکتا ہے جبکہ مشترکہ کاروباری مہم اپنے ثمرات ظاہر کرنے میں ناکام رہے۔ اسلام نے سود کو غیر منصفانہ طریقہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس کا نتیجہ قرض دینے اور لینے والے دونوں کے لئے ناانصافی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مقروض کو کاروبار میں خسارہ ہو جاتا ہے تو قرض دینے والے کی طرف سے متعین زیادتی کی شرح کے ساتھ واپسی کا مطالبہ ناانصافی ہے، اور اگر قرض لینے والا بہت بڑا نفع کما لیتا ہے تو نفع کا معمولی سا حصہ قرض دینے والے کو دے کر باقی سب اپنے پاس رکھ لینا ناانصافی ہے۔

جدید معاشی نظام میں بینک ہی ہیں جو اکاؤنٹ ہولڈرز کی رقوم سے صنعت کاروں اور تاجروں کو قرضے فراہم کرتے ہیں۔ اگر کسی صنعت کار کے پاس اپنے صرف دس ملین ہیں تو وہ بینکوں سے نوے ملین حاصل کرے گا اور اس سے ایک بہت بڑا نفع بخش پراجیکٹ شروع کردے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پراجیکٹ کا نوے فیصد حصہ عام کھاتہ داروں کی رقوم سے وجود میں آیا ہے اور صرف دس فیصد اس کے اپنے سرمایہ سے۔ اگر اس پراجیکٹ میں بہت بڑا نفع حاصل ہوتا ہے تب بھی اس کا

چھوٹا سا حصہ (مثلاً چودہ یا پندرہ فیصد) بینکوں کے ذریعے عام کھاتہ داروں تک جائے گا، جبکہ باقی سارا کا سارا نفع صنعت کار کو حاصل ہوگا جس کا پراجیکٹ میں اپنا حصہ دس فیصد سے زائد نہیں تھا۔ پھر یہ چودہ یا پندرہ فیصد نفع بھی صنعت کار واپس لے لیتا ہے، اس لئے کہ شرح سود کو وہ اپنی پیداوار کی لاگت میں شمار کرتا ہے (جس سے مصنوعات کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں)۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاروبار کا سارا کا سارا نفع ان لوگوں کو چلا جاتا ہے جن کا اپنا سرمایہ کل سرمایہ کے دس فیصد سے زائد نہیں تھا۔ جبکہ جو عوام نوے فیصد سرمایہ کاری کے مالک تھے انہیں متعین شرح کے ساتھ سود کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور یہ بھی مصنوعات کی قیمت بڑھا کر ان سے واپس لے لیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر غیر معمولی صورتِ حال میں صنعت کار دیوالیہ ہو جائے تو اس کا اپنا نقصان دس فیصد سے زائد نہیں ہوگا جبکہ باقی نوے فیصد خسارہ مکمل طور پر بینک کو اور بعض حالات میں کھاتہ داروں کو اُٹھانا پڑے گا۔ اس طرح سے شرح سود، اس نظامِ تقسیم دولت کی ناہمواریوں کا اصل سبب ہے جس میں مستقل طور پر امیر کی حمایت میں اور غریب کے مفادات کے خلاف رجحان پایا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام میں سرمایہ فراہم کرنے والے کے لئے ایک بہت واضح اصول موجود ہے، وہ یہ کہ سرمایہ فراہم کرنے والے کو لازمی طور پر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مقروض کی مدد کرنے کے لئے قرضہ فراہم کر رہا ہے یا سرمایہ لینے والے کے منافع میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ اگر یہ صرف مقروض کی مدد کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دیئے ہوئے قرضہ کی اصل مقدار سے زائد کسی مطالبہ سے بچنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد ہی اس کی مدد کرنا ہے۔ لیکن اگر وہ سرمایہ لینے والے کے نفع میں شریک ہونا چاہتا ہے تو یہ ضروری ہوگا کہ اس کے نقصان میں بھی شریک ہو، لہٰذا مشارکہ میں فائنانشر کا منافع کاروبار کے ذریعے حاصل ہونے والے حقیقی نفع سے وابستہ ہوتا ہے۔ کاروبار میں نفع جتنا زیادہ ہوگا فائنانشر کے منافع کی شرح بھی اتنی ہی بڑھ جائے گی۔ اگر کاروبار بہت زیادہ نفع کما لیتا ہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ سارا کا سارا صنعت کار ہی بلاشرکتِ غیرے سنبھال لے، بلکہ بینک کے کھاتہ دار ہونے کی حیثیت سے عام لوگ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے۔ اس طرح مشارکہ میں ایک ایسا رجحان پایا جاتا ہے جو صرف امیر کی بجائے عام لوگوں کی حمایت میں ہے۔

یہ ہے وہ بنیادی فلسفہ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام مشارکہ کو سودی تمویل (Finance) کے متبادل کے طور پر کیوں تجویز کرتا ہے۔ بے شک مشارکہ کو ایک عمومی طریقۂ تمویل کے طور پر مکمل طور پر اپنانے میں بہت سی عملی مشکلات بھی ہیں، بعض اوقات یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ مشارکہ ایک قدیم طریقۂ تمویل ہے جو تیز رفتار معاملوں کی نت نئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، لیکن

اس خیال کا منشا مشارکہ کے شرعی اصولوں سے کما حقہ واقفیت نہ ہونا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مشارکہ کی کوئی لگی بندھی شکل یا متعین طریقۂ کار مقرر ہی نہیں کیا، بلکہ اس نے چند عمومی اصول بتائے ہیں جن میں مختلف عملی شکلوں اور طریقہ ہائے کار کی گنجائش ہے۔ مشارکہ کی کسی نئی شکل یا طریقۂ کار کو محض اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت مشارکہ کی ہر نئی شکل شریعت کی نظر میں قابلِ قبول ہے جب تک کہ وہ قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ مشارکہ کو اپنی روایتی اور قدیم شکل میں ہی اپنایا جائے۔

اس باب میں مشارکہ کے بنیادی اصولوں پر اور ان طریقوں پر بحث کی گئی ہے جن کے ذریعے جدید کاروبار اور تجارت میں ان اصولوں کو نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث کا مقصد بنیادی قواعد کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے مشارکہ کو جدید طریقۂ تمویل کے طور پر متعارف کرنا ہے۔ مشارکہ کا تعارف اسلامی فقہ کی کتابوں اور ان بنیادی مشکلات کے حوالہ سے کرایا گیا ہے جو جدید صورتِ احوال میں اس کی عملی تنفیذ میں پیش آسکتی ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ مختصر بحث مسلمان فقہاء اور ماہرینِ معیشت کے لئے سوچ کے نئے اُفق کھولے گی اور صحیح اسلامی معیشت نافذ کرنے میں مددگار ہوگی۔

مشارکہ کا تصور

''مشارکہ'' ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا اسلامی طریقہ ہائے تمویل (Modes of Financing) کے سیاق وسباق میں بکثرت حوالہ آتا رہتا ہے۔ اس اصطلاح کا مروجہ مفہوم ''شرکۃ'' کی اصطلاح سے ذرا محدود ہے جو عام طور پر اسلامی فقہ کی کتابوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ان دونوں کے بنیادی تصور کو ظاہر کرنے کے لئے شروع ہی میں یہ مناسب ہے کہ دونوں اصطلاحوں کی اس انداز سے تشریح کردی جائے کہ یہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوسکیں۔

اسلامی فقہ میں ''شرکۃ'' کا معنی ہے ''حصہ دار بننا''۔ فقہ میں اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں:

(ا) شرکۃ المِلک: اس کا معنی ہے کہ دو یا زیادہ شخصوں کی ایک ہی چیز میں مشترکہ ملکیت ہو۔ ''شرکۃ'' کی یہ قسم دو مختلف طریقوں سے وجود میں آتی ہے۔ کبھی تو یہ شرکت متعلقہ فریقوں (شرکاء) کے اپنے اختیار سے عمل میں آتی ہے، مثال کے طور پر دو شخص مل کر کوئی سامان خریدتے ہیں، یہ سامان مشترکہ طور پر دونوں کی ملکیت میں ہوگا، اور اس ساجھی چیز کے حوالے سے ان دونوں کے درمیان جو تعلق قائم ہوا ہے یہ ''شرکۃ المِلک'' کہلاتا ہے۔ یہاں پر ان دونوں کے درمیان یہ تعلق دونوں کی اپنی مرضی سے وجود میں آیا ہے، اس لئے کہ ان دونوں نے خود اسے مشترکہ طور پر خریدنے کی راہ منتخب کی ہے۔

لیکن بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں شرکاء کے کسی عمل کے بغیر ہی شرکت خود بخود عمل میں آجاتی ہے، مثلاً کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی ساری کی ساری مملوکہ چیزیں اس کی موت کے نتیجے میں خود بخود اس کے وارثوں کی مشترکہ ملکیت میں آجاتی ہیں۔

(۲) شرکۃ العقد: یہ شرکت کی دوسری قسم ہے۔ اس سے مراد ''وہ شراکت (Partnership) ہے جو باہمی معاہدہ سے عمل میں آئے''۔ اختصار کی خاطر ہم اس کا ترجمہ Joint Commercial Enterprise (مشترکہ کاروباری ادارہ) کر سکتے ہیں۔

شرکۃ العقد کی آگے پھر تین قسمیں ہیں:

(۱) شرکۃ الاموال جس میں شرکاء مشترکہ کاروبار میں اپنا اپنا کچھ سرمایہ لگاتے ہیں۔

(۲) شرکۃ الاعمال جس میں شرکاء مشترکہ طور پر گاہکوں کو چند خدمات مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور ان سے وصول ہونے والی فیس (اجرت) آپس میں پہلے سے طے شدہ تناسب سے تقسیم ہو جاتی ہے۔ مثلاً دو آدمی اس بات پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے گاہکوں کو خیاطی کی خدمات فراہم کریں گے اور یہ شرط بھی طے کر لیتے ہیں کہ اس طرح حاصل ہونے والی اجرتیں ایک مشترکہ کھاتے میں جمع ہوتی رہیں گی اور دونوں کے درمیان تقسیم کی جائیں گی، قطع نظر اس سے کہ دونوں شرکاء کا کیا ہوا کام حقیقتاً کتنا ہے، یہ شرکۃ الاعمال کہلائے گی۔ اسے شرکۃ التقبل، شرکۃ الصنائع اور شرکۃ الابدان بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

(۳) شرکۃ العقد کی تیسری قسم شرکۃ الوجوہ ہے۔ اس شرکت میں شرکاء کسی قسم کی بھی سرمایہ کاری نہیں کرتے، وہ بس اتنا ہی کرتے ہیں کہ اشیاءِ تجارت اُدھار قیمت پر خرید کر نقد قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ پہلے سے طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیا جاتا ہے۔

شراکت کی ان تینوں صورتوں کو اسلامی فقہ کی اصطلاح میں ''شرکۃ'' کہا جاتا ہے جبکہ ''مشارکہ'' کی اصطلاح فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتی۔ یہ اصطلاح ان حضرات نے آج کل متعارف کرائی ہے جنہوں نے اسلامی طریقہ ہائے تمویل پر لکھا ہے اور یہ اصطلاح عموماً ''شرکۃ'' کی اس خاص قسم تک محدود ہوتی ہے جسے شرکۃ الاموال کہا جاتا ہے جہاں دو یا زیادہ افراد کسی مشترکہ کاروباری مہم میں اپنا اپنا سرمایہ لگاتے ہیں۔ تاہم بعض اوقات یہ اصطلاح (مشارکہ) شرکۃ الاعمال کو بھی شامل ہوتی ہے جبکہ شراکت خدمات (Services) کے کاروبار میں وجود میں آئے۔

مذکورہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی ''شرکۃ'' کی اصطلاح ''مشارکہ'' کے اس مفہوم سے وسیع معنی رکھتی ہے جس کے لئے یہ لفظ (مشارکہ) آج کل استعمال ہو رہا ہے۔ مشارکہ کا مفہوم شرکۃ

الأموال تک ہی محدود ہے، جبکہ شرکۃ کا لفظ سا جھی ملکیت اور شراکت داری کی ساری صورتوں کو شامل ہے۔

جدول نمبر 1 سے شرکۃ کی مختلف قسمیں اور جدید اصطلاح میں مشارکہ کہلانے والی قسمیں معلوم ہو جائیں گی۔ (جدول نمبر1 اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

چونکہ مشارکہ ہمارے موضوعِ بحث سے زیادہ متعلق ہے اور مشارکہ تقریباً شرکۃ الأموال ہی کا مترادف ہے اس لئے اب ہم اپنی گفتگو اسی پر مرکوز کرتے ہوئے شروع شروع میں شرکت کی اس قسم کے روایتی تصور کی تشریح کریں گے، اس کے بعد جدید فائنانسنگ کے تصور میں اس کے عملی انطباق کے بارے میں مختصراً بات کریں گے۔

مشارکہ کے بنیادی قواعد

۱۔ مشارکہ یا شرکۃ الأموال ایک ایسا تعلق ہے جو متعلقہ فریقوں کے باہمی معاہدے سے قائم ہوتا ہے، اس لئے یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ کسی عقد کے صحیح ہونے کے لئے جو لوازم ہوتے ہیں ان کا یہاں پایا جانا بھی ضروری ہے، مثال کے طور پر دونوں پارٹیوں میں عقد کرنے کی اہلیت بھی ہو (ان میں سے کوئی مجنون وغیرہ نہ ہو)، یہ عقد کسی دباؤ، دھوکہ دہی اور غلط بیانی کے بغیر فریقین کی آزادانہ مرضی سے مکمل ہونا چاہئے، وغیرہ وغیرہ۔ البتہ کچھ ایسے لوازم بھی ہیں جو ''مشارکہ'' کے معاہدے کے ساتھ ہی خاص ہیں، ان پر یہاں مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

منافع کی تقسیم:

۲۔ شرکاء میں تقسیم ہونے والے منافع کی شرح معاہدے کے نافذ العمل ہونے کے وقت طے ہو جانی چاہئے۔ اگر اس طرح شرح منافع طے نہ کی گئی تو عقد شرعاً درست نہیں ہوگا۔

۳۔ ہر شریک کے نفع کی شرح کاروبار میں حقیقتاً ہونے والے نفع کی نسبت سے طے ہونی چاہئے، اس کی طرف سے کی جانے والی سرمایہ کاری کی نسبت سے نہیں۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شریک کے لئے کوئی لگی بندھی مقدار مقرر کر لی جائے یا نفع کی ایک شرح طے کر لی جائے جو اس کی طرف سے لگائے گئے سرمائے سے منسلک ہو (یعنی کسی شریک کے بارے میں یہ طے کرنے کے بجائے کہ حقیقی منافع کا اتنا فیصد لے گا یہ طے کر لینا کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقم کا اتنا فیصد لے گا جائز نہیں ہے)

لہٰذا اگر ''الف'' اور ''ب'' ایک شراکت کرتے ہیں، اور یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ ''الف'' ماہانہ

جدول نمبر 1:

شرکۃ

شرکۃ الملک
(مشترکہ ملکیت)

اختیاری

اضطراری

شرکۃ العقد
(مشترکہ کاروبار)

شرکۃ العقد
(تجارت میں شراکت)

شرکۃ الاعمال
(خدمات میں شراکت)

شرکۃ الوجوہ
(ساکھ کی بنیاد پر شراکت)

← مشارکہ →
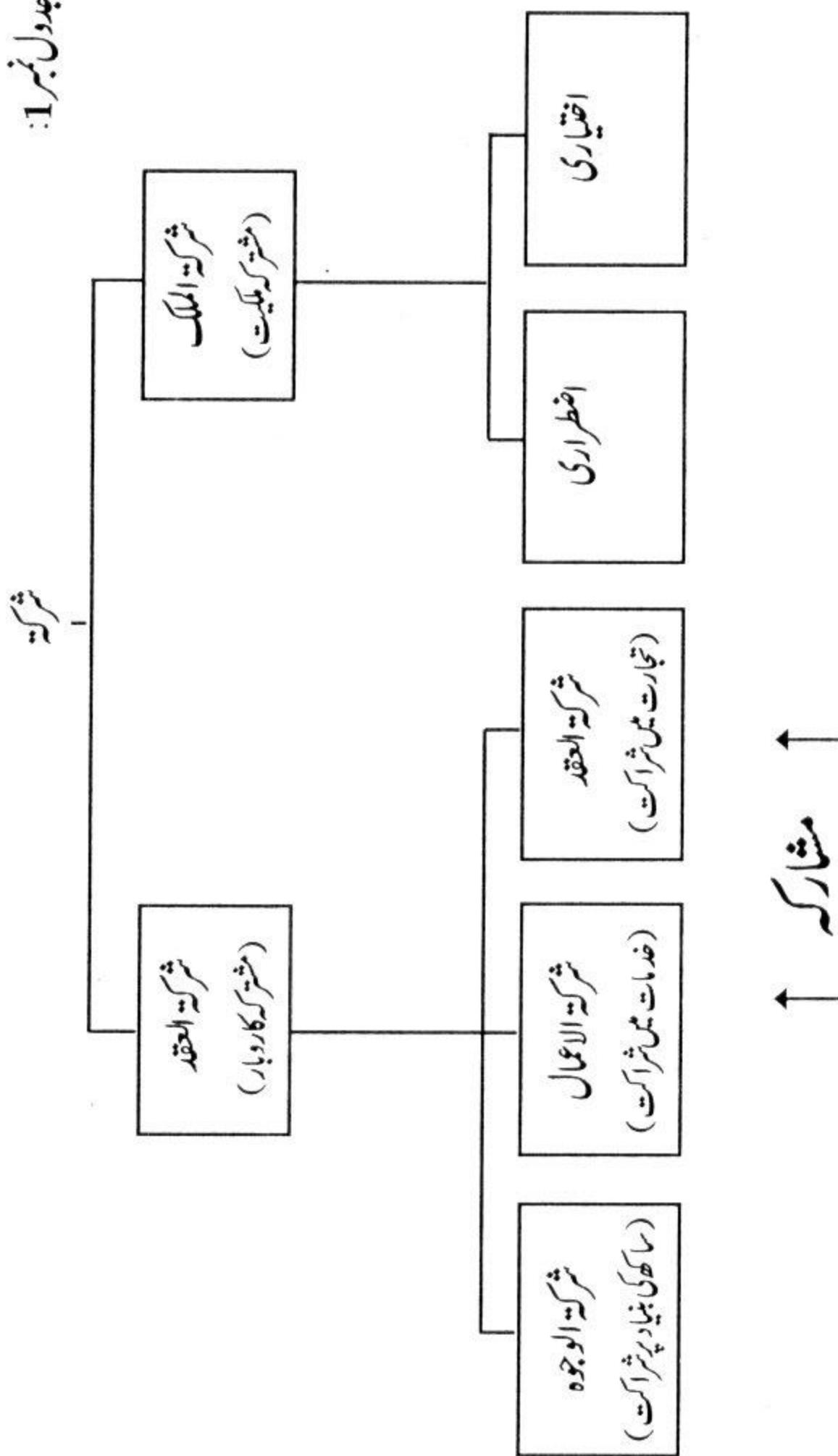
دس ہزار روپیہ نفع میں سے اپنے حصہ کے طور پر لے گا اور باقی ماندہ سارا نفع ''ب'' کا ہوگا تو یہ شرکت شرعاً صحیح نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر اس بات پر اتفاق کرلیا جاتا ہے کہ ''الف'' اپنی سرمایہ کاری کا پندرہ فیصد بطور منافع وصول کرے گا تو بھی یہ عقد صحیح نہیں ہوگا۔ نفع تقسیم کرنے کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ کاروبار کو حاصل ہونے والے حقیقی نفع کا فیصد طے کیا جائے۔

اگر کسی شرکت کے لئے کوئی لگی بندھی رقم یا اس کی سرمایہ کاری کا متعین فیصدی حصہ طے کیا جاتا ہے تو معاہدے میں اس بات کی بھی اچھی طرح تصریح ہونی چاہئے کہ یہ مدت کے اختتام پر ہونے والے آخری حساب کتاب کے تابع ہوگا۔ اس طرح سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی بھی حصہ دار اپنی جتنی رقم نکلوائے گا اس کے ساتھ جزوی اور ضمنی ادائیگی Payment on Account [(1)] والا معاملہ کیا جائے گا اور اسے اس حقیقی نفع میں ایڈجسٹ کرلیا جائے گا جس کا وہ مدت کے اختتام پر مستحق ہوگا۔ اگر کاروبار میں کوئی نفع ہوا ہی نہیں یا توقع اور اندازے سے کم ہوا ہے تو اس شریک نے جو رقم نکلوائی ہے وہ واپس کرنا ہوگی۔

نفع کی شرح

۴۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شریک کے لئے طے کیے جانے والے نفع کا تناسب اس کی طرف سے لگائے گئے سرمایہ کے تناسب کے مطابق ہو؟ اس سوال کے بارے میں مسلم فقہاء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق ''مشارکہ'' کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شریک اپنی سرمایہ کاری کے تناسب کے بالکل مطابق ہی نفع حاصل کرے۔ لہٰذا اگر ''الف'' کی طرف سے لگایا گیا سرمایہ کل سرمایہ کا چالیس فیصد ہے تو وہ کل نفع کا بھی چالیس فیصد ہی لے گا۔ ہر ایسا معاہدہ جس کی رُو سے وہ چالیس فیصد سے کم یا اس سے زیادہ نفع کا مستحق بنتا ہے مشارکہ کو شرعاً غیر صحیح بنادے گا۔

اس کے برعکس امام احمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ نفع کا تناسب سرمایہ کاری کے تناسب سے مختلف ہو سکتا ہے، اگر یہ بات حصہ داروں کے درمیان آزاد مرضی سے طے پا جائے، لہٰذا یہ جائز ہے کہ جس کی

---

(۱) یعنی کسی واجب الادا قرضے یا امانت کی جزوی ادائیگی، جس میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ کام مکمل ہونے پر بقیہ توازن کے مطابق ادائیگی کردی جائے گی۔ مترجم

Dictionary of Banking by: Perry and Klein.

سرمایہ کاری چالیس فیصد ہے وہ ساٹھ یا ستر فیصد نفع لے لے جبکہ ساٹھ فیصد سرمایہ کاری والا نفع کا تیس یا چالیس فیصد لے۔[1]

تیسرا نقطۂ نظر وہ ہے جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، جسے پہلے ذکر کردہ دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان ایک متوسط راہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ عام حالات میں تو نفع کا تناسب سرمایہ کاری کے تناسب سے مختلف ہوسکتا ہے لیکن اگر کوئی شریک معاہدے میں یہ صریح شرط لگا دیتا ہے کہ وہ ''مشارکہ'' کے لئے کوئی کام نہیں کرے گا اور مشارکہ کی پوری مدت کے دوران وہ غیر عامل حصہ دار (Sleeping Partner) رہے گا تو نفع میں اس کے حصے کا تناسب اس کی سرمایہ کاری کے تناسب سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔[2]

نقصان میں شرکت

لیکن نقصان کی صورت میں تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ہر شریک اپنی سرمایہ کاری کی نسبت ہی سے نقصان برداشت کرے گا، لہٰذا اگر ایک حصہ دار نے چالیس فیصد سرمایہ لگایا ہے تو اسے لازماً خسارے کا بھی چالیس فیصد ہی برداشت کرنا ہوگا، اس سے کم یا زیادہ نہیں، اس کے خلاف معاہدے میں جو شرط بھی لگائی جائے گی اس سے معاہدہ غیر صحیح ہو جائے گا۔[3] اس اصول پر (کہ نقصان سرمایہ کاری کی نسبت سے برداشت کرنا ہوگا) فقہاء کا اجماع ہے۔[4]

لہٰذا امام شافعیؒ کے نزدیک ہر شریک کا نفع یا نقصان دونوں میں حصہ اس کی سرمایہ کاری کے تناسب کے مطابق ہونا ضروری ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک نفع کی نسبت تو شرکا کے درمیان طے شدہ معاہدے کے مطابق سرمایہ کاری کے تناسب سے مختلف ہوسکتی ہے لیکن نقصان حصہ داروں میں سے ہر ایک کی سرمایہ کاری کے تناسب سے تقسیم ہونا چاہئے۔ یہ اصول ایک مشہور فقہی مقولہ (Maxim) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"الربح علی ما اصطلحا علیه والوضیعة علی قدر المال."

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی، ج۵، ص۱۴۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۷۲ء۔

(۲) الکاسانی، بدائع الصنائع، ج۶، ص۱۶۲، ۱۶۳۔

(۳) لکن فی شرح المجلة لئدہ تاسی (۹٤۱) عن محیط السرخسی: اشترکا فجاء احد هما بالف والآخر بالفین علی ان الربح والوضیعة نصفان، فالعقد جائز والشرط فی حق الوضیعة باطل۔ الخ

(۴) ابن قدامہ، ج۵، ص۱۴۷۔

''نفع فریقین میں طے پانے والی نسبت پر مبنی ہوگا اور خسارہ رأس المال کے مطابق۔''

سرمایہ کی نوعیت

اکثر فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ ہر حصہ دار کی طرف سے لگایا جانے والا سرمایہ سیال (Liquid) شکل میں ہونا چاہئے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مشارکہ کا معاہدہ زر (Money) میں ہونا چاہئے، تاہم اس مسئلے میں فقہاء کے مختلف نقطہ ہائے نظر موجود ہیں۔

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک سرمایہ کا نقد شکل میں ہونا مشارکہ کے صحیح ہونے کے لئے شرط نہیں ہے۔ اس لئے یہ جائز ہے کہ کوئی شریک مشارکہ میں اپنا حصہ اشیاء کی شکل میں ڈالے، لیکن اس صورت میں اس شریک کے حصے کا تعین تاریخِ معاہدہ کو مارکیٹ ریٹ کے مطابق قیمت لگا کر کیا جائے گا۔ بعض حنبلی فقہاء نے بھی اسی نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک غیر نقد اشیاء کی شکل میں کوئی حصہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ ان کا یہ مذہب دو دلیلوں پر مبنی ہے۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ ہر شریک کی اشیاء دوسرے کی اشیاء سے ہمیشہ ممتاز اور الگ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''الف'' نے ایک موٹر کار کاروبار میں شریک کی ہے اور ''ب'' بھی ایک اور موٹر کار کاروبار میں شریک کرنے کے لئے لے آتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کار اس کی انفرادی اور ذاتی ملکیت ہے۔ اب اگر ''الف'' کی کار (کاروبار میں شامل ہونے کے بعد) بیچ دی جاتی ہے تو بیع کے تمام حقوق ''الف'' ہی کی طرف لوٹیں گے۔ ''ب'' کو اس کی قیمت میں سے کسی حصے کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

لہٰذا چونکہ ہر شریک کی ملکیت دوسرے سے الگ ہے اس لئے کوئی شرکت وجود میں نہیں آئے گی، اس کے برعکس اگر ہر ایک کی طرف سے لگایا گیا سرمایہ نقود کی شکل میں ہے تو ہر حصہ دار کا حصہ دوسرے سے الگ نہیں ہوگا، اس لئے کہ زر کی اکائیاں قابلِ تعیین نہیں ہوتیں، اس لئے نقود کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مشترکہ حوض (Common Pool) تشکیل دے جس سے شراکت وجود میں آسکے۔ (۱)

یہ حضرات دوسری دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مشارکہ کے معاہدہ میں بعض ایسے حالات

(۱) الکاسانی: بدائع الصنائع، ج ۶، ص ۵۹۔

بھی پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ لگا ہوا سرمایہ تمام حصہ داروں میں دوبارہ تقسیم کرنا پڑ جاتا ہے۔ اگر لگایا ہوا سرمایہ غیر نقد اشیاء کی شکل میں ہوگا تو دوبارہ تقسیم ممکن نہ ہوگی، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ ان اشیاء کو اسی وقت بیچا جائے۔ اب اگر سرمایہ ان اشیاء کی قیمت کی بنیاد پر واپس کیا جاتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ (بعض اشیاء کی قیمتیں) بڑھ چکی ہوں، تو یہ امکان موجود ہے کہ ایک شریک کاروبار کا پورا نفع لے جائے اور دوسرے شریک کے لئے کچھ بھی نہ بچے، اس لئے کہ قیمت انہی اشیاء کی بڑھی ہے جو اس نے شریک کی تھیں۔ اس کے برعکس اگر ان اشیاء کی قیمتیں گر جاتی ہیں تو یہ امکان موجود ہے کہ ایک شریک اپنی سرمایہ کاری واپس لینے کے علاوہ دوسرے شریک کی اصل قیمت کا کچھ حاصل کر لے۔ (۱)

(۳) امام شافعیؒ نے مذکورہ بالا دونوں آراء کے درمیان میں ایک متوسط نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اشیاء دو قسم کی ہوتی ہیں۔

۱۔ ذوات الأمثال، یعنی وہ اشیاء جو اگر ہلاک ہو جائیں تو ان کا تاوان ایسی چیز کے ساتھ دیا جا سکے جو معیار اور مقدار میں ہلاک ہونے والی جیسی ہے، جیسے گندم، چاول وغیرہ۔ اگر سو کلو گندم ضائع ہو جائے تو آسانی سے اسی معیار کی سو کلو گندم دی جاسکتی ہے۔

۲۔ ذوات القیمہ، یعنی وہ اشیاء جن کے ہلاک ہونے کی صورت میں اسی جیسی اشیاء کے ساتھ تاوان ادا نہ کیا جا سکے، جیسے حیوانات، مثال کے طور پر بکریوں کا ہر فرد اپنی الگ خصوصیات رکھتا ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتیں، اس لئے اگر کوئی شخص کسی کی بکریاں ہلاک کر دیتا ہے تو اسی جیسی بکریاں دے کر تاوان ادا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی جگہ ان بکریوں کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

اب امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پہلی قسم کی اشیاء (یعنی ذوات الامثال) کو مشارکہ میں کسی حصہ کے طور پر شامل کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسری قسم کی اشیاء (یعنی ذوات القیم) شیئر کیپٹل کا حصہ نہیں بن سکتیں۔ (۲)

ذوات الامثال اور ذوات القیم میں اس فرق کے ذریعے امام شافعیؒ نے غیر نقد اشیاء کے ذریعے شراکت پر دوسرے اعتراض کا حل پیش کر دیا ہے جو امام احمدؒ کی طرف سے اُٹھایا گیا تھا، اس لئے کہ ذوات الامثال کی صورت میں سرمایہ کی دوبارہ تقسیم اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہر شریک کو اسی طرح کی اشیاء لوٹا دی جائیں جو اس نے کاروبار میں لگائی تھیں۔ تاہم پہلے اعتراض کا ابھی تک امام شافعیؒ کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

---

(۱) ابن قدامہ: المغنی، ج ۵، ص ۱۲۴، ۱۲۵۔

(۲) حوالہ سابقہ ص ۱۲۵۔

اس اشکال کوحل کرنے کے لئے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وہ اشیاء جو ذوات الامثال میں داخل ہیں وہ مشترکہ سرمایہ کا حصہ اس صورت میں بن سکتی ہیں جبکہ ہر حصہ دار کی طرف سے لگائی گئی اشیاء کو آپس میں اس طرح ملالیا جائے کہ ہر شریک کی اشیاء دوسرے سے ممتاز نہ ہوسکیں۔ (۱)

حاصل یہ کہ اگر کوئی شریک کسی مشارکہ میں غیر نقد اشیا کو شامل کر کے حصہ لینا چاہتا ہے تو امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق وہ بغیر کسی رکاوٹ کے ایسا کرسکتا ہے، اور مشارکہ میں اس کے حصہ کی تعیین مشارکہ وجود میں آنے کی تاریخ کو ان اشیاء کی مروجہ بازاری قیمت کی بنیاد پر کی جائے گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ایسا صرف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے جبکہ وہ غیر نقد چیز ذوات الامثال میں سے ہو۔

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق اگر وہ چیز ذوات الامثال میں سے ہے تو ایسا صرف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے جبکہ تمام شرکاء کی اشیاء آپس میں خلط ملط کر لی جائیں۔ اور اگر وہ غیر نقد اشیاء ذوات القیم میں سے ہوں تو وہ شراکت میں شامل سرمایہ کا حصہ نہیں بن سکتیں۔

بظاہر امام مالکؒ کا نقطۂ نظر زیادہ سہل اور معقول معلوم ہوتا ہے اور یہ جدید کاروبار کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اس لئے اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ (۲)

مذکورہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مشارکہ میں لگایا جانے والا سرمایہ نقد شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور غیر نقد اشیاء کی شکل میں بھی۔ دوسری صورت میں غیر نقد اشیاء کی بازاری قیمت کے ذریعے رأس المال میں اس شریک کے حصہ کا تعین کیا جائے گا۔

مشارکہ کی مینجمنٹ

مشارکہ کا عام اصول یہ ہے کہ ہر شریک کو اس کے انتظام (Management) میں حصہ لینے اور اس کے لئے کام کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، تاہم شرکاء اس شرط پر بھی اتفاق کرسکتے ہیں کہ مینجمنٹ ان میں سے ایک شریک کے ذمہ ہوگی اور باقی شرکاء میں سے کوئی بھی مشارکہ کے لئے کام نہیں کرے گا، لیکن اس صورت میں غیر عامل شریک (Sleeping partner) اپنی سرمایہ کاری کی حد تک ہی نفع کا مستحق ہوگا اور اس کے لئے خاص کی گئی نفع کی نسبت اس کی سرمایہ کاری کی نسبت سے زائد نہیں ہوگی، جیسا کہ پہلے اس پر گفتگو ہوچکی ہے۔

اگر سارے شرکاء مشترکہ کاروباری مہم کے لئے کام کرنے پر اتفاق کرتے ہیں تو اس کاروبار

(۱) الکاسانی، ج۹، ص۵۹۔ (۲) تھانوی، امداد الفتاویٰ۔

کے تمام معاملات میں ہر شریک دوسروں کا وکیل سمجھا جائے گا اور کاروبار کے عام حالات میں ان میں کوئی شریک جو کام بھی کرے گا اس کے بارے میں یہ تصور کیا جائے گا کہ دوسروں نے بھی اس کی منظوری دی ہے۔

مشارکہ کو ختم کرنا

مندرجہ ذیل حالات میں سے کسی بھی حالت میں مشارکہ ختم تصور کیا جائے گا۔

(۱) ہر شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی وقت دوسرے شریک کو نوٹس دے کر مشارکہ ختم کر دے۔ایسے نوٹس کے ذریعے مشارکہ ختم تصور کیا جائے گا۔

اس صورت میں اگر مشارکہ کے سارے اثاثے نقد شکل میں ہیں تو انہیں شرکاء کے درمیان ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر لیا جائے گا،لیکن اگر اثاثہ جات سیال شکل میں نہیں ہیں تو شرکاء دو باتوں میں سے کسی پر اتفاق کر سکتے ہیں،یا تو اثاثہ جات کی تنضیض کر لیں (یعنی بیچ کر نقد میں تبدیل کر لیں) یا انہیں اسی حالت میں تقسیم کر لیں۔اگر اس معاملے پر شرکاء کے درمیان اختلاف موجود ہو یعنی بعض تنضیض (Liquadation) چاہتے ہوں اور بعض خود اثاثہ جات کو غیر نقد شکل میں تقسیم کرنا چاہتے ہوں تو مؤخر الذکر (اثاثہ جات کی اسی حالت میں تقسیم) کو ترجیح دی جائے گی،اس لئے کہ مشارکہ کے اختتام کے بعد تمام اثاثہ جات حصہ داروں کی مشترکہ ملکیت ہیں،اور کسی چیز پر مشترکہ ملکیت رکھنے والوں میں سے ہر ایک کو تقسیم یا اپنا حصہ الگ کرنے کے مطالبے کا حق حاصل ہوتا ہے، اور کوئی بھی اسے تنضیض (Liquadation) پر مجبور نہیں کر سکتا،تاہم اگر اثاثہ جات ایسے ہیں کہ انہیں تقسیم کر کے ان کے حصے الگ الگ نہیں کیے جا سکتے،جیسے مشینری،تو ان اثاثہ جات کو بیچ کر وصول ہونے والی رقم کو تقسیم کر لیا جائے گا۔[۱]

(۲) اگر مشارکہ کی مدت کے دوران شرکاء میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو مرنے والے کے ساتھ مشارکہ کا معاہدہ ختم ہو جائے گا۔اس صورت میں اس کے وارثوں کو اختیار ہوگا،چاہیں تو مرنے والے کا حصہ واپس لے لیں اور اگر چاہیں تو مشارکہ کے اس معاہدہ کو جاری رکھیں۔[۲]

(۳) اگر شرکاء میں سے کوئی مجنون ہو جائے یا کسی اور وجہ سے تجارتی معاہدے کرنے کا اہل نہ رہے تو مشارکہ ختم ہو جائے گا۔[۳]

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی، ج۵،ص۱۳۳،۱۳۴۔

(۲) حوالہ سابقہ۔ (۳) حوالہ بالا۔

کاروبار ختم کیے بغیر مشارکہ ختم کرنا

اگر شرکاء میں سے کوئی ایک مشارکہ ختم کرنا چاہے جبکہ دوسرا شریک یا باقی شرکاء کاروبار جاری رکھنا چاہیں تو باہمی معاہدے سے یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو شرکاء کاروبار جاری رکھنا چاہتے ہیں وہ اس شریک کا حصہ خرید سکتے ہیں جو اپنی شراکت ختم کرنا چاہتا ہے، اس لئے کہ ایک شریک کے ساتھ مشارکہ ختم ہونے کا عملاً یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ مشارکہ دوسرے شرکاء کے ساتھ بھی ختم ہو جائے۔ (۱)

اس صورت میں مشارکہ چھوڑنے والے شریک کے حصہ کی قیمت کا تعین باہمی رضامندی سے ہونا ضروری ہے۔ اگر اس حصے کی قیمت کے تعین میں اختلاف ہو اور شرکاء کے درمیان کوئی متفق قیمت طے نہ پا سکے تو مشارکہ چھوڑنے والا حصہ دار خود ان اثاثوں کو تقسیم کر کے دوسرے شرکاء سے علیحدہ ہوسکتا ہے یا لیکویڈیشن یعنی اثاثوں کو بیچ کر نقد میں تبدیل کر کے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شرکاء عقد مشارکہ میں داخل ہوتے وقت اس شرط پر متفق ہو سکتے ہیں کہ لیکویڈیشن یا کاروبار کی تقسیم اس وقت تک عمل میں نہیں لائی جائے گی جب تک کہ تمام شرکاء یا ان کی اکثریت ایسا کرنا نہ چاہے اور یہ کہ تنہا حصہ دار جو شراکت سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے اسے اپنا حصہ دوسروں کو بیچنا پڑے گا اور وہ دوسرے حصہ داروں کو کاروبار کی تقسیم یا لیکویڈیشن پر مجبور نہیں کرے گا۔

اسلامی فقہ کی کتابیں اس سوال پر عموماً خاموش نظر آتی ہیں، تاہم ظاہر یہی ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ شرکاء مشارکت کے بالکل آغاز میں اس طرح کی شرط پر اتفاق کر لیں۔ بعض حنبلی فقہاء نے اس طرح کرنے کی صراحتاً اجازت دی ہے۔ (۲)

یہ شرط جدید صورتِ حال میں خاص طور پر قرینِ انصاف معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ آج کل اکثر حالات میں کاروبار کی نوعیت اپنی کامیابی کے لئے تسلسل کا تقاضا کرتی ہے، اور صرف ایک شریک کی خواہش پر لیکویڈیشن یا تقسیم کاروبار سے دوسرے شرکاء کو ناقابلِ برداشت نقصان ہوسکتا ہے۔

اگر ایک بھاری رقم کے ساتھ ایک کاروبار شروع کیا جاتا ہے اور یہ رقم کسی طویل المیعاد منصوبے میں لگا دی جاتی ہے، اور حصہ داران میں سے ایک شخص منصوبے کے ایامِ طفولیت میں ہی لکویڈیشن کا تقاضا کرتا ہے تو اس صورت میں اسے بلاوجہ لیکویڈیشن یا تقسیم کا اختیار دینا دوسرے شرکاء

---

(۱) ملاحظہ ہو: الفتاوی الہندیہ، ج ۲، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔

(۲) ملاحظہ ہو: المرداوی، الانصاف، ج ۵، ص ۴۲۳، بیروت، ۱۴۰۰ء۔

کے مفادات کے لئے اسی طرح سخت نقصان دہ ہوگا جس طرح کہ معاشرے کی معاشی نشو ونما کے لئے۔اس لئے اس طرح کی شرط قرینِ انصاف معلوم ہوتی ہے اور اس کی تائید ایک اصول سے بھی ہوتی ہے جسے حضور اقدس ﷺ نے ایک معروف حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

"المسلمون علی شروطھم الا شرطا احل حراما او حرم حلالا."

مسلمانوں کے معاملے ان کی آپس میں طے شدہ شرطوں کے مطابق ہی ہوتے ہیں،سوائے ایسی شرط کے جو"حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرے"۔

اب تک ''شرکۃ الاموال'' یا ''مشارکہ'' پر اس کے اصل اور قدیم مفہوم کے مطابق گفتگو کی گئی ہے۔اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ چند ایسے مسائل پر بحث کریں جن کا تعلق موجودہ حالت میں مشارکہ کے ان اصولوں پر بطور جائز طریقہ تمویل عمل درآمد کے ساتھ ہے۔لیکن یہ بات موقع کے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان تطبیقی مسائل پر گفتگو ''مضاربہ'' (Mudarbah) کا تعارف کرانے کے بعد کی جائے جو نفع میں شرکت کی ایک اور شکل اور ایک مثالی طریقۂ تمویل ہے۔ چونکہ مشارکہ اور مضاربہ دونوں میں تمویل کے اصول ایک جیسے ہی ہیں اور ان کے عملی انطباق سے متعلق مسائل باہم تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ زیادہ مفید ہوگا کہ ان تطبیقی مسائل پر روشنی ڈالنے سے پہلے مضاربہ کے تصور پر بحث کر لی جائے۔

مضاربہ

مضاربہ

MUDARBAH

''مضاربہ'' شراکت کی ایک خاص شکل ہے جس میں ایک شریک دوسرے کو کاروبار میں لگانے کے لئے رقم فراہم کرتا ہے۔ سرمایہ کاری پہلے شخص کی طرف سے کی جاتی ہے اور اسے ''ربُّ المال'' کہا جاتا ہے، جبکہ کاروبار کا انتظام و انصرام (Management) اور عمل کی ذمہ داری دوسرے فریق کے ساتھ خاص ہے جسے ''مضارب'' کہا جاتا ہے۔

مشارکہ اور مضاربہ میں فرق درجِ ذیل نکات میں مختصراً بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مشارکہ میں سرمایہ دونوں طرف سے فراہم کیا جاتا ہے، جبکہ مضاربہ میں سرمایہ لگانا صرف رب المال کی ذمہ داری ہے۔

(۲) مشارکہ میں تمام شرکاء کاروبار کے لئے کام کر سکتے اور اس کے انتظام و انصرام (Management) میں حصہ لے سکتے ہیں، جبکہ مضاربہ میں رب المال مینجمنٹ میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں رکھتا بلکہ اسے صرف مضارب ہی انجام دے گا۔

(۳) مشارکہ میں تمام شرکاء اپنی سرمایہ کاری کے تناسب کی حد تک نقصان میں شریک ہوتے ہیں، جبکہ مضاربہ میں اگر کوئی خسارہ ہو تو وہ صرف رب المال کو برداشت کرنا ہوگا، اس لئے کہ مضارب تو کوئی سرمایہ ہی نہیں لگاتا، اس کا نقصان اس حقیقت تک محدود رہے گا کہ اس کی محنت رائیگاں گئی اور اسے اس کے عمل کا کوئی صلہ نہیں ملا۔

لیکن یہ اصول اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مضارب نے اس پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کام کیا جو کہ عموماً اس طرح کے کاروبار کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اگر غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ کام کیا یا کسی بددیانتی کا ارتکاب کیا تو وہ اس نقصان کا ذمہ دار ہوگا جو کہ لاپرواہی یا بے ضابطگی کی وجہ سے ہوا ہے۔

(۴) مشارکہ میں عموماً حصہ داروں کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے، لہٰذا اگر کاروبار کی ذمہ داریاں اس کے اثاثہ جات سے بڑھ جاتی ہیں اور نوبت کاروبار کی لیکویڈیشن تک پہنچ جاتی ہے تو اثاثوں سے زائد ذمہ داریاں حصہ داران کو اپنے اپنے متناسب حصے کے مطابق اُٹھانا ہوں گی۔ تاہم اگر تمام شرکاء نے اس بات پر اتفاق کرلیا تھا کہ کوئی شریک کاروبار کی مدت کے دوران کوئی قرض نہیں لے گا تو اس

صورت میں زائد ذمہ داریاں صرف اسی شریک کو اُٹھانا ہوں گی جس نے مذکورہ شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کاروبار پر قرض کا بوجھ ڈالا ہے۔

مضاربہ میں صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں رب المال کی ذمہ داری اس کی سرمایہ کاری تک محدود ہوگی، الا یہ کہ وہ مضارب کو اس (رب المال) کی طرف سے قرض اُٹھانے کی اجازت دیدے۔

(۵) مشارکہ میں جب بھی حصہ داران اپنا سرمایہ خلط ملط کرلیں گے تو مشارکہ کے تمام اثاثہ جات شرکاء کی سرمایہ کاری کے تناسب سے ان کی مشترکہ ملکیت بن جائیں گے (اور وہ سب مشاعاً ان کے مالک بن جائیں گے) اس لئے ان میں سے ہر ایک ان اثاثوں کی قیمتوں میں اضافے سے بھی مستفید ہوگا، اگرچہ انہیں بیچ کر نفع حاصل نہ کیا گیا ہو۔

مضاربہ کی صورت اس سے مختلف ہے۔ مضاربہ میں خریدی ہوئی ساری اشیاء صرف رب المال کی ملکیت ہیں، اور مضارب صرف اسی صورت میں منافع میں سے اپنا حصہ حاصل کرسکتا ہے جبکہ وہ انہیں نفع پر بیچ دے، لہٰذا وہ خود اثاثہ جات میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا، اگرچہ ان کی قیمت بڑھ گئی ہو۔ (۱)

مضاربہ کا کاروبار

رب المال، مضارب کے لئے خاص کاروبار متعین بھی کرسکتا ہے، اس صورت میں مضارب رقم صرف اسی کاروبار میں لگائے گا، اس کو المضاربۃ المقیدہ کہا جاتا ہے، لیکن اگر وہ مضارب کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ جو کاروبار وہ چاہے کرے تو اسے یہ اختیار ہوگا کہ جس کاروبار کو وہ مناسب سمجھے اس میں وہ رقم لگادے، اس کو المضاربۃ المطلقۃ کہا جاتا ہے (یعنی غیر مشروط مضاربہ)۔

ایک رب المال ایک ہی عقد میں ایک سے زائد افراد کے ساتھ بھی مضاربہ کا معاملہ طے کرسکتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ رقم ''الف'' اور ''ب'' دونوں کو (مشترکہ طور پر) پیش کرسکتا ہے، لہٰذا ان دونوں میں سے ہر ایک اس کے لئے بطور مضارب کام کرسکتا ہے اور مضاربہ کا سرمایہ دونوں مشترکہ

(۱) تاہم بعض فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سرمایہ میں کوئی بھی طبعی اضافہ مضارب اور رب المال میں قابلِ تقسیم منافع تصور کیا جائے گا، مثلاً اگر سرمایہ بکریوں کی شکل میں تھا اور ان میں بعض بکریوں نے بچے جن دیئے تو ان بچوں کو منافع شمار کیا جائے گا اور فریقین میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جائے گا (ملاحظہ ہو: النووی: روضۃ الطالبین، ج ۵، ص ۱۲۵) لیکن یہ فقہاء کی اکثریت کا نقطۂ نظر نہیں ہے۔

طور پر استعمال کریں گے اور مضارب کا حصہ ان دونوں کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جائے گا۔(۱) اس صورت میں دونوں مضارب کاروبار ایسے چلائیں گے جیسا کہ دونوں آپس میں شریک ہوں۔

مضارب، خواہ ایک ہو یا زیادہ، ہر وہ کام کر سکتے ہیں جو کہ عموماً اس طرح کے کاروبار میں کیا جاتا ہے، لیکن اگر وہ ایسا غیر معمولی کام کرنا چاہتے ہیں جو تاجروں کے عام معمول اور عادت سے ہٹ کر ہو تو یہ کام رب المال کی صریح اجازت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

منافع کی تقسیم

مضاربہ کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فریقین، بالکل شروع میں، حقیقی منافع کے خاص تناسب پر متفق ہوں جس کے مطابق رب المال اور مضارب میں سے ہر ایک منافع کا مستحق ہوگا۔ شریعت نے منافع کی کوئی متعین نسبت بیان نہیں کی بلکہ اسے فریقین کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ نفع میں برابر نسبت کے ساتھ بھی شریک ہو سکتے ہیں اور رب المال اور مضارب کے لئے الگ الگ نسبت بھی متعین کی جا سکتی ہے، تاہم وہ کسی فریق کے لئے رقم کی لگی بندھی مقدار خاص نہیں کر سکتے، اسی طرح وہ کسی فریق کا نفع رأس المال کے کسی متناسب حصے کے ساتھ بھی متعین نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر اگر رأس المال ایک لاکھ روپے ہے تو وہ اس شرط پر اتفاق نہیں کر سکتے کہ کل منافع میں سے دس ہزار روپے مضارب کے ہوں گے اور نہ ہی وہ یہ طے کر سکتے ہیں کہ (مثلاً) رأس المال کا بیس فیصد رب المال کو دیا جائے گا، البتہ وہ یہ طے کر سکتے ہیں کہ حقیقی نفع کا چالیس فیصد مضارب کو ملے گا اور ساٹھ فیصد رب المال کو، یا اس کے برعکس۔

یہ بھی جائز ہے کہ مختلف حالات میں نفع کی مختلف نسبتیں طے کر لی جائیں۔ مثلاً رب المال مضارب سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم گندم کا کاروبار کرو گے تو تمہیں کل نفع کا پچاس فیصد ملے گا اور اگر آٹے کا کاروبار کرو گے تو کل منافع کا تینتیس فیصد۔ اسی طرح وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم اپنے شہر میں کاروبار کرو گے تو تم نفع کے تیس فیصد کے مستحق ہو گے اور اگر تم کسی دوسرے شہر میں کاروبار کرو گے تو نفع میں سے تمہارا حصہ پچاس فیصد ہوگا۔(۲)

نفع کے طے شدہ متناسب حصے کے علاوہ مضارب مضاربہ کے لئے کیے گئے اپنے کام پر کسی قسم کی تنخواہ، فیس یا معاوضے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔(۳) تمام فقہی مکاتبِ فکر اس نقطے پر متفق ہیں، البتہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی، ج ۵، ص ۱۴۵۔ (۲) بدائع الصنائع، ج ۵، ص ۹۹۔
(۳) سرخسی، المبسوط، ج ۲۲، ص ۱۴۹، ۱۵۰۔

امام احمدؒ مضارب کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ مضاربہ اکاؤنٹ سے صرف یومیہ خوراک کے اخراجات وصول کر لے۔[1] فقہاء حنفیہ کے نزدیک مضارب کو یہ حق صرف اس صورت میں حاصل ہوگا جبکہ وہ اپنے شہر سے باہر کسی کاروباری سفر پر ہو، اس صورت میں وہ ذاتی قیام و طعام وغیرہ کے اخراجات حاصل کر سکتا ہے، اپنے شہر میں ہونے کی صورت میں وہ کسی یومیہ الاؤنس کا مستحق نہیں ہوتا۔ (۲)

اگر کاروبار کو بعض معاملات میں نقصان ہو اور بعض میں نفع، تو پہلے اس نفع سے نقصان کو پورا کیا جائے گا، پھر بھی اگر کچھ بچ جائے تو اسے طے شدہ تناسب سے فریقین میں تقسیم کیا جائے گا۔ (۳)

مضاربہ کو ختم کرنا

مضاربہ کا عقد فریقین میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت ختم کر سکتا ہے۔ شرط صرف یہی ہے کہ دوسرے فریق کو اس کی باقاعدہ اطلاع کر دی جائے۔ اگر مضاربہ کے تمام اثاثہ جات نقد شکل میں ہیں اور رأس المال پر کچھ نفع بھی کمایا جا چکا ہے تو انہیں فریقین میں نفع کے طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کر لیا جائے، لیکن اگر مضاربہ کے اثاثہ جات نقد شکل میں نہیں ہیں تو مضارب کو موقع دیا جائے گا کہ وہ ان اثاثہ جات کو بیچ کر نقد میں تبدیل کرے، تاکہ حقیقی نفع کا تعین ہو سکے۔ (۴)

مسلم فقہاء کے اس سوال کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں کہ کیا مضاربہ ایک متعین مدت کے لئے مؤثر ہو سکتا ہے کہ اس مدت کے گزرنے پر مضاربہ خود بخود ختم ہو جائے۔ حنفی اور حنبلی مکاتبِ فکر کے مطابق مضاربہ کو ایک خاص مدت کے اندر محدود کیا جا سکتا ہے، مثلاً ایک سال، چھ ماہ وغیرہ، جس کے بعد مضاربہ بغیر کسی نوٹس کے ختم ہو جائے گا، اس کے برعکس مالکی اور شافعی فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مضاربہ کو خاص مدت کے اندر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ (۵)

بہر حال اس اختلاف کا تعلق مضاربہ کی مدت کی آخری اور زیادہ سے زیادہ حد کے ساتھ ہے۔ کیا فریقین کی طرف سے مضاربہ کی کم سے کم مدت بھی طے کی جا سکتی ہے، جس سے پہلے مضاربہ کو ختم نہ کیا جا سکے؟ اسلامی فقہ کی کتابوں میں اس سوال کا صریح جواب نہیں ملتا، لیکن ایک ضابطہ جو عموماً یہاں ذکر کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی کوئی مدت متعین نہیں کی جا سکتی، اور ہر فریق کو

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی، ج ۵، ص ۱۸۶۔ (۲) الکاسانی، بدائع الصنائع، ج ۶، ص ۱۰۹۔
(۳) ابن قدامہ، ج ۵، ص ۱۶۸۔ (۴) الکاسانی، بدائع الصنائع، ج ۶، ص ۱۰۹۔
(۵) حوالہ بالا ج ۶، ص ۹۹، نیز ملاحظہ ہو: ابن قدامہ: المغنی، ج ۵، ص ۱۸۵، السرخسی المبسوط، ج ۲۲، ص ۱۳۳۔

جب وہ چاہے معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہے۔

فریقین کا مضاربہ ختم کرنے کا یہ غیر محدود اختیار موجودہ حالات میں بعض مشکلات پیدا کرسکتا ہے، اس لئے کہ آج کل اکثر کاروباری مہمیں اپنے ثمرات دکھانے کے لئے کچھ وقت کی محتاج ہوتی ہیں، انہیں پیچیدہ اور مستقل مزاجی والی کوششیں درکار ہوتی ہیں، اس لئے اگر رب المال کاروباری مہم کے بالکل شروع ہی میں مضاربہ ختم کردیتا ہے تو یہ بات اس منصوبے کے لئے بڑی مشکل کا باعث ہوگی۔ خاص طور پر مضارب کے لئے شدید دھچکا ہوگا جو کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود کچھ کما نہیں سکے گا۔ اس لئے اگر عقد مضاربہ میں داخل ہوتے وقت ہی فریقین اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ کوئی فریق بھی ایک معینہ مدت کے اندر چند مخصوص حالات کے علاوہ مضاربہ کو ختم نہیں کرے گا تو یہ بات بظاہر شریعت کے کسی اصول کے خلاف معلوم نہیں ہوتی، بالخصوص اس حدیث کی روشنی میں جس کا پہلے بھی حوالہ دیا جاچکا ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ:

"المسلمون علی شروطھم الا شرطا احل حراما او حرم حلالا۔"

مسلمانوں کے درمیان طے شدہ شرطوں کو برقرار رکھا جائے گا سوائے ان شرطوں کے جو کسی حرام کی اجازت دیدیں یا کسی حلال کو حرام کردیں۔

مشارکہ اور مضاربہ کا اجتماع

عام حالات میں یہی تصور کیا جاتا ہے کہ مضارب نے مضاربہ میں کوئی سرمایہ نہیں لگایا، وہ صرف مینجمنٹ کا ذمہ دار ہے، جبکہ سرمایہ سارا رب المال کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن ایسی صورتِ حال بھی ہوسکتی ہے کہ مضارب بھی اپنا کچھ سرمایہ مضاربہ کے کاروبار میں لگانا چاہے۔ اس صورتِ حال میں مشارکہ اور مضاربہ دو عقد اکٹھے ہو جائیں گے۔ مثلاً A، B کو ایک لاکھ روپیہ مضاربہ کے طور پر دیتا ہے اور B، A کی رضامندی سے پچاس ہزار اپنی جیب سے شامل کرلیتا ہے۔ اس طرح کی شراکت کے ساتھ مشارکہ اور مضاربہ کے اجتماع والا معاملہ کیا جائے گا۔ یہاں مضارب اپنے لئے بطور شریک نفع کا خاص فیصدی حصہ متعین کرسکتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ بطور مضارب اپنی مینجمنٹ اور عمل کی وجہ سے نفع کا ایک اور فیصدی حصہ متعین کرسکتا ہے۔ مذکورہ مثال میں منافع کی تعیین کی بنیاد یہ ہوگی کہ B حقیقی نفع کا ایک تہائی حصہ اپنی سرمایہ کاری کی وجہ سے حاصل کرے گا، باقی ماندہ دو تہائی نفع دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، لیکن (اس حصے کی تقسیم میں) فریقین کسی اور نسبت پر بھی متفق ہو سکتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ غیر عامل شریک (Sleeping Partner) اپنے سرمائے کے تناسب سے زیادہ حاصل نہیں

کر سکتا۔ لہٰذا مذکورہ مثال میں A اپنے لئے کُل نفع کے دوتہائی سے زیادہ متعین نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اس نے جو سرمایہ لگایا ہے وہ کُل سرمائے کے دوتہائی سے زیادہ نہیں ہے۔

مشارکہ اور مضاربہ بطور طریقۂ تمویل

گزشتہ ابواب میں مشارکہ اور مضاربہ کے قدیم تصور اور ان سے متعلق شرعی احکام کی تشریح کی گئی ہے۔ اب اس پر بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید صنعت وتجارت میں ان دو ذریعوں کو تمویل (Financing) کی غرض سے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مشارکہ اور مضاربہ کا تصور اسلامی فقہ کی کتابوں میں اس خیال پر مبنی ہے کہ یہ دونوں عقد ایسی مشترکہ کاروباری مہم شروع کرنے کے لئے ہیں جہاں دونوں فریق بالکل شروع شروع میں کاروبار میں شامل ہوتے ہیں اور بالکل آخر تک جبکہ تمام اثاثہ جات کو نقد میں تبدیل کر لیا جاتا ہے، شریک رہتے ہیں۔ اسلامی فقہ کی قدیم کتابوں میں بمشکل ہی ایسے جاری کاروبار کا تصور مل سکتا ہے جس میں شرکاء کاروبار کے تسلسل پر کسی بھی طرح اثر انداز ہوئے بغیر شریک ہوتے اور الگ ہوتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی فقہ کی قدیم کتابیں ایسے ماحول میں لکھی گئی ہیں جہاں بڑی سطح کی کاروباری مہمیں مروّج نہیں تھیں اور کاروباری سرگرمیاں اس طرح پیچیدہ نہیں تھیں جس طرح کہ آج ہیں، اس لئے ان حضرات نے اس طرح کے جاری کاروبار کے سوال پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مشارکہ اور مضاربہ کو جاری کاروبار کی تمویل کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مشارکہ اور مضاربہ کا تصور چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہے، ان اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ان پر عمل کی شکلیں زمانے کے بدلنے سے بدل سکتی ہیں۔ تفصیل میں جانے سے پہلے ہمیں ان بنیادی اصولوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

(۱) مشارکہ اور مضاربہ کے ذریعے تمویل رقم بطور قرض دینے کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ مشارکہ کی صورت میں اس تمویل کا مطلب ہے اپنی تمویل (لگائے ہوئے سرمائے) کے تناسب سے اس کاروبار کے اثاثہ جات میں شریک ہونا۔

(۲) سرمایہ کار / تمویل کار کو اپنی تمویل کی حد تک کاروبار کو ہونے والے نقصان میں بھی لازماً شریک ہونا ہوگا۔

(۳) شرکاء کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے اپنے میں سے ہر ایک کے لئے نفع کی جو نسبت چاہیں مقرر کر سکتے ہیں، تاہم جو شریک صراحتاً خود کو کاروبار کے لئے کام کرنے کی

ذمہ داری سے الگ کر لیتا ہے وہ اپنی سرمایہ کاری کے تناسب سے زائد شرح منافع کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

(۴) خسارہ ہر ایک کو اپنی سرمایہ کاری کے تناسب سے برداشت کرنا ہوگا۔

ان عمومی اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب ہم یہ دیکھنے جا رہے ہیں کہ مشارکہ اور مضاربہ کو تمویل کے مختلف شعبوں میں کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

منصوبوں کی تمویل

(Project financing)

منصوبوں کی تمویل (Project Financing) کے لئے مشارکہ اور مضاربہ کا قدیم تصور بڑی آسانی سے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر تمویل کار (Financier) مکمل منصوبے میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے تو مضاربہ عمل میں لایا جائے گا۔ اگر سرمایہ دونوں طرف سے لگایا جاتا ہے تو مشارکہ کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس صورت میں اگر مینجمنٹ ایک پارٹی ہی کی ذمہ داری ہے جبکہ سرمایہ دونوں طرف سے لگایا گیا ہے تو پہلے ذکر کردہ قواعد کے مطابق مشارکہ اور مضاربہ کا اجتماع عمل میں آئے گا۔

چونکہ مشارکہ اور مضاربہ منصوبے کے بالکل شروع ہی سے مؤثر ہوں گے اس لئے سرمائے کی قیمت کے تعین کا مسئلہ بھی پیش نہیں آئے گا، اسی طرح عام حسابی معیاروں (Accounting Standards) کے مطابق منافع کی تقسیم بھی مشکل نہیں ہوگی۔ تاہم اگر تمویل کار (Financier) مشارکہ سے نکلنا چاہتا اور دوسرا فریق کاروبار کو جاری رکھنا چاہتا ہے تو مؤخر الذکر پہلے فریق کا حصہ ایک باہمی طے شدہ قیمت پر خرید سکتا ہے، اس طریقے سے تمویل کار اپنی لگائی ہوئی رقم بمع منافع واپس لے سکتا ہے، اگر کاروبار میں کچھ منافع ہوا ہو، اس کے حصے کی قیمت کا تعین کس بنیاد پر کیا جائے گا اس پر بحث بعد میں کی جائے گی (ورکنگ کیپٹل کی تمویل پر بحث کرتے وقت)۔

دوسری طرف تاجر (جس نے تمویل حاصل کی تھی) اپنا منصوبہ جاری رکھ سکتا ہے خواہ اپنی ملکیت میں رکھ کر یا پہلے تمویل کار کا حصہ کسی اور شخص کو بیچ کر جو کہ سابقہ تمویل کار کا قائم مقام ہوگا۔

چونکہ تمویلی ادارے (Financial Institution) عموماً زیادہ عرصے کے لئے خاص منصوبے میں حصہ دار نہیں رہنا چاہتے اس لئے جیسا کہ ابھی کہا گیا وہ اپنا حصہ منصوبے کے دوسرے شرکاء کو بیچ سکتے ہیں۔ اگر منصوبے میں سیال سرمایہ یعنی نقد رقم کی کمی کی وجہ سے یہ حصہ یکمشت بیچنا ممکن

نہ ہو تو تمویل کار کا حصہ چھوٹے یونٹس میں تقسیم کر کے ہر یونٹ کو مناسب وقفوں کے بعد بیچا جا سکتا ہے۔ جب ایک یونٹ بک جائے تو اس حد تک تمویل کار (Financier) کا منصوبے میں حصہ کم ہو جائے گا، اور جب تمام یونٹس فروخت ہو جائیں گے تو تمویل کار منصوبے سے مکمل طور پر باہر نکل آئے گا۔

مشارکہ کو تمسکات میں تبدیل کرنا

(Securitization of Musharakah)

مشارکہ ایک ایسا طریقۂ تمویل ہے جس کو بآسانی سیکیورٹائز کیا جا سکتا ہے (یعنی قابلِ تبادلہ دستاویزات میں ڈھالا جا سکتا ہے) خاص طور پر بڑے بڑے منصوبوں میں جہاں رقم کی بہت بڑی مقدار درکار ہوتی ہے جو محدود تعداد میں لوگ کاروبار میں شریک نہیں کر سکتے، ہر رقم ڈالنے والے کو ایک ''مشارکہ سرٹیفکیٹ'' دیا جا سکتا ہے جو کہ اس مشارکہ کے اثاثوں میں اس کے متناسب حصے کی نمائندگی کرتا ہے، اور جب مادی اور غیر نقد اثاثے حاصل کر کے کاروباری منصوبہ شروع ہو جائے گا تو ان ''مشارکہ سرٹیفکیٹس'' کو قابلِ تبادلہ ذرائع کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور انہیں ثانوی بازار[1] میں خریدا اور بیچا جا سکے گا، لیکن ان سرٹیفکیٹس کا کاروبار اس وقت جائز نہیں ہوگا جب کہ مشارکہ کے تمام اثاثے سیال شکل میں ہوں (یعنی نقد رقم، واجب الوصول رقوم، دوسروں کو دیئے ہوئے قرضوں کی رقوم)۔

اس نقطے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ مشارکہ میں سرمایہ لگانا قرض دینے سے مختلف ہے۔ کسی قرض کی شہادت کے طور پر جاری کیے جانے والے بانڈ کا بطور قرض لی گئی رقم سے کیے جانے والے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ بانڈ صرف اس قرض کی نمائندگی کرتا ہے جو حامل کی طرف ہر حالت میں لوٹانا ہوگا، اور عموماً سود کے ساتھ لوٹانا ہوتا ہے، اس کے برعکس مشارکہ سرٹیفکیٹ منصوبے کے اثاثوں میں حامل کی براہِ راست متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر مشترکہ منصوبے کے تمام اثاثہ جات سیال شکل میں ہیں تو سرٹیفکیٹ منصوبے کی مملوکہ رقم کی خاص نسبت کی نمائندگی کرے گا۔ مثال کے طور پر ایک سو سرٹیفکیٹ جاری کیے گئے جن میں سے ہر ایک کی مالیت ایک ملین روپے ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ منصوبے کی کل مالیت سو ملین روپے ہے۔ اگر اس رقم سے کوئی چیز نہیں خریدی گئی تو ہر سرٹیفکیٹ ایک ملین روپے کی نمائندگی کرے گا۔ اس صورت میں یہ سرٹیفکیٹ صرف لکھی ہوئی اصل رقم (ایک ملین مثلاً) پر ہی بیچا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اگر ایک سرٹیفکیٹ

---

(۱) یعنی وہ بازار جہاں کمپنیوں کے شیئرز، سرکاری تمسکات اور دیگر مالیاتی دستاویزات کی جاری کنندہ کے علاوہ تیسرے فریق کے ہاتھ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

ایک ملین سے زائد پر بیچا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ملین روپے، ایک ملین روپے سے زائد پر بیچے جارہے ہیں جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ جب روپے کے بدلے میں روپے کی بیع ہورہی ہو تو دونوں طرف سے روپیہ برابر ہونا ضروری ہے، کسی بھی طرف سے دی گئی زیادہ مقدار ربا ہوگی۔

لیکن جب اشتراک شدہ رقم غیر سیال اثاثوں مثلاً زمین، بلڈنگ، مشینری، خام مال اور فرنیچر وغیرہ کی خریداری میں لگا دی گئی تو مشارکہ سرٹیفکیٹ ان اثاثوں میں سرٹیفکیٹ ہولڈر کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرے گا، لہٰذا مذکورہ مثال میں ایک سرٹیفکیٹ ان اثاثوں کے سوویں (۱/۱۰۰) حصے کی نمائندگی کرے گا۔ اس صورت میں شرعاً اس سرٹیفکیٹ کو ثانوی بازار میں فریقین کے درمیان طے شدہ کسی بھی قیمت پر بیچنا جائز ہوگا۔ یہ قیمت، قیمتِ اسمیہ (Face Value) سے زائد بھی ہوسکتی ہے، اس لئے کہ یہاں جس چیز کی خرید وفروخت ہورہی ہے وہ حسی اور مادی اثاثوں کا ایک حصہ ہے، صرف زر نہیں ہے، لہٰذا اس سرٹیفکیٹ کو کسی بھی دوسرے سامان کی طرح سمجھا جاسکتا ہے جسے نفع یا نقصان پر بیچا جاسکتا ہے۔

اکثر حالات میں منصوبے کے اثاثے سیال اور غیر سیال اثاثہ جات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے کہ جبکہ عامل شریک (Working Partner) اشتراک شدہ سرمائے کے ایک حصے کو جامد اثاثوں یا خام مال میں تبدیل کرچکا ہو، جبکہ باقی رقم ابھی سیال شکل میں ہو، یا رقم کو غیر سیال اثاثوں میں تبدیل کرنے کے بعد ان میں سے چند اثاثوں کو بیچ کر کچھ رقم حاصل کی جاچکی ہو۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان اثاثوں کی فروختگی کی وجہ سے ان کی قیمت گاہکوں کے ذمے اُدھار ہو لیکن اسے ابھی وصول نہ کیا گیا ہو، اس قابلِ وصول رقم کے ساتھ دین ہونے کی وجہ سے سیال رقم والا ہی معاملہ کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں جبکہ منصوبے کے اثاثے سیال اور غیر سیال (نقد اور غیر نقد) کا مجموعہ ہوں تو اس کے حکم شرعی کے بارے میں سوال اُبھرتا ہے کہ ایسے منصوبے کے مشارکہ سرٹیفکیٹس کا کاروبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے پر معاصر فقہاء کے مختلف نقطۂ نظر ہیں۔ قدیم شافعی مکتبِ فکر کے مطابق اس طرح کے سرٹیفکیٹ کو بیچا نہیں جاسکتا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں سیال اور غیر سیال اثاثوں کا مجموعہ ہو وہاں اس وقت تک بیع نہیں ہوسکتی جب تک کہ کاروبار کے غیر سیال حصے کو الگ کرکے اس کی مستقل بیع نہ کی جائے[1]

---

(۱) یہ نقطۂ نظر اسلامی فقہ کی قدیم کتابوں میں بیان کیے گئے ''مد العجوۃ'' کے معروف قاعدے پر مبنی ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: الخطابی: معالم السنن، ج ۵، ص ۲۳۔

فقہ حنفی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں سیال اور غیر سیال اثاثوں کا مجموعہ ہو تو اسے بیچا جا سکتا ہے بشرطیکہ قیمت مجموعی اثاثوں میں شامل سیال اثاثوں کی مالیت سے زائد ہو۔ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ زر کی بیع اس کے برابر زر کے بدلے میں ہوئی ہے اور زائد رقم کاروبار کی ملکیت میں موجود غیر سیال اثاثوں کی قیمت ہے۔

فرض کیجئے مشارکہ پراجیکٹ چالیس فیصد غیر سیال اثاثوں یعنی مشینری، غیر منقولہ اشیاء وغیرہ اور ساٹھ فیصد سیال اثاثوں یعنی کیش اور قابلِ وصول مالیت پر مشتمل ہے۔ اب سو روپے فیس ویلیو والا مشارکہ سرٹیفکیٹ ساٹھ روپے کے سیال اور چالیس روپے کے غیر سیال اثاثوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کو ساٹھ روپے سے زائد کسی بھی قیمت پر بیچا جا سکتا ہے۔ اس کو اگر =/110 روپے میں بیچا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا ساٹھ روپے ان ساٹھ روپوں کے بدلے میں ہیں جن پر یہ سرٹیفکیٹ مشتمل ہے، اور باقی پچاس روپے غیر سیال اثاثوں کے متناسب حصے کے بدلے میں ہیں۔ لیکن اس بات کی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ ساٹھ روپے یا اس سے کم پر بیچا جائے، اس لئے کہ اس صورت میں ایسا نہیں ہو سکے گا کہ باقی اثاثہ جات کو الگ کر کے ساٹھ روپے ساٹھ روپے کے مقابلے میں آجائیں (اس لئے کہ غیر سیال اثاثوں کے مقابلے میں ان ساٹھ روپوں کا کچھ حصہ تو لازماً آئے گا)

فقہ حنفی کے مطابق مجموعی اثاثہ جات میں غیر سیال اثاثوں کا کوئی خاص تناسب متعین نہیں ہے، لہٰذا اگر غیر سیال اثاثے مجموعی اثاثوں میں پچاس فیصد سے کم بھی ہیں تب بھی مذکورہ قاعدے کے مطابق اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی۔

تاہم بہت سے معاصر فقہاء جن میں شافعی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں، مجموعی اثاثوں کے ان یونٹس کی خرید وفروخت کی اجازت اس صورت میں دیتے ہیں جبکہ کاروبار کے غیر سیال اثاثے پچاس فیصد سے زائد ہوں۔

لہٰذا مشارکہ سرٹیفکیٹ کے تمام فقہی مکاتبِ فکر کے ہاں قابلِ قبول کاروبار کے لئے یہ ضروری ہے کہ مشارکہ کا مجموعہ (Portfolio) پچاس فیصد سے زائد مالیت کے غیر سیال اثاثوں پر مشتمل ہو، لیکن اگر صرف فقہ حنفی پر عمل کرنا ہو تو یہ کاروبار اس صورت میں بھی جائز ہے جبکہ غیر سیال اثاثے پچاس فیصد سے کم ہوں، لیکن یہ غیر سیال اثاثے اتنے کم نہ ہوں کہ بالکل ہی ناقابلِ ذکر ہوں۔

ایک عقد کی تمویل (Financing of Single Transaction)

مشارکہ اور مضاربہ ایک ہی معاہدے کی تمویل کے لئے زیادہ آسانی کے ساتھ استعمال ہو

سکتے ہیں۔ چھوٹے تاجروں کی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ انہیں امپورٹ اور ایکسپورٹ کی تمویل کے لئے بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ایک درآمد کنندہ (Importer) صرف درآمد کے ایک معاہدے[1] کی مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر تمویل کے لئے کسی تمویل کار (Financier) کے پاس جا سکتا ہے۔ بینک بھی ان دو ذریعوں (مشارکہ اور مضاربہ) کو درآمد کی تمویل (Import Financing) کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ایل سی بغیر مارجن کے کھولی گئی ہے[2] تو مضاربہ کی صورت اختیار کی جا سکتی ہے، اور اگر ایل سی کسی مارجن پر کھولی گئی ہے تو مشارکہ یا مضاربہ اور مشارکہ کا مجموعہ قابلِ عمل ہوگا[3] درآمد شدہ اشیاء گودی سے چھڑوانے کے بعد ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم درآمد کنندہ اور تمویل کار میں پہلے سے طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لی جائے۔

اس صورت میں درآمد شدہ اشیاء تمویل کار کے لگائے سرمایہ کے تناسب سے اس کی ملکیت میں رہیں گی۔ اس مشارکہ کو ایک طے شدہ مدت تک محدود بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس معینہ مدت کے اندر یہ اشیاء فروخت نہ ہوئیں تو درآمد کنندہ خود تمویل کار کا حصہ خرید کر اکیلا ہی ان اشیاء کا مالک بن جائے گا۔ لیکن اس صورت میں بیع بازاری قیمت کے مطابق ہونی چاہیے یا ایسی قیمت پر جو بیع کے دن فریقین میں طے پائی ہو۔ مشارکہ میں داخل ہوتے وقت جو قیمت طے کی گئی ہے اس پر بیچنا درست نہیں۔ اگر قیمت پہلے ہی طے ہو چکی ہے تو تمویل کار اپنے کلائنٹ درآمد کنندہ کو اس کی خریداری پر مجبور نہیں کر سکتا۔

اسی طرح برآمد کی تمویل (Export Financing) کی صورت میں بھی مشارکہ بہت آسان ہوگا۔ وہ قیمت جس پر یہ اشیاء برآمد کی جائیں گی وہ پہلے ہی پوری طرح معلوم ہے اور تمویل کار (Financier) متوقع منافع کا بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے، یہ مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر

---

(۱) لیکن درآمد کنندہ اور دوسرے ملک کے برآمد کنندہ کے درمیان جو بیع کا معاملہ طے پایا ہے اس کی رقم کی ادائیگی کے لئے۔ (مترجم)

(۲) یعنی ایل سی کھولتے وقت درآمد کنندہ نے بینک کو کوئی ادائیگی نہیں کی۔ (مترجم)

(۳) یعنی ایل سی زیرو مارجن پر ہونے کی صورت میں قیمت کی مکمل ادائیگی بینک یا تمویل کار کی طرف سے ہو رہی ہے، امپورٹر صرف خرید کر آگے بیچنے کا کام کر رہا ہے اس لئے یہ مضارب ہوگا اور تمویل کرنے والا رب المال، اور اگر کچھ مارجن پر ایل سی کھولی گئی ہے تو درآمد شدہ اشیاء کی کچھ رقم امپورٹر نے ادا کی ہے کچھ تمویل کار نے، اس لئے ان اشیاء میں یہ اس تناسب سے شریک ہو جائیں گے اور اگر عمل کی ذمہ داری صرف امپورٹر پر ہے تو یہ شریک بھی ہے اور مضارب بھی۔ (مترجم)

تمویل کر سکتا ہے اور ایکسپورٹ بل کی مالیت میں پہلے سے طے شدہ فیصدی تناسب سے شریک ہو سکتا ہے، خود کو برآمد کنندہ کی کسی لاپرواہی کی وجہ سے ہونے والے نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے تمویل کرنے والا یہ شرط لگا سکتا ہے کہ ایل سی کی شرائط کے بالکل مطابق اشیاء روانہ کرنا برآمد کنندہ کی ذمہ داری ہوگی، اگر ایل سی کے ساتھ کسی قسم کا اختلاف پایا گیا تو اس کا ذمہ دار صرف برآمد کنندہ ہوگا، اور اس طرح کے فرق کی وجہ سے ہونے والے نقصان سے تمویل کار محفوظ ہوگا، اس لئے کہ یہ نقصان برآمد کنندہ کی غفلت کی وجہ سے ہوا ہے، لیکن برآمد کنندہ کے ساتھ شریک ہونے کے ناطے تمویل کار کو ہر ایسا نقصان برداشت کرنا ہوگا جو کہ برآمد کنندہ کی غفلت یا بے ضابطگی کے علاوہ کسی وجہ سے ہوا ہو۔ (۱)

رواں اخراجات کے لئے تمویل

(Fina ncing of the working capital)

اگر ایک جاری کاروبار کے رواں اخراجات (Working Capital) کے لئے تمویل کی ضرورت ہو تو مشارکہ کا ذریعہ مندرجہ ذیل طریقوں سے استعمال ہو سکتا ہے۔

۱۔ جاری کاروبار کے کُل سرمائے کی باہمی رضامندی سے قیمت لگائی جائے۔ مشارکہ کے قدیم تصور پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق یہ ضروری نہیں ہے کہ مشارکہ کا سرمایہ نقد کی شکل ہی میں شامل کیا جائے۔ غیر سیال اثاثے بھی قیمت کا تعین کر کے مشارکہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو یہاں اپنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے کاروبار کی کُل قیمت کو اس شخص کی سرمایہ کاری سمجھا جائے گا جو تمویل چاہتا ہے، جبکہ تمویل کار کی طرف سے دی گئی رقم کو سرمایہ کاری میں اس کا حصہ تصور کیا جائے گا۔ مشارکہ ایک محدود مدت مثلاً ایک سال، چھ مہینے یا کم و بیش کے لئے بھی مؤثر ہو سکتا ہے۔ دونوں فریق نفع کا متعین فیصدی حصہ طے کر لیں گے جو کہ تمویل کرنے والے کو دیا جائے گا۔ یہ حصہ اس کی سرمایہ کاری کے تناسب سے زائد نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ کاروبار کے لئے کام نہیں کرے گا۔ مدت کے اختتام پر تمام سیال اور غیر سیال اثاثہ جات کی دوبارہ قیمت لگائی جائے گی اور نفع اس قیمت کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا۔

اگر چہ قدیم تصور کے مطابق نفع کا تعین اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ کاروبار کے تمام اثاثہ جات کو سیال نہ بنا لیا جائے، لیکن اثاثوں کی قیمت کے تعین کو باہمی رضامندی سے معنوی اور تقدیری تنضیض (سیال بنانا) تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ شریعت میں اس طرح کرنے کے خلاف

(۱) درآمد اور برآمد تمویل کے بارے میں مزید تفصیل ملاحظہ ہو: ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت''، ص ۱۴۷ تا ۱۵۲

ممانعت کا کوئی خاص حکم نہیں ہے۔اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ عامل شریک (Working Partner) نے کاروبار کے اثاثوں میں تمویل کنندہ کے حصہ کو خرید لیا ہے،اور اس کے حصے کے ثمن کا تعین کاروبار کے اثاثوں کی قیمت لگا کر کیا گیا ہے جس میں مشارکہ کی شرطوں کے مطابق اس کے لئے متعین کی گئی نفع کی شرح کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

مثال کے طور پر "A" کے کاروبار کی کُل مالیت 30 یونٹس ہے۔ "B" مزید 20 یونٹس کی تمویل کرتا ہے، جس سے مجموعی مالیت 50 یونٹس بن جاتی ہے، جن میں % 40 B کی طرف سے شریک کیے گئے ہیں اور % 60 A کے ہیں۔فریقین میں یہ طے پایا ہے کہ B حقیقی نفع کا % 20 لے گا۔مدت کے اختتام پر کاروبار کی کُل مالیت 100 یونٹس تک پہنچ چکی ہے۔اب اگر A، B کا حصہ خریدتا ہے تو اسے چاہئے کہ B کو 40 یونٹس ادا کرے،اس لئے کہ وہ کاروبار کے % 40 حصے کا مالک ہے،لیکن اس مقصد کے لئے کہ نفع کی طے شدہ نسبت اس کے حصے کی قیمت میں منعکس ہو، قیمت لگانے کا فارمولا مختلف ہوگا۔کاروبار کی قیمت میں کوئی بھی اضافہ فریقین میں % 20 اور % 80 کی نسبت سے تقسیم ہوگا،اس لئے کہ یہ نسبت معاہدے میں نفع کی تقسیم کے لئے طے ہوگئی تھی۔

چونکہ کاروبار کی قیمت میں اضافہ 50 یونٹس کا ہوا ہے،اس لئے یہ 50 یونٹس 20-80 کی نسبت سے تقسیم ہوں گے،جس کا مطلب یہ ہوگا کہ B کو 10 یونٹس نفع حاصل ہوا ہے۔ یہ دس یونٹس اس کے اصل 20 یونٹس میں شامل کرلیے جائیں گے اور اس کے حصے کی قیمت 30 یونٹس ہوں گے۔

خسارے کی صورت میں اثاثوں کی قیمت میں کوئی بھی کمی ان کی سرمایہ کاری کی نسبت کے بالکل مطابق تقسیم ہوگی، یعنی 40 اور 60 کی نسبت سے۔لہٰذا مذکورہ بالا مثال میں اگر کاروبار کی قیمت میں 10 یونٹس کی کمی ہوگئی،جس سے 40 یونٹس باقی رہ گئے تو چار یونٹس کا خسارہ B برداشت کرے گا (جو کہ کُل خسارے کا % 40 ہے)۔یہ چار یونٹ اس کے اصل 20 یونٹس سے کم کرلیے جائیں اور اس کے حصے کی قیمت سولہ یونٹ متعین کی جائے گی۔ جدول نمبر 2 (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو) سے اس فارمولے کی مزید وضاحت ہوجائے گی۔

۲۔صرف اجمالی منافع میں شرکت

مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق مشارکہ کی بنیاد پر تمویل ایسے کاروبار میں مشکل ہوسکتی ہے جس میں جامد اثاثہ جات (Fixed Assets) زیادہ ہوں، خاص طور پر ایک رواں صنعتی ادارے میں،اس لئے ان تمام اثاثوں کی قیمت لگانا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی قیمت میں کمی بیشی کا

جدول نمبر 2:

کاروبار

A

حصہ 30 (60%)

نفع میں طے شدہ شرح 80%

نفع میں A کا حصہ 40 (80%)

A کا اصل حصہ 30

مجموعی حصہ 70

↑ حصے کی قیمت

اصل مالیت
50

اضافے کے بعد قیمت
100

نفع
50

B

حصہ 20 (40%)

نفع میں طے شدہ شرح 20%

نفع میں B کا حصہ 10

B کا اصل حصہ 20

مجموعی حصہ 30

↑ حصے کی قیمت

تعین کرنا اکاؤنٹنگ کے نقطۂ نظر سے مشکلات پیدا کرسکتا اور تنازعہ کا باعث بن سکتا ہے، ایسی صورت میں مشارکہ پر ایک اور طریقے سے عمل کیا جاسکتا ہے۔

ایسی صورتوں میں زیادہ مشکلات بالواسطہ اخراجات کا حساب لگانے میں پیش آتی ہیں، جیسے مشینری کی قیمت میں کمی، عملے کی تنخواہیں وغیرہ۔ اس مشکل کے حل کے لئے فریقین اس بات پر متفق ہوسکتے ہیں کہ صافی منافع (Net Profit) کی بجائے اجمالی منافع (Gross Profit)[1] قابل تقسیم ہوگا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام بالواسطہ اخراجات صنعت کار رضا کارانہ طور پر برداشت کرے گا، اور صرف براہِ راست اخراجات (جیسے خام مال، براہِ راست مزدوری، بجلی وغیرہ) مشارکہ برداشت کرے گا۔ لیکن چونکہ صنعت کار رضا کارانہ طور پر اپنی مشینری، بلڈنگ اور سٹاف مشارکہ کو پیش کر رہا ہے اس لئے اسے اس کا کسی حد تک صلہ دینے کے لئے نفع میں اس کا فیصدی حصہ زیادہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ طریق کار اس بنیاد پر بھی قرینِ انصاف ہے کہ مالیاتی اداروں کے عمیل (یعنی ان سے تمویل حاصل کرنے والے) خود کو ان سرگرمیوں تک عموماً محدود نہیں رکھتے جن کے لئے انہوں نے مالیاتی اداروں سے تمویل حاصل کی ہوتی ہے، بلکہ ان کی مشینری اور سٹاف وغیرہ ایسے کاموں میں بھی مصروف رہتے ہیں جن کا مشارکہ کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ اس صورت میں (مشینری وغیرہ کے) یہ سارے اخراجات مشارکہ پر نہیں ڈالے جاسکتے۔

اب ہم ایک عملی مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجئے ایک جننگ فیکٹری کے پاس ایک بلڈنگ ہے جس کی مالیت بائیس ملین روپے ہے، پلانٹ اور مشینری کی مالیت دو ملین ہے اور سٹاف کو تنخواہیں ماہانہ پچاس ہزار ادا کی جاتی ہیں۔ فیکٹری ایک بینک سے ایک سال کی مدت کے لئے پچاس لاکھ (پانچ ملین) روپے کی مشارکہ کی بنیاد پر فائنانسنگ لینا چاہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سال کے بعد مشارکہ ختم ہوجائے گا، اور اس وقت تک حاصل شدہ منافع دونوں پارٹیوں میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ نفع کی تعیین کرتے وقت تمام براہِ راست اخراجات (Direct Expenses) آمدن سے منہا کر لیے جائیں گے۔ براہِ راست اخراجات میں مندرجہ ذیل اخراجات شامل ہوتے ہیں۔

۱۔ خام مال کی خریداری پر خرچ ہونے والی رقم۔

۲۔ ان عاملین کی تنخواہیں جو براہِ راست خام مال کو ترقی دینے سے وابستہ ہیں۔

---

(۱) ''نفع، نقصان کا میزانیہ'' تیار کرنے کا طریقہ اور متعلقہ اصطلاحات کی قدرے وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص ۶۸، ۶۹۔

۳۔ اس بجلی کے اخراجات جو جننگ کے عمل میں صرف ہوئی ہے۔

۴۔ دوسری خدمات کے بل جو براہِ راست مشارکہ کو مہیا کی گئی ہیں۔

جہاں تک بلڈنگ، مشینری اور دیگر عملے کی تنخواہوں کا تعلق ہے تو ظاہر ہے یہ صرف مشارکہ کے کاروبار کے لئے نہیں ہیں، اس لئے کہ مشارکہ تو ایک سال میں ختم ہو جائے گا، اور بلڈنگ اور مشینری کو طویل مدت کے لئے خریدا گیا ہے جس کے دوران جننگ فیکٹری انہیں اپنے کاروبار کے لئے استعمال کرتی رہے گی جس کا ایک سالہ مشارکہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا، اس لئے بلڈنگ اور مشینری کی لاگت کا سارا بوجھ اس قصیر مدتی مشارکہ پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کیا جا سکتا ہے کہ مدتِ مشارکہ کے دوران بلڈنگ اور مشینری کی فرسودگی کو مشارکہ کے اخراجات، میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن عملی طور پر اس فرسودگی کی قیمت کا تعین انتہائی مشکل ہوگا اور اس کی وجہ سے تنازعہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے دو عملی راستے ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ دونوں پارٹیاں یہ طے کر لیں کہ ''مشارکہ'' عمیل (تمویل حاصل کرنے والے اصل مالک) کو مشینری اور بلڈنگ کے استعمال کی وجہ سے طے شدہ کرایہ ادا کرے گا۔ مشارکہ کی طرف سے اسے یہ کرایہ ہر حالت میں ملے گا، خواہ کاروبار میں نفع ہو یا نقصان۔

دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ عمیل کو کرایہ ادا کرنے کے بجائے نفع میں اس کا تناسب بڑھا دیا جائے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے اسے خدمات میں مضاربہ پر قیاس کرتے ہوئے درست قرار دیا جا سکتا ہے جو کہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے۔

۳۔ یومیہ پیداوار کی بنیاد پر جاری مشارکہ اکاؤنٹ

بہت سے مالیاتی ادارے کسی کاروبار کے ورکنگ کیپٹل کی فائنانسنگ اس طریقے سے کرتے ہیں کہ اس کاروبار کے لئے ایک جاری اکاؤنٹ کھول دیا جاتا ہے، جہاں سے وہ مختلف وقفوں سے مختلف مقدار میں رقم نکلواتے رہتے ہیں، اسی طرح ضرورت سے زائد رقوم اس اکاؤنٹ میں دوبارہ بھی جمع کراتے رہتے ہیں۔ یوں منہائی اور جمع (Dabit and Credit) کا عمل پختگی (Maturity) کی تاریخ تک جاری رہتا ہے اور سود کا حساب یومیہ پیداوار کی بنیاد پر (on the basis of daily products) کیا جاتا ہے۔

کیا اس طرح کا طریقہ کار مشارکہ اور مضاربہ کے ذرائع تمویل میں ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نیا مظہر ہونے کی وجہ سے اس سوال کا صریح جواب قدیم اسلامی کتابوں میں نہیں مل سکتا، تاہم

مشارکہ کے بنیادی تصور کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل طریق کار تجویز کیا جا سکتا ہے:

(۱) عمل کے لئے حقیقی نفع کی ایک خاص نسبت متعین کر لی جائے۔

(۲) نفع کا باقی ماندہ فیصدی حصہ سرمایہ لگانے والے کے لئے مختص ہوگا۔

(۳) اگر کوئی خسارہ ہو تو وہ صرف سرمایہ لگانے والوں کو اپنی سرمایہ کاری کے بالکل مطابق برداشت کرنا ہوگا۔

(۴) مشارکہ میں شامل کیے گئے اوسط توازن جس کا حساب یومیہ پیداوار کی بنیاد پر کیا جائے گا، کو تمویل کا شیئر کیپٹل تصور کیا جائے گا۔

(۵) مدت کے اختتام پر حاصل ہونے والے نفع کا حساب یومیہ پیداوار کی بنیاد پر کیا جائے گا اور اسی کے مطابق اسے تقسیم کیا جائے گا۔

اگر اس طرح کا معاملہ فریقین کے درمیان طے پا جاتا ہے تو یہ بظاہر مشارکہ کے کسی بنیادی قاعدے کے خلاف معلوم نہیں ہوتا، تاہم، یہ تجویز اسلامی فقہ کے ماہرین کے مزید غور و فکر اور تحقیق کی محتاج ہے۔ عملی طور پر بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ فریقین اس اصول پر متفق ہو گئے ہیں کہ اختتامِ مدت پر مشارکہ کو حاصل ہونے والا نفع، یومیہ استعمال ہونے والے سرمائے کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فی یوم ایک روپے پر حاصل ہونے والے نفع کی اوسط نکالی جائے گی۔ اس فی یوم فی روپیہ اوسط نفع کو ان دنوں کی تعداد کے ساتھ ضرب دی جائے گی جتنے دن ہر سرمایہ کار نے اپنی رقم کاروبار میں رکھی، جس سے اس کے نفع میں استحقاق کا فیصلہ یومیہ پیداوار کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

بعض معاصر علماء اس طریقے سے نفع کے حساب کی اجازت نہیں دیتے، اس بنیاد پر کہ یہ ایک تخمینی طریق کار ہے جو کسی شریک کو حاصل ہونے والے حقیقی نفع کی عکاسی نہیں کرتا، اس لئے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کاروبار کو ایک عرصے میں بڑا نفع حاصل ہوا ہو جبکہ کسی خاص سرمایہ کار کی کوئی رقم اس عرصے میں کاروبار میں لگی ہوئی ہی نہ ہو یا بہت تھوڑی اور نا قابلِ ذکر رقم لگی ہو، حالانکہ اس کے ساتھ معاملہ دوسرے ان سرمایہ کاروں کے برابر کیا جائے گا جنہوں نے اس عرصے میں بڑی رقم کاروبار میں لگائی ہوئی تھی، اس کے برعکس ایک عرصے میں کاروبار کو بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے جبکہ ایک خاص سرمایہ کار نے بڑی رقم کاروبار میں لگائی ہوئی تھی، حالانکہ یہ اپنے نقصان کا ایک حصہ ان دوسرے سرمایہ کاروں کی طرف منتقل کر رہا ہے جنہوں نے اس عرصے میں کوئی رقم نہیں لگائی ہوئی تھی، یا لگائی ہوئی تھی لیکن نا قابلِ ذکر مقدار میں۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ مشارکہ میں یہ ضروری نہیں کہ کسی شریک کو صرف اس کی اپنی رقم پر حاصل ہونے والا منافع ہی ملنا چاہئے، جب ایک مرتبہ مشارکہ وجود میں آ گیا تو مشترکہ حوض میں حاصل ہونے والا نفع تمام شرکاء کو ملے گا، قطع نظر اس سے کہ ان کی رقم مخصوص معاہدے میں استعمال ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ بات خاص طور پر فقہ حنفی پر صادق آتی ہے جس کے مطابق صحیح مشارکہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ رقم کی شکل میں لگایا ہوا شرکاء کا سرمایہ آپس میں ملا لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ''الف'' ''ب'' کے ساتھ ایک عقد مشارکہ میں داخل ہو، لیکن اس نے ابھی تک اپنی رقم مشترکہ حوض میں صرف نہیں کی، تب بھی یہ ان معاہدوں کے منافع میں اپنے حصے کا حق دار ہوگا جو کہ ''ب'' نے اپنی رقم سے مشارکہ کے لئے کیے ہیں،[1] اگر چہ منافع میں اس کا اپنے حصے کا استحقاق اس رقم کے دے دینے کے ساتھ مشروط ہوگا جو اس نے اپنے ذمے میں لی ہے، لیکن یہ حقیقت پھر بھی موجود ہے کہ اس خاص عقد کا نفع اس کی رقم سے حاصل نہیں ہوا، اس لئے کہ جو رقم یہ بعد میں کسی مرحلے پر دے گا وہ تو کسی اور معاملے میں استعمال ہوگی۔ فرض کیجئے کہ ''الف'' اور ''ب'' ایک لاکھ روپے کا کاروبار کرنے کے لئے ایک مشارکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں طے کر لیتے ہیں کہ ہر شخص پچاس ہزار روپیہ شامل کرے گا اور نفع برابر تقسیم ہوگا۔ ''الف'' نے ابھی تک اپنے پچاس ہزار روپے مشترکہ حوض میں شامل نہیں کیے۔ ''ب'' کو ایک نفع بخش معاملہ نظر آتا ہے اور وہ اپنی طرف سے لگائے گئے پچاس ہزار روپے سے مشارکہ کے لئے دو ایئر کنڈیشنر خرید لیتا ہے اور انہیں ساٹھ ہزار روپے میں بیچ دیتا ہے، جس سے دس ہزار روپے نفع حاصل ہوتا ہے۔ ''الف'' اپنے حصے کے پچاس ہزار روپے اس معاملے کے بعد شامل کرتا ہے۔ ان پچاس ہزار روپے کے دو ریفریجریٹر خریدے جاتے ہیں جو کہ اڑتالیس ہزار سے زائد پر نہیں بکتے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں دو ہزار کا خسارہ ہوا۔ اگر چہ ''الف'' کی رقم سے کیے جانے والے معاملے میں دو ہزار کا خسارہ ہوا ہے جبکہ ایئر کنڈیشنرز کے نفع بخش معاملے میں صرف ''ب'' کی رقم استعمال ہوئی ہے، جس میں ''الف'' کا کوئی حصہ نہیں تھا پھر بھی ''الف'' پہلے معاملے کے نفع میں اپنے حصے کا مستحق ہوگا۔ دوسرے معاملے میں جو دو ہزار روپے کا نقصان ہوا ہے وہ پہلے معاملے کے نفع سے منہا کر لیا جائے گا، جس سے مجموعی نفع کم ہو کر آٹھ ہزار تک آ جائے گا۔ یہ آٹھ ہزار کا نفع دونوں میں تقسیم ہوگا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ''الف'' کو چار ہزار روپے ملیں گے اگر چہ اس کی رقم سے کیے جانے والے معاملے میں خسارہ ہوا تھا۔

وجہ یہ ہے کہ جب فریقین مشارکہ کے عقد میں داخل ہو گئے تو اس کے بعد مشارکہ کے لئے جو

---

(۱) بدائع الصنائع، ج۶، ص۵۴، ۶۰۔

بھی عقد ہوں گے وہ اس مشترکہ حوض کی طرف ہی منسوب ہوں گے، قطع نظر اس سے کہ ان معاملوں میں کس کی انفرادی رقم استعمال ہوئی ہے۔ اس عقد مشارکہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ہر شریک ہر معاملے میں فریق ہوگا۔

مذکورہ بالا وضاحت پر ایک ممکنہ اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ مثال میں ''الف'' نے پچاس ہزار روپے کی ادائیگی اپنے ذمے لی ہے، اور معاملہ کرنے سے پہلے ہی معلوم ہے کہ وہ اتنی رقم مشارکہ میں شامل کرے گا، لیکن مجوزہ مشارکہ کا جاری اکائنٹ جس میں شریک روزانہ آتے اور جاتے رہتے ہیں، اس میں کسی بھی شریک نے کوئی متعین رقم شامل کرنا اپنے ذمے نہیں لیا ہوتا، لہٰذا مشارکہ میں داخل ہوتے وقت ہر فریق کی طرف سے لگایا جانے والا سرمایہ غیر معلوم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مشارکہ غیر صحیح ہو جانا چاہئے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قدیم فقہاء کے نقطہ ہائے نظر اس بارے میں مختلف ہیں کہ کیا مشارکہ کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کُل رأس المال کی مقدار شرکاء کو پہلے سے معلوم ہو۔ حنفی فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مشارکہ کے لئے یہ بات شرط نہیں ہے۔ مشہور حنفی فقیہ کاسانی لکھتے ہیں:

> "واما العلم بقدر رأس المال وقت العقد فليس بشرط لجواز الشركة بالأموال عندنا، وعند الشافعي شرط...... ولنا ان الجهالة لا تمنع جواز العقد لعينها، بل لافضالنها الى المنازعة، وجهالة رأس المال وقت العقد لا تفضى الى المنازعة، لأنه يعلم مقداره ظاهرا وغالبا، لأن الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء فيعلم مقدارها، فلا يؤدى الى جهالة مقدار الربح وقت القسمة."

> ''ہمارے نزدیک شرکۃ الاموال کے جواز کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ عقد کے وقت رأس المال کی مقدار معلوم ہو، اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شرط ہے، ...... ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذاتِ خود عقد کے جواز میں مانع نہیں ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ تنازعہ پیدا ہونے کا باعث بنتی ہے، اور عقد کے وقت رأس المال کا معلوم نہ ہونا تنازعہ کا باعث نہیں بنتا، اس لئے کہ یہ مقدار عموماً اس وقت معلوم ہو جاتی ہے جب مشارکہ کے لئے کوئی چیز خریدی جاتی ہے، لہٰذا تقسیم کے وقت نفع کی مقدار میں جہالت پیدا نہیں ہوگی۔ (۱)

---

(۱) بدائع الصنائع، ج۶، ص۶۳۔

یہ بات درست ہے کہ جاری مشارکہ کا تصور جس میں شرکاء کچھ رقم کسی وقت نکلوا لیں اور دوسرے وقت نئی رقم شامل کر دیں اور نفع یومیہ پیداوار کی بنیاد پر تقسیم ہو، یہ تصور اسلامی فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں پایا جاتا، لیکن یہ بات کسی طریقہ کار کو شرعاً ناجائز نہیں بناتی جب تک کہ یہ مشارکہ کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ مجوزہ طریق کار میں تمام شرکاء سے برابر سلوک کیا جاتا ہے، ہر شریک کے نفع کا حساب اس مدت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جس کے دوران اس کی رقم مشترکہ حوض میں رہی ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ مشترکہ تالاب کو مجموعی طور پر حاصل ہونے والا نفع اس رقم کے مشترکہ استعمال کی وجہ سے حاصل ہوا ہے جو کہ شرکاء نے مختلف اوقات میں شامل کی ہے۔ اگر تمام شرکاء باہمی رضامندی سے یہ طے کر لیتے ہیں کہ نفع یومیہ پیداوار کی بنیاد پر تقسیم ہوگا تو کوئی ایسا شرعی حکم موجود نہیں ہے جو اسے ناجائز قرار دے۔ بلکہ اس کے برعکس اسے حضور اقدس ﷺ کی اس عمومی ہدایت کی تائید حاصل ہے جو پہلے کئی مرتبہ ذکر کی گئی معروف حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

"المسلمون علی شروطھم الا شرطا حرم حلالا او احل حراما."

مسلمان آپس میں طے شدہ معاہدوں کے پابند ہیں، جب تک کہ یہ معاہدے حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہ قرار دیں۔

اگر یومیہ پیداوار کی بنیاد پر تقسیم کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کوئی شریک مشترکہ حوض سے نہ رقم نکلوا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں نئی رقم شامل کر سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اس وقت تک نئی سرمایہ کاری کرنے کے قابل بھی نہیں ہوگا جب تک کہ نئی مدت کی متعین تاریخ نہ آ جائے۔ بینکوں کی کھاتہ داروں کی جہت سے (Deposits Side) جہاں کھاتہ دار روزانہ کئی مرتبہ رقم جمع کرواتے اور نکلواتے ہیں، یہ طریق کار بالکل ناقابل عمل ہے۔ یومیہ پیداوار کے تصور کو رد کر دینے کی وجہ سے یہ کھاتہ دار اس بات پر مجبور ہوں گے کہ اپنی بچی ہوئی رقم کو کسی نفع بخش اکاؤنٹ میں جمع کرانے سے پہلے کئی ماہ انتظار کریں۔ اس سے صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے بچتوں کے استعمال میں رکاٹ پیدا ہوگی اور طویل عرصے کے لئے تمویلی سرگرمیوں کا پہیہ جام ہو جائے گا۔ اس مشکل کا یومیہ پیداوار کے طریق کار پر عمل کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔ چونکہ شریعت کا کوئی حکم اس کے خلاف نہیں ہے اس لئے اس طریق کار کو نہ اپنانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مشارکہ فائنانسنگ پر چند اعتراضات

اب ہمیں ان اعتراضات کا جائزہ لینا چاہئے جو مشارکہ کو بطور طریقۂ تمویل اختیار کرنے کے

خلاف عملی نقطۂ نظر سے اُٹھائے جاتے ہیں۔

ا۔ خسارے کا رسک

ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ مشارکہ کے طریقۂ کار کو اختیار کرنے کی صورت میں تمویل کرنے والے بینک یا ادارے کی طرف کاروبار کے خسارے کے منتقل ہونے کے زیادہ امکانات ہیں، پھر خسارہ عام کھاتہ داروں کی طرف بھی منتقل ہوگا۔ کھاتہ داروں کو چونکہ مستقل طور پر خسارے کے خطرے میں ڈالا جارہا ہوگا اس لئے وہ بینکوں اور مالیاتی اداروں میں اپنی رقم رکھوانا نہیں چاہیں گے، جس کی وجہ سے یہ بچتیں یا تو جامد رہیں گی یا بینکنگ چینل کے باہر معاہدوں میں استعمال ہوں گی، اس طرح سے قومی سطح پر معاشی ترقی میں ان کا حصہ نہیں ہوگا، لیکن یہ دلیل غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مشارکہ کی بنیاد پر تمویل کرنے سے پہلے بینک اور مالیاتی ادارے اس مجوزہ کاروبار کے امکانات (Feasibility) کا جائزہ لیں گے جس کے لئے فنڈز درکار ہیں، حتیٰ کہ موجودہ سودی بینکاری نظام میں بھی بینک ہر درخواست دینے والے کو قرضہ جاری نہیں کردیتے، بلکہ یہ کاروبار کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور اگر انہیں یہ خدشہ ہو کہ یہ کاوبار نفع بخش نہیں ہے تو یہ قرض جاری کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ مشارکہ کی صورت میں بینک اور مالیاتی ادارے یہ جائزہ زیادہ گہرائی اور احتیاط کے ساتھ لیں گے۔

مزید براں یہ کہ کوئی بینک یا مالیاتی ادارہ خود کو ایک ہی مشارکہ تک محدود نہیں رکھ سکتا، بلکہ ان کے متنوع مشارکہ ہوں گے۔ اگر ایک بینک نے اپنے گاہکوں (Clients) میں سے سو گاہکوں کے ساتھ مشارکہ کی بنیاد پر تمویل کی ہے اور یہ تمویل بھی اس نے ان میں سے ہر ایک کی کاروباری تجاویز کے امکانات کا جائزہ لے کر کی ہے تو یہ تصور کرنا بہت مشکل ہوگا کہ یہ سب کے سب یا ان کی اکثریت خسارے میں جائے گی۔ ضروری اقدامات اور پوری احتیاط اختیار کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض میں نقصان ہو جائے گا، لیکن دوسری طرف نفع بخش مشارکہ جات میں سودی قرضوں سے زیادہ نفع کی اُمید ہے، اس لئے کہ حقیقی نفع بینک اور عمیل (Client) میں تقسیم ہوگا، اس لئے مشارکہ کا پورا شعبہ خسارے میں جائے اس کی توقع نہیں ہے، اور مجموعی خسارے کا امکان صرف نظریاتی امکان ہے جو کہ کھاتہ داروں کی حوصلہ شکنی نہیں کرے گا۔ کسی مالیاتی ادارے کو خسارے کا یہ نظریاتی امکان کسی جوائنٹ سٹاک کمپنی میں خسارے کے امکان سے بہت کم ہے جس کا کاروبار ایک محدود شعبے میں منحصر ہوتا ہے، اس کے باوجود لوگ اس کے حصے خریدتے ہیں اور خسارے کا یہ امکان انہیں ان شیئرز میں سرمایہ کاری سے باز نہیں رکھتا۔ بینک اور تمویلی اداروں کی صورتِ حال اس سے

کافی مضبوط ہے، اس لئے کہ ان کی مشارکہ کی سرگرمیاں اتنی متنوع ہوں گی کہ ہر ایک مشارکہ میں ہونے والے ممکنہ نقصان کی تلافی دوسرے مشارکہ جات سے حاصل ہونے والے منافع سے ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ ایک اسلامی معیشت کو ایسی ذہنیت پیدا کرنی چاہئے جس کے مطابق یہ یقین کیا جائے کہ رقم پر حاصل کیا جانے والا کوئی بھی نفع کاروبار کا رسک قبول کرنے کا صلہ ہے۔ مہارتوں یا مجموعی شعبے میں تنوع پیدا کر کے یہ رسک اتنا کم بھی کیا جا سکتا ہے کہ بالکل فرضی یا نظریاتی بن کر رہ جائے، لیکن اس رسک کو بالکلیہ زائل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جو شخص منافع حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اتنا معمولی رسک ضرور قبول کرنا ہوگا۔ باوجود اس کے کہ عام جوائنٹ سٹاک کمپنیوں میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے کسی نے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ شیئر ہولڈرز کی رقم نقصان میں ڈال دی گئی ہے۔ مسئلہ اس نظام کا پیدا کردہ ہے جو بینکنگ اور تمویل کی سرگرمیوں کو عام تجارتی سرگرمیوں سے الگ کرتا ہے اور جس نظام نے لوگوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ بینک اور تمویلی ادارے صرف زر اور کاغذاتِ زر کا کاروبار کر سکتے ہیں اور یہ کہ ان کا صنعت و تجارت پر مرتب ہونے والے عملی نتائج کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں، اس لئے یہ ہر حالت میں متعین منافع کے استحقاق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تمویلی شعبے اور صنعت و تجارت کے شعبوں میں اس علیحدگی نے کلی سطح (Macro-Level) پر معیشت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اسلامی بینکاری کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ ہر ہر معاملے میں روایتی نظام کی پیروی کرے گی۔ اسلام کے اپنے اقدار اور اصول ہیں جو تمویل کی صنعت و تجارت سے علیحدگی پر یقین نہیں رکھتے۔ جب یہ اسلامی نظام سمجھ میں آ جائے گا تو لوگ نقصان کے نظریاتی خطرے کے باوجود تمویلی شعبے (Financing Sector) میں اس سے زیادہ آمادگی کے ساتھ سرمایہ کاری کریں گے جتنی وہ نفع بخش کمپنیوں میں کرتے ہیں۔

۲۔ بددیانتی

مشارکہ فائنانسنگ کے خلاف ایک اور خدشہ جو ظاہر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بددیانت کلائنٹس مشارکہ کے اس ذریعے کو ناجائز استعمال کریں گے اور تمویل کار کو کوئی نفع نہیں لوٹائیں گے۔ وہ ہمیشہ یہی دکھائیں گے کہ کاروبار کو کوئی نفع ہی نہیں ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ کاروبار کو نقصان ہوا ہے، جس سے صرف نفع ہی نہیں اصل رقم بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

یقیناً واقعی یہ ایک خطرہ ہے، خاص طور پر ان معاشروں میں جہاں بدعنوانی روزمرہ کا معمول بن چکی ہے، لیکن، بہرحال اس مسئلے کا حل اتنا مشکل بھی نہیں ہے جتنا عموماً باور کیا جاتا ہے یا بڑھا چڑھا

کر پیش کیا جاتا ہے۔

اگر کسی ملک کے تمام بینک، مرکزی بینک اور حکومت کی پوری مدد کے ساتھ اسلامی طریقۂ کار کے مطابق چلائے جائیں تو بددیانتی کے مسئلہ پر قابو پانا مشکل نہیں ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بہتر طریقے سے ڈیزائن کیا ہوا آڈٹ کا نظام رائج کرنا ہوگا، جس کے مطابق کلائنٹس کے حسابات رکھے جائیں گے اور انہیں اچھی طرح کنٹرول کیا جائے گا۔ اس پر بھی پہلے بحث ہو چکی ہے کہ منافع کا تعین صرف اجمالی نفع کی بنیاد پر کیا جائے، اس سے تنازعات اور خورد برد کے امکانات کم ہو جائیں گے، پھر بھی اگر عمیل کی طرف سے کوئی بددیانتی، بے ضابطگی یا لاپرواہی پائی گئی تو اسے تادیبی کاروائی کا سامنا کرنا ہوگا، اور اسے ملک کے کسی بھی بینک سے کوئی سہولت حاصل کرنے سے کم از کم ایک مخصوص مدت کے لئے محروم بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقدامات حقیقی نفع چھپانے یا کسی اور بددیانتی کے ارتکاب کے خلاف مضبوط رکاوٹ ثابت ہوں گے، مزید برآں بینکوں کے کلائنٹس مستقل طور پر خسارہ دکھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ یہ مختلف حوالوں سے خود ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگا۔ یہ درست ہے کہ مذکورہ بالا احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود ایسی صورتِ احوال کے امکانات موجود ہیں جن میں بعض کلائنٹس اپنے بُرے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں، لیکن سزا کے اقدامات اور کاروبار کا عمومی ماحول ایسے مواقع کو کم کر دیں گے (خود سودی معیشت میں بھی نادہندگان ناقابلِ وصول قرضوں (Bad Debts)[1] کی مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں)۔ یہ بات مشارکہ کے پورے نظام کو مسترد کرنے کا معقول سبب یا اس کا عذر نہیں بن سکتی۔

بلاشبہ بددیانتی کا یہ خدشہ ان بینکوں اور مالیاتی اداروں کے لئے بہت زیادہ ہے جو روایتی بینکوں کے عمومی دھارے سے الگ ہو کر کام کر رہے ہیں، انہیں متعلقہ حکومتوں اور مرکزی بینکوں کا خاص تعاون حاصل نہیں ہوتا، یہ نہ تو نظام تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ اپنے قوانین اور قواعد وضوابط لاگو کر سکتے ہیں، لیکن انہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ وہ محض کاروباری ادارے ہی نہیں ہیں، یہ بینکنگ کے ایسے نظام کو متعارف کرانے کے لئے قائم کیے گئے ہیں جس کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظام کو آگے بڑھائیں اگرچہ اس کی وجہ سے کسی حد تک ان کے منافع کا حجم کم ہونے کا خدشہ ہو، اس لئے انہیں کم از کم چند منتخب بنیادوں پر ہی سہی مشارکہ کا استعمال شروع کرنا

---

(۱) bad deebts کسی شخص یا کاروبار کے ذمے ایسا قرض جس کی وصولی ناممکن ہو یا وصولی کی لاگت قرض کی مالیت سے زیادہ ہو، حسابات کی تیاری میں ایسے قرضوں کو خسارہ تصور کیا جاتا ہے۔ (مترجم)
(The Penguin Dictionary of Commerce)

چاہئے۔ ہر بینک کے کچھ ایسے کلائنٹس ضرور ہوتے ہیں جن کی ایمان داری شک و شبہ سے بالا ہوتی ہے۔ اسلامی بینکوں کو چاہئے کہ کم از کم ان کے ساتھ تمویل صحیح مشارکہ کی بنیاد پر کریں۔ اس سے مارکیٹ میں اچھی نظیر قائم کرنے میں مدد ملے گی اور دوسرے اس کی پیروی پر آمادہ ہوں گے۔ مزید برآں کچھ ایسے سیکٹرز بھی ہیں جن میں مشارکہ کی بنیاد پر تمویل بڑی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر برآمد کی تمویل میں مشارکہ کو استعمال کیا جائے تو بددیانتی کا خاص امکان نہیں ہے۔ برآمد کنندہ کے پاس باہر سے ایک متعین آرڈر موجود ہے، قیمتیں طے شدہ ہیں، لاگت کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے، ادائیگی عموماً ایل سی کی وجہ سے محفوظ ہوتی ہے، ادائیگی خود بینک کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ مشارکہ کے طریقے کو اختیار نہ کیا جائے۔ اسی طرح درآمد کی تمویل بھی مشارکہ کی بنیاد پر چند احتیاطوں کے بعد ہوسکتی ہے، جیسا کہ اسی باب میں پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

۳۔ کاروبار کی رازداری

مشارکہ پر ایک اور تنقید یہ کی جاتی ہے کہ تمویل کار (Financier) کو عمیل کے کاروبار میں شریک بنانے سے کاروبار کے راز اس (تمویل کار) کے پاس اور اس کے ذریعے سے دوسرے تاجروں کے پاس چلے جائیں گے۔

لیکن اس کا حل بہت آسان ہے۔ مشارکہ میں داخل ہوتے وقت عمیل (Client) یہ شرط لگا سکتا ہے کہ تمویل کار (Financier) انتظام و انصرام (Management) کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا، اور وہ کاروبار کے متعلق کسی قسم کی معلومات کسی شخص کو عمیل کی اجازت کے بغیر منتقل نہیں کرے گا۔ رازداری کو برقرار رکھنے کے اس طرح کے معاہدے کا باوقار ادارے احترام کرتے ہیں، خاص طور پر بینک اور مالیاتی ادارے جن کا سارا کاروبار ہی رازداری پر مبنی ہوتا ہے۔

۴۔ کلائنٹس کا نفع میں شرکت پر آمادہ نہ ہونا

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ کلائنٹس بینکوں کے ساتھ حقیقی نفع میں شریک نہیں ہونا چاہتے، یہ ناپسندیدگی دو وجوہ پر مبنی ہے:

(۱) یہ سمجھتے ہیں کہ بینک حقیقی نفع، جو کہ بہت زیادہ بھی ہوسکتا ہے، میں شریک ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے، اس لئے کہ کاروبار کی مینجمنٹ اور اس کو چلانے سے انہیں سروکار نہیں ہوتا، تو یہ (کلائنٹس) اپنی محنت کے ثمرات میں بینکوں کو کیوں شامل کریں گے جو کہ صرف فنڈز فراہم کرتے ہیں۔ کلائنٹس یہ

دلیل بھی دیتے ہیں کہ روایتی بینک سود کی معمولی شرح پر راضی ہو جاتے ہیں تو اسلامی بینکوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

(۲) اگر مذکورہ بات ایک عنصر نہ بھی ہو تب بھی کلائنٹس اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ ان کے حقیقی منافع کا بینکوں کو علم ہو جائے گا اور ان کے ذریعے سے یہ معلومات ٹیکسوں کے بااختیار لوگوں تک پہنچ جائیں گی اور کلائنٹس کی ٹیکس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔

پہلی بات کا حل اگرچہ آسان نہیں ہے، لیکن اتنا مشکل اور ناممکن بھی نہیں ہے۔ ایسے کلائنٹس کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ بڑی مجبوری کے بغیر سودی قرضہ لینا، بہت بڑا گناہ ہے۔ محض کاروبار کو وسعت دینا کسی بھی اعتبار سے شدید ضرورت میں داخل نہیں ہے۔ مشارکہ کے ذریعے سے اپنے کاروبار کے لئے جائز فنڈ کی فراہمی کا انتظام کر کے وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں گے بلکہ اپنے لئے اور اسلامی بینک کے لئے نفع کو بھی حلال بنائیں گے۔

دوسرے عنصر کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ بعض مسلم ممالک میں ٹیکس کی شرح ناجائز اور غیر منصفانہ ہے۔ اسلامی بینکوں اور ان کے تمام کلائنٹس کو چاہئے کہ وہ حکومتوں کو قائل کرنے کی کوشش کریں اور ان قوانین کو تبدیل کرانے کے لئے محنت کریں جو کہ اسلامی بینکاری کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ حکومتوں کو بھی یہ حقیقت سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اگر ٹیکسوں کی شرح معقول ہو اور ٹیکس ادا کرنے والوں کو قائل کیا جائے کہ دیانت داری سے ٹیکس ادا کرنے میں ان کا بھی فائدہ ہے تو سرکاری آمدنی میں کمی نہیں اضافہ ہوگا۔

شرکت متناقصہ

(DIMINISHING MUSHARAKAH)

مشارکہ کی ایک اور شکل جسے ماضی قریب میں ترقی دی گئی ہے ''مشارکہ متناقصہ''[1] ہے۔ اس تصور کے مطابق ایک تمویل کار اور اس کا عمیل کسی جائیداد، سامان یا کاروباری ادارے کی مشترکہ ملکیت حاصل کرتے ہیں۔ تمویل کار کا حصہ کئی یونٹس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عمیل، تمویل کار کے حصے کے یونٹس ایک ایک کر کے کچھ وقفوں کے بعد خرید لے گا، جس کے نتیجے میں اس کا حصہ کم ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ اس کے تمام یونٹس عمیل خرید لے گا اور جائیداد یا کاروباری ادارے کا تنہا مالک بن جائے گا۔

---

(۱) یعنی مسلسل کم ہونے والی شرکت۔

شرکت متناقصہ کے اس تصور کو مختلف معاملوں میں مختلف طریقوں سے اختیار کیا جاتا ہے۔ چند نمونے ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسے عام طور پر ہاؤس فائنانسنگ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمیل ایک گھر خریدنا چاہتا ہے، جس کے لئے اس کے پاس کافی رقم موجود نہیں ہے۔ یہ ایک تمویل کار کے پاس جاتا ہے جو کہ مطلوب گھر کی خریداری میں اس کے ساتھ شریک ہونے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قیمت کا بیس فیصد عمیل ادا کرتا ہے اور اسّی فیصد تمویل کار، لہٰذا گھر کے اسّی فیصد حصے کا مالک تمویل کار ہے اور بیس فیصد کا عمیل ۔ جائیداد مشترکہ طور پر خریدنے کے بعد عمیل گھر کو اپنی رہائشی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتا ہے اور تمویل کار کو جائیداد میں اس کا حصہ استعمال کرنے کی وجہ سے کرایہ ادا کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تمویل کار کے حصے کو آٹھ برابر یونٹس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے۔ ہر یونٹ گھر کی دس فیصد ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے (کیونکہ اس کی کُل ملکیت اسّی فیصد تھی) عمیل ،تمویل کار سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہر تین ماہ کے بعد ایک یونٹ خریدے گا، چنانچہ تین ماہ کی پہلی مدت پوری ہونے پر وہ گھر کی قیمت کا دس فیصد حصہ ادا کر کے ایک یونٹ خرید لیتا ہے۔ اس سے تمویل کار کا حصہ اسّی فیصد سے کم ہو کر ستر فیصد ہو جائے گا۔ تمویل کار کو ادا کیا جانے والا کرایہ بھی اس حد تک کم ہو جائے گا۔ دوسری مدت کے پورا ہونے پر وہ ایک اور یونٹ خرید لے گا، جس سے جائیداد میں اس کا حصہ بڑھ کر چالیس فیصد ہو جائے گا اور تمویل کار کا کم ہو کر ساٹھ فیصد رہ جائے گا اور اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہو جائے گا۔ یہ ترتیب اسی طریقے سے چلتی رہے گی یہاں تک کہ دو سال کے اختتام پر عمیل تمویل کار کا سارا حصہ خرید لے گا جس سے اس کا حصہ 'صفر' رہ جائے گا اور عمیل کا حصہ سو فیصد ہو جائے گا۔

یہ طریق کار تمویل کار کو یہ اجازت دیتا ہے کہ جائیداد میں اپنی ملکیت کے تناسب سے کرایہ کا دعویٰ کرے اور اسی کے ساتھ اپنے حصے کے یونٹس کی بیع کے ذریعے سے اپنا اصل سرمایہ وقفے وقفے سے واپس حاصل کرے۔

۲۔ ''الف'' مسافروں کو ٹرانسپورٹ کی خدمات مہیا کرنے کے لئے ایک ٹیکسی خریدنا چاہتا ہے تا کہ لوگوں سے لیے جانے والے کرایوں سے آمدنی حاصل کرے، لیکن اس کے پاس فنڈز کی کمی ہے۔ ''ب'' ٹیکسی کی خریداری میں شرکت کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں مشترکہ طور پر ایک ٹیکسی خریدتے ہیں۔ %80 قیمت ''ب'' ادا کرتا ہے اور %20 ''الف''۔ یہ ٹیکسی لوگوں کو سفری خدمات مہیا کرنے کے لئے لگا دی جاتی ہے جس سے یومیہ =/1000 روپے آمدن ہوتی ہے۔ چونکہ ''ب'' کا ٹیکسی میں %80 حصہ ہے اس لئے اس پر اتفاق کرلیا گیا کہ کرایہ کا %80 حصہ ''ب'' کو ملے گا اور

20% ''الف'' کو جس کا گاڑی میں حصہ بھی 20% ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ =/800 روپے یومیہ ''ب'' اور =/200 ''الف'' کو حاصل ہوں گے۔ تین ماہ بعد ''الف'' ''ب'' کے حصے میں سے ایک یونٹ خرید لیتا ہے، جس سے ''ب'' کا حصہ کم ہو کر 70% رہ گیا اور ''الف'' کا بڑھ کر 30% ہو گیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس تاریخ سے ''الف'' یومیہ آمدن میں سے =/300 روپے کا مستحق ہے اور ''ب'' =/700 روپے کا۔ یہ طریقِ کار جاری رہے گا، یہاں تک کہ دو سال کے اختتام پر ٹیکسی مکمل طور پر ''الف'' کی ملکیت میں ہوگی، اور ''ب'' اپنی اصل سرمایہ کاری کی رقم بھی واپس لے چکا ہوگا اور مذکورہ طریقے کے مطابق آمدن میں اپنا حصہ بھی۔

۳۔ ''الف'' ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس اس کاروبار کے لئے مطلوبہ رقم کی کمی ہے۔ ''ب'' ایک متعینہ مدت، جو ہم دو سال فرض کر لیتے ہیں، کے لئے اس کے ساتھ شریک ہونے پر راضی ہو جاتا ہے۔ چالیس فیصد سرمایہ کاری ''الف'' کرتا ہے اور ساٹھ فیصد ''ب'' کرتا ہے۔ دونوں مشارکہ کی بنیاد پر کاروبار کا آغاز کر دیتے ہیں۔ دونوں کے نفع کی متعین نسبت صراحتاً طے کر لی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ کاروبار میں ''ب'' کے حصے کے چھ برابر یونٹس بنا لیے جاتے ہیں، اور ''الف'' انہیں تدریجاً خریدنا شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ دو سال کے اختتام پر ''ب'' کاروبار سے باہر ہو جاتا ہے، اور ''الف'' اس کا تنہا مالک بن جاتا ہے۔ ''ب'' کو مختلف مدتوں میں ملنے والے نفع کے علاوہ وہ اپنے یونٹس کی قیمت بھی حاصل کرے گا جو کہ عملی طور پر اس کے اصل سرمایہ کی واپسی کے مترادف ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو یہ طریقِ کار مختلف معاملوں کا مجموعہ ہے جو کہ مختلف مراحل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لئے شرکت متناقصہ کی ابھی ذکر کردہ تینوں صورتوں پر اسلامی اصولوں کی روشنی میں بحث کی جاتی ہے۔

شرکت متناقصہ کی بنیاد پر ہاؤس فائنانسنگ

مجوزہ طریقِ کار درج ذیل معاملوں پر مشتمل ہے:

۱۔ جائیداد میں مشترکہ ملکیت پیدا کرنا (شرکۃ المِلک)۔

۲۔ تمویل کار کا حصہ عمیل کو کرایہ پر دینا۔

۳۔ کلائنٹ (عمیل) کی طرف سے تمویل کار سے یہ وعدہ کہ وہ اس کے حصے کو خرید لے گا۔

۴۔ مختلف مراحل پر اس کے یونٹس کی عملاً خریداری۔

۵۔ تمویل کار کے جائیداد میں باقی ماندہ حصے کے حوالے سے کرایہ کا تعین۔

اب ہم اس طریقِ کار کے اجزاء پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

(۱) مذکورہ طریقِ کار میں پہلا مرحلہ جائیداد میں مشترکہ ملکیت پیدا کرنا ہے۔ یہ بات اس باب کے شروع میں بیان کی جا چکی ہے کہ شرکۃ الملک مختلف طریقوں سے وجود میں آ سکتی ہے، جن میں فریقین کی طرف سے مشترکہ خریداری بھی شامل ہے۔ اس بات کو تمام فقہاء نے متفقہ طور پر جائز قرار دیا ہے،(۱) اس لئے اس طرح مشترکہ ملکیت پیدا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

(۲) اس طریقِ کار کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ تمویل کار اپنا حصہ عمیل کو اجارہ (Lease) پر دیتا ہے اور اس پر اس سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ یہ طریقِ کار بھی بالکل درست ہے، اس لئے کہ فقہاء کا اس بارے میں اختلاف نہیں ہے کہ کسی شخص کا کسی جائیداد میں اپنا مشاع حصہ (غیر منقسم حصہ) اپنے ہی شریک کو کرایہ پر دینا جائز ہے۔ اگر غیر منقسم حصہ کسی تیسرے فریق کو اجارہ پر دیا جاتا ہے تو اس کے جواز کے بارے میں فقہاء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام زفرؒ کے نزدیک غیر منقسم حصہ تیسرے فریق کو اجارہ پر نہیں دیا جا سکتا، جبکہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن الحسنؒ فرماتے ہیں کہ غیر منقسم حصہ بھی کسی شخص کو کرایے پر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس صورت کا تعلق ہے کہ جائیداد اپنے ہی شریک کو کرایے پر دی جائے تو اس اجارے کے جواز پر تمام فقہاء متفق ہیں۔(۲)

(۳) مذکورہ بالا طریقے کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ عمیل، تمویل کار کے غیر منقسم حصے کے مختلف یونٹس خریدتا ہے۔ یہ معاملہ بھی شرعاً جائز ہے۔ اگر غیر منقسم (مشاع) حصہ زمین اور عمارت دونوں سے تعلق رکھتا ہے تو دونوں کی بیع تمام فقہی مکاتبِ فکر کے نزدیک جائز ہے، اسی طرح اگر عمارت کا غیر منقسم حصہ خود شریک کو بیچنے کا ارادہ ہو تو یہ بھی باتفاقِ فقہاء جائز ہے، البتہ اگر اسے تیسری پارٹی کے ہاتھ فروخت کیا تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔(۳)

ابھی ذکر کیے گئے تین نکات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مذکورہ بالا تینوں معاملے بذاتِ خود جائز ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہیں ایک ہی انتظام میں جمع کرنا جائز ہے۔ جواب یہ ہے کہ اگر تینوں معاملوں کو اس انداز سے جمع کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر معاملہ دوسرے کے لئے شرط بن جائے تو شرعاً یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام کے قانونی نظام میں یہ طے شدہ اصول ہے کہ ایک

(۱) مثلاً دیکھئے: ردالمحتار، ج ۳، ص ۳۶۴، ۳۶۵۔

(۲) ابن قدامہ: المغنی، ج ۶، ص ۱۳۷۔ ردالمحتار، ج ۶، ص ۴۷، ۴۸۔

(۳) ردالمحتار، ج ۳، ص ۳۶۵۔

معاملے کو دوسرے کے لئے پیشگی شرط نہیں بنایا جا سکتا، لیکن مجوزہ سکیم میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دو معاملوں کو ایک دوسرے کے لئے شرط بنانے کی بجائے صرف عمیل کی طرف سے یک طرفہ وعدہ ہونا چاہئے۔ ایک تو اس بات کا کہ وہ تمویل کار کا حصہ اجارہ (Lease) پر لے کر کرایہ ادا کرے گا، دوسرے اس بات کا کہ وہ گھر میں تمویل کار کے حصے کے مختلف یونٹس مختلف مراحل پر خرید لے گا۔ اس سے ہم چوتھے مسئلے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، اور وہ ہے اس طرح کے وعدے کے قانوناً لازم ہونے کا مسئلہ۔

(۴) عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی کام کا وعدہ کر لینے سے وعدہ کرنے والے پر صرف اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس پر عدالت کے ذریعے عمل درآمد نہیں کرایا جا سکتا، لیکن متعدد فقہاء ایسے بھی ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وعدے قضاءً بھی لازم ہوتے ہیں اور عدالت وعدہ کرنے والے کو ایفائے عہد پر مجبور کر سکتی ہے، خاص طور پر کاروباری سرگرمیوں میں۔[1] چند مالکی اور حنفی فقہاء کا خاص طور پر اس ضمن میں حوالہ دیا جا سکتا ہے جو کہتے ہیں کہ ضرورت کے موقعوں پر، وعدوں پر عدالت کے ذریعے بھی عمل کرایا جا سکتا ہے۔ حنفی فقہاء نے اس نقطۂ نظر کو ایک خاص بیع کے تعلق سے اختیار کیا ہے جسے ''بیع بالوفاء'' کہا جاتا ہے۔ ''بیع بالوفاء'' کسی گھر کی بیع کا ایک خاص طریقہ ہے جس میں خریدار بیچنے والے سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب یہ بائع خریدار کو گھر کی قیمت واپس کر دے گا تو وہ گھر اسے دوبارہ بیچ دے گا۔ یہ طریق کار وسطی ایشیاء کے ملکوں میں مروج تھا، اور حنفی فقہاء کا اس کے بارے میں نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر گھر کی دوبارہ بیع کو پہلی بیع کے لئے شرط بنایا گیا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، لیکن اگر بیع بغیر شرط کے مؤثر ہے اور بیع کے مؤثر ہو جانے کے بعد خریدار یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب بائع اسے یہی رقم پیش کرے گا تو وہ گھر اسے دوبارہ بیچ دے گا تو یہ وعدہ قابلِ قبول ہے اور اس کی وجہ سے وعدہ کرنے والے پر صرف اخلاقی ذمہ داری ہی عائد نہیں ہوگی بلکہ اس کے ذریعے سے اصل بائع کو ایک قانونی طور پر قابلِ نفاذ حق حاصل ہو جائے گا۔

فقہاء نے اس طریقِ کار کو جائز قرار دیتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ

"قد تجعل المواعيد لازمة لحاجة الناس."

''ضرورت کے وقت وعدوں کو عدالتی طور پر بھی لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔''

حتیٰ کہ اگر وعدہ بیع کے مؤثر اور نافذ ہونے سے پہلے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد بیع بغیر شرط کے منعقد ہوتی ہے تو ان فقہاء کے نزدیک ایسا کرنا بھی جائز ہوگا۔[2]

(۱) اس مسئلہ کی مزید تفصیل ''مرابحہ'' کے باب میں آئے گی۔ (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

کوئی شخص یہ اعتراض اُٹھا سکتا ہے کہ اگر وعدہ عملاً بیع میں داخل ہونے سے پہلے کیا گیا ہے تو عملاً یہ خود بیع میں شرط لگانے کی طرح ہے، اس لئے کہ فریقین کے بیع میں داخل ہونے کے وقت یہ شرط انہیں معلوم ہے، اس لئے اگر چہ بیع کسی صریح شرط کے بغیر ہے تب بھی اسے مشروط ہی سمجھنا چاہئے، اس لئے کہ ایک صریح شرط کا وعدہ اس سے پہلے ہو چکا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ بیع کے اندر شرط لگانے اور بیع کو مشروط کیے بغیر وعدہ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اگر بیع کے وقت صراحتاً شرط ذکر کی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بیع اسی صورت میں نافذ اور صحیح ہوگی جبکہ وعدہ پورا کیا جائے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر مستقبل میں وعدہ پورا نہ کیا گیا تو یہ بیع باطل تصور ہوگی، اس سے بیع کا عقد مستقبل کے کسی واقعہ پر موقوف ہو جاتا ہے جو واقع ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی، اس سے عقد میں غیر یقینی صورتِ حال (غرر) پیدا ہو جاتی ہے جو کہ شریعت میں بالکل ناجائز ہے۔

اس کے برعکس اگر بیع کسی شرط کے بغیر ہوئی ہے، لیکن کسی پارٹی نے علیحدہ طور پر کوئی وعدہ کر لیا ہے تو یہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ بیع وعدہ کے ایفاء پر موقوف یا اس کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ بیع بہر حال مؤثر ہوگی خواہ وعدہ کرنے والا اپنا وعدہ پورا کرے یا نہ کرے، حتیٰ کہ اگر وعدہ کرنے والا اپنے وعدہ سے انحراف کرتا ہے تب بھی بیع مؤثر رہے گی۔ جس سے وعدہ کیا گیا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ وعدہ کرنے والے کو عدالت کے ذریعے اپنا وعدہ پورا کرنے پر مجبور کرے، اور اگر وعدہ کرنے والا اپنا وعدہ پورا کرنے کے قابل نہیں ہے تو جس سے وعدہ کیا گیا تھا وہ اس حقیقی نقصان کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اسے عدم ایفاء کی وجہ سے اُٹھانا پڑا ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خریدنے کا مستقل اور الگ وعدہ اصل عقد کو اس کے ساتھ مشروط یا اس پر موقوف نہیں بناتا، اس لئے اسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

اس تجزیے کی بنیاد پر ''شرکت متناقصہ'' کو ہاؤس فائنانسنگ کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(الف) مشترکہ خریداری 'اجارہ' اور تمویل کار کے حصے کے یونٹس کی بیع ان معاملوں کو ایک ہی عقد میں آپس میں ملانا نہیں چاہئے، تاہم مشترکہ خریداری اور عقد اجارہ کو ایک ہی دستاویز میں جمع کیا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے تمویل کار اس بات پر اتفاق کرے گا کہ وہ مشترکہ خریداری کے بعد اپنا حصہ عمیل کو کرایہ پر دے دے گا۔ ایسا کرنا اس لئے جائز ہے کہ جیسا کہ متعلقہ باب میں بیان کیا گیا ہے کہ اجارہ

حاشیہ صفحہ گزشتہ: دیکھئے: جامع الفصولین، ج ۲، ص ۲۳۷، اور رد المحتار، ج [illegible]

کسی آئندہ آنے والی تاریخ سے بھی مؤثر ہوسکتا ہے، اسی کے ساتھ عمیل ایک یک طرفہ وعدے پر دستخط کرسکتا ہے جس کے مطابق وہ تمویل کار کے حصے کے مختلف یونٹس متعین وقفوں کے بعد خرید لے گا، اور تمویل کار یہ بات قبول کرسکتا ہے کہ جب عمیل اس کے حصے کا ایک یونٹ خرید لے گا تو اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہوجائے گا۔

(ب) ہر یونٹ کی خریداری کے وقت، باقاعدہ ایجاب وقبول کے ذریعے اسی متعین تاریخ کو بیع کا انعقاد ہونا چاہئے۔

(ج) یہ زیادہ بہتر ہے کہ عمیل کی طرف سے مختلف یونٹس کی خریداری اس بازاری قیمت کے مطابق ہو جو کہ اس یونٹ کی خریداری کے وقت بازار میں رائج ہو، لیکن یہ بھی جائز ہے کہ خریداری کے اس وعدے میں جس پر عمیل نے دستخط کیے ہیں ایک قیمت بھی طے کرلی جائے۔

خدمات (Services) کے کاروبار کے لئے شرکت متناقصہ

اُوپر ذکر کردہ شرکت متناقصہ کی دوسری مثال ایک ٹیکسی کی مشترکہ خریداری کی تھی، تاکہ اسے کرایہ پر لگا کر آمدنی حاصل کی جائے۔ یہ طریق کار مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) شرکۃ الملک کی شکل میں ٹیکسی کے اندر ایک مشترکہ ملکیت پیدا کرنا، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا یہ شرعاً جائز ہے۔

(۲) ٹیکسی کی خدمات (Services) کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدن میں مشارکہ، یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ اس باب کے شروع میں بیان کیا گیا۔

(۳) عمیل کا تمویل کار کے حصے کے مختلف یونٹس کو خریدنا، اس کا جواز ان شرطوں کے ساتھ مشروط ہے جو ہاؤس فائنانسنگ میں تفصیل سے بیان ہوچکی ہیں، لیکن ہاؤس فائنانسنگ اور اس دوسری مثال میں تجویز کردہ طریقِ کار میں ایک تھوڑا سا فرق ہے، وہ یہ کہ ٹیکسی کو جب کرائے کی سواری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو عموماً وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت میں کمی (Depreciation) واقع ہوتی ہے، اس لئے تمویل کار کے مختلف یونٹس کی قیمت کے تعین میں قیمت کی اس کمی کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

عام تجارت میں شرکت متناقصہ

پہلے ذکر کردہ نمونوں میں سے تیسرا نمونہ یہ تھا کہ تمویل کار ساٹھ فیصد سرمایہ ریڈی میڈ

گارمنٹس کا کاروبار چلانے کے لئے شامل کرتا ہے۔ یہ طریق کار دو اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) پہلے مرحلے میں تو یہ ایک سادہ سا مشارکہ ہے جس کے ذریعے سے دو شریک ایک مشترکہ کاروبار میں مختلف مقدار میں اپنا اپنا سرمایہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان شرطوں کے مطابق جائز ہے جو کہ اسی باب کے شروع میں بیان کی گئیں۔

(۲) عمیل کا تمویل کار کے حصے کے مختلف یونٹس کو خریدنا جو کہ عمیل کی طرف سے مستقل اور علیحدہ وعدے کے ذریعے سے ہوگا۔ اس وعدے کے متعلق شرعی شرائط وہی ہیں جو کہ ہاؤس فائنانسنگ کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں، لیکن دونوں میں ایک بڑا اہم فرق ہے۔ وہ یہ کہ یہاں پر تمویل کار کے حصے کی قیمت وعدۂ خریداری میں متعین نہیں کی جاسکتی۔ اگر قیمت مشارکہ میں داخل ہوتے ہی پیشگی طے کر لی گئی تو عملاً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عمیل نے تمویل کار کے لگے ہوئے اصل سرمائے کی نفع کے ساتھ یا نفع کے بغیر واپسی کی یقین دہانی کرادی ہے، جو کہ مشارکہ کی صورت میں شرعاً سختی سے ممنوع ہے۔ اس لئے جو یونٹس عمیل خریدے گا ان کی قیمت متعین کرنے کے لئے تمویل کار کے پاس دو اختیار (Options) ہیں۔ پہلا اختیار یہ ہے کہ وہ اس بات پر اتفاق کر لے کہ ہر یونٹ کی خریداری کے وقت کاروبار کی قیمت لگا کر اس کی بنیاد پر ان یونٹس کو بیچا جائے گا، اور اگر کاروبار کی قیمت بڑھ گئی ہے تو اس یونٹ کا ثمن بھی زیادہ ہوگا اور اگر کاروبار کی قیمت کم ہوگئی تو یونٹ کی قیمت بھی کم ہو جائے گی۔ یہ قیمت لگانا ماہرین کے ذریعے متعارف اصولوں کے مطابق بھی ہوسکتا ہے اور ان ماہرین کی نشاندہی بھی وعدے پر دستخط کے وقت کی جاسکتی ہے۔ دوسرا اختیار یہ ہے کہ تمویل کار عمیل کو اجازت دیدے کہ وہ یونٹس کو جس قیمت پر ممکن ہو کسی اور کے ہاتھ بیچ دے۔ اسی کے ساتھ وہ خود بھی عمیل کو ایک خاص قیمت کی پیش کش کردے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر اسے اس سے زیادہ قیمت پر کوئی گاہک مل جاتا ہے تو وہ اسے بیچ دے گا، لیکن اگر وہ فائنانشر ہی کو بیچنا چاہتا ہے تو وہ اسی قیمت پر لینے پر متفق ہوگا جو اس سے پہلے اس نے طے کردی تھی۔

اگرچہ شرعاً دونوں اختیار ہی قابلِ عمل ہیں لیکن دوسرا اختیار تمویل کار کے لئے قابلِ عمل نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کا نتیجہ ایک نئے شریک کے مشارکہ میں شامل ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا، جس سے پورا بندوبست متاثر ہوگا اور شرکت متناقصہ کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا جس کے مطابق تمویل کار اپنی رقم ایک متعین عرصے میں واپس لینا چاہتا تھا، اس لئے شرکت متناقصہ کے مقصد کو روبہ عمل لانے کے لئے صرف پہلا اختیار ہی قابلِ عمل ہے۔

مرابحہ

مرابحہ

اکثر اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے مرابحہ کو ایک اسلامی طریقۂ تمویل کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور ان کے اکثر تمویلی عمل (Financial Operations) مرابحہ پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصطلاح معاشی حلقوں میں آج کل ایک بینکاری کے طریقے کے طور پر مروّج ہے، جبکہ مرابحہ کا اصل تصور اس خیال سے مختلف ہے۔

مرابحہ حقیقت میں اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایک خاص قسم کی بیع ہوتی ہے جس کا اپنے اصل تصور کے اعتبار سے تمویل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کوئی بائع اپنے خریدار کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیتا ہے کہ وہ اسے ایک متعین سامان متعین نفع پر دے گا جسے اس سامان کی لاگت پر زائد کیا جائے گا تو اسے ''مرابحہ'' کہا جاتا ہے۔ مرابحہ کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ بیچنے والا اس لاگت کو ظاہر کرتا ہے جو اس نے اس سامان کے حصول پر برداشت کی ہے اور اس پر کچھ نفع شامل کر لیتا ہے۔ یہ نفع ایک متعین رقم کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور فیصدی شرح پر مبنی بھی۔

مرابحہ کی صورت میں ادائیگی بروقت بھی ہو سکتی ہے اور بعد میں آنے والی کسی تاریخ پر بھی جس پر فریقین متفق ہوں۔ اس لئے مرابحہ لازمی طور پر مؤجل ادائیگی (Deffered Payment) پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ عموماً وہ لوگ خیال کرتے ہیں جو کہ اسلامی فقہ سے زیادہ شناسائی نہیں رکھتے اور انہوں نے بینکنگ کے معاملات کے حوالے ہی سے مرابحہ کا نام سنا ہوتا ہے۔

مرابحہ اپنی اصل شکل میں ایک سادہ بیع ہے۔ وہ واحد خصوصیت جو اسے باقی اقسام کی بیوع سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مرابحہ میں بائع صراحتاً خریدار کو یہ بتاتا ہے کہ اسے کتنی لاگت آئی ہے اور لاگت پر وہ کتنا نفع لینا چاہتا ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی چیز ایک متعین قیمت پر فروخت کرتا ہے جس میں لاگت کا کوئی حوالہ نہیں ہے تو یہ مرابحہ نہیں ہے، اگرچہ وہ اپنی لاگت پر نفع بھی کمائے، اس لئے کہ یہ بیع لاگت پر کچھ زائد شامل کرنے ("Cost-Plus") کے تصور پر مبنی نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ بیع ''مساومہ'' کہلاتی ہے۔

یہ ہے مرابحہ کی اصطلاح کا حقیقی مفہوم جو کہ ایک خالص اور سادہ بیع ہے، لیکن بعض دوسرے تصورات کا اس میں اضافہ کر کے اسے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں میں بطور طریقۂ تمویل استعمال

کیا جاتا ہے، لیکن اس طرح کے معاہدوں کا صحیح ہونا بعض شرائط پر موقوف ہے جن کا پورا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے تاکہ یہ معاہدے شرعاً قابلِ قبول ہوسکیں۔

ان شرائط کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مرابحہ ہر پہلو سے ایک بیع ہی ہے اس لئے صحیح بیع کے تمام لوازم کا اس میں پایا جانا ضروری ہے۔

لہٰذا اس بحث کا آغاز بیع کے چند بنیادی قواعد سے کیا جاتا ہے جن کے بغیر کوئی بھی بیع شرعاً صحیح نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد ہم ان قواعد کے متعلق بحث کریں گے جو کہ ''مرابحہ'' کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد وضاحت سے یہ بتایا جائے گا کہ مرابحہ کو قابلِ قبول طریقۂ تمویل کے طور پر استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تفصیلی اصولوں کو مختصر سے مختصر جملوں میں بند کردیا جائے تاکہ موضوع کے بنیادی نکات ایک ہی نظر میں گرفت میں آسکیں اور حوالہ دینے میں سہولت کے لئے محفوظ کیے جاسکیں۔

خرید وفروخت کے چند بنیادی قواعد

شریعت میں بیع کی تعریف یہ کی گئی ہے ''قیمت رکھنے والی چیز کا قیمت والی چیز ہی کے بدلے میں باہمی رضامندی سے تبادلہ''۔ مسلم فقہاء نے عقد بیع کے بارے میں بہت سے قواعد ذکر کیے ہیں اور ان کی تفصیل بیان کرنے کے لئے متعدد جلدوں میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، یہاں مقصود صرف ان قواعد پر مختصر گفتگو کرنا ہے جن کا تعلق تمویلی اداروں میں استعمال ہونے والے مرابحہ کے ساتھ ہے۔

قاعدہ نمبر ۱:

بیچی جانے والی چیز بیع کے وقت موجود ہونی چاہئے۔ لہٰذا جو چیز ابھی تک وجود میں نہیں آئی اسے بیچا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر کسی غیر موجود چیز کی بیع کی گئی، اگرچہ باہمی رضامندی سے ہی ہو، یہ بیع شرعاً باطل ہوگی۔

مثال: ''الف'' اپنی گائے کا بچہ جو کہ ابھی تک پیدا نہیں ہوا ''ب'' کو بیچتا ہے، یہ بیع باطل ہے۔

قاعدہ نمبر ۲:

فروخت کی جانے والی چیز بیع کے وقت بائع کی ملکیت میں ہو۔ لہٰذا جو چیز فروخت کرنے

والے کی ملکیت میں نہیں اسے بیچا بھی نہیں جا سکتا۔ اگر اس کی ملکیت حاصل کرنے سے پہلے اسے بیچتا ہے تو بیع باطل ہوگی۔

مثال: ''الف'' ''ب'' کو ایک کار بیچتا ہے جو فی الحال ''ج'' کی ملکیت میں ہے، لیکن اسے اُمید ہے کہ وہ کار ''ج'' سے خرید لے گا اور بعد میں ''ب'' کے حوالے کر دے گا، یہ بیع باطل ہے، اس لئے کہ کار بیع کے وقت ''الف'' کی ملکیت میں نہیں تھی۔

قاعدہ نمبر ۳:

بیع کے وقت بیچی جانے والی چیز بیچنے والے کے حسی یا معنوی قبضے میں ہو۔ ''معنوی'' قبضے سے مراد ایسی صورتِ حال ہے جس میں قبضہ کرنے والے نے وہ چیز ظاہری طور پر اپنی تحویل میں نہیں لی لیکن اس کے کنٹرول میں آ گئی ہے اور اس کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں اس کی طرف منتقل ہو گئی ہیں، جن میں اس چیز کے ضیاع کا خطرہ اور رسک بھی شامل ہے، یعنی یہ چیز اگر ضائع ہو گئی تو یہ سمجھا جائے گا کہ خریدار کی ضائع ہوئی۔

مثال: (۱) ''الف'' نے ''ب'' سے ایک کار خریدی۔ ''ب'' نے ابھی تک یہ کار ''الف'' یا اس کے وکیل کے حوالے نہیں کی۔ ''الف'' یہ کار ''ج'' کو فروخت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس پر قبضہ کرنے سے پہلے بیچ دیتا ہے تو بیع صحیح نہیں ہوگی۔

(۲) ''الف'' نے ''ب'' سے ایک کار خریدی۔ ''ب'' اس کار کی تعیین اور نشاندہی کرنے کے بعد اسے ایک ایسے گیراج میں کھڑا کر دیتا ہے جہاں ''الف'' کی آزادانہ رسائی ہے اور ''ب'' اسے اجازت دے دیتا ہے کہ وہ گاڑی کو وہاں سے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔ گاڑی کا رسک ''الف'' کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ اب گاڑی اس کے معنوی قبضے (Constructive Possession) میں ہے۔ اگر ''الف'' اس پر ظاہری اور حسی قبضہ کیے بغیر ''ج'' کو بیچ دیتا ہے تو بیع صحیح ہوگی۔

وضاحت ۱:

قاعدہ نمبر ۱ تا ۳ کا لب لباب یہ ہے کہ کوئی شخص ایسی چیز نہیں بیچ سکتا جو

(۱) ابھی وجود میں نہ آئی ہو۔

(۲) بیچنے والے کی ملکیت میں نہ ہو۔

(۳) بیچنے والے کے حسی یا معنوی قبضے میں نہ ہو۔

وضاحت نمبر ۲:

عملی بیع (Actual Sale) اور صرف بیع کا وعدہ کر لینے میں بڑا فرق ہے۔ عملی بیع اس وقت تک مؤثر نہیں ہوتی جب تک کہ مذکورہ تین شرطیں پوری نہ کر لی جائیں، البتہ کوئی شخص ایسی چیز کے بیچنے کا وعدہ کر سکتا ہے جو کہ اس کی ملکیت یا قبضے میں نہیں ہے۔ بنیادی طور پر وعدۂ بیع سے وعدہ کرنے والے پر صرف ایک اخلاق ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے وعدے کو پورا کرے، اس میں عموماً عدالتی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی، تاہم بعض مخصوص صورتوں میں خصوصاً جبکہ وعدوں کی وجہ سے دوسرے فریق پر ذمہ داری کا کوئی بوجھ پڑ گیا ہو تو اس وعدے پر بذریعہ عدالت بھی عمل کرایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں عدالت وعدہ کنندہ کو اپنے وعدہ کی تکمیل پر یعنی عملاً بیع کرنے پر مجبور کرے گی۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو عدالت اسے حکم دے گی کہ دوسرے فریق کو وعدہ کی خلافی کی وجہ سے جو حقیقی نقصان ہوا ہے وہ اسے ادا کرے۔[1]
لیکن عملاً بیع اس وقت نافذ اور مؤثر ہوگی جبکہ وہ سامان بائع کے قبضے میں آ جائے۔ اس صورت میں نئے ایجاب وقبول کی ضرورت ہوگی، اور جب تک اس طرح سے بیع نہ ہو جائے اس کے قانونی نتائج مرتب نہیں ہوں گے۔

استثناء

قاعدہ نمبر ۱ تا ۳ میں ذکر کردہ اصول میں دو قسم کی بیع میں چھوٹ دی گئی ہے:
(۱) بیع سلم
(۲) استصناع
ان دونوں قسم کی بیع پر آگے چل کر مستقل باب میں بحث کی جائے گی۔

قاعدہ نمبر ۴:

بیع غیر مشروط اور فوری طور پر نافذ العمل ہونی چاہیے، لہٰذا جو بیع مستقبل کی کسی تاریخ کی

---

(۱) اسلامی فقہ اکیڈمی کی قرارداد نمبر ۲، ۳، منظور کردہ اجلاس چہارم منعقدہ کویت ۱۴۰۹ھ، ملاحظہ ہو: مجلہ۔ مجمع الفقہ الاسلامی، شمارہ: ۵، ۲/۱۵۹۹۔

طرف منسوب ہو یا مستقبل میں پیش آنے والے کسی واقعہ پر موقوف ہو وہ باطل ہوگی۔ اگر فریقین بیع کو صحیح کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس وقت از سرِ نو بیع کرنا ہوگی جبکہ مستقبل کی وہ تاریخ آجائے یا وہ شرط پائی جائے جس پر بیع موقوف تھی۔

مثالیں: (۱) الف یکم جنوری کو ''ب'' سے کہتا ہے کہ میں تمہیں اپنی کار یکم فروری کو بیچتا ہوں، یہ بیع باطل ہوگی، اس لئے کہ اسے مستقبل کی ایک تاریخ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

(۲) ''الف'' ''ب'' سے کہتا ہے کہ اگر فلاں پارٹی الیکشن جیت گئی تو میری کار تمہارے ہاتھ بکی ہوئی تصور ہوگی، یہ بیع بھی باطل ہے، اس لئے کہ اسے مستقبل کے ایک واقعے پر موقوف کیا گیا ہے۔

قاعدہ نمبر ۵:

بیچی جانے والی چیز ایسی ہو جس کی کوئی قیمت ہو، لہٰذا کاروباری عرف میں جس چیز کی کوئی قیمت نہ ہو اس کی بیع نہیں ہوسکتی۔

قاعدہ نمبر ۶:

بیچی جانے والی چیز ایسی نہ ہو جس کا حرام مقصد کے علاوہ کوئی اور استعمال ہی نہ ہو، جیسے خنزیر اور شراب وغیرہ۔

قاعدہ نمبر ۷:

جس چیز کی بیع ہو رہی ہو وہ واضح طور پر معلوم ہونی چاہئے اور خریدار کو اس کی شناخت کرائی جانی چاہئے۔

وضاحت:

بیچی جانے والی چیز کی تعیین اشارہ کر کے بھی ہوسکتی ہے اور ایسی تفصیلی وضاحت سے بھی ہوسکتی ہے جس سے وہ چیز ان اشیاء سے ممتاز ہو جائے جن کی بیع مقصود نہیں ہے۔

مثال: ایک بلڈنگ ہے جس میں ایک انداز کے بنے ہوئے کئی اپارٹمنٹ ہیں۔ ''الف'' جو کہ بلڈنگ کا مالک ہے ''ب'' سے کہتا ہے کہ ''میں تمہیں ان اپارٹمنٹس میں سے ایک بیچتا ہوں''۔ ''ب''

قبول بھی کر لیتا ہے تو بیع صحیح نہیں ہوگی، جب تک کہ زبانی وضاحت کے ساتھ یا اشارہ کر کے ایک اپارٹمنٹ کی تعیین نہ کر دی جائے۔

قاعدہ نمبر ۸:

بیچی جانے والی چیز پر خریدار کا قبضہ کرایا جانا یقینی ہو، یہ قبضہ محض اتفاق پر مبنی یا کسی شرط کے پائے جانے پر موقوف نہیں ہونا چاہئے۔

مثال: ''الف'' اپنی ایسی کار بیچتا ہے جو کسی نامعلوم شخص نے چرالی ہے، اور دوسرا شخص اس اُمید پر خرید لیتا ہے کہ ''الف'' یہ کار دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، یہ بیع صحیح نہیں ہوگی۔

قاعدہ نمبر ۹:

قیمت کی تعیین بھی بیع کے صحیح ہونے کے لئے ضروری شرط ہے، اگر قیمت متعین نہیں ہے تو بیع صحیح نہیں ہوگی۔

مثال: ''الف'' ''ب'' سے کہتا ہے کہ اگر ادائیگی ایک ماہ کے اندر کرو گے تو قیمت پچاس روپے ہوگی اور اگر دو ماہ میں کرو گے تو پچپن روپے ہوگی۔ ''ب'' بھی اس سے متفق ہو جاتا ہے تو قیمت غیر متعین ہے اس لئے بیع صحیح نہیں ہوگی، اِلا یہ کہ دو متبادل قیمتوں میں سے ایک کی تعیین بیع کے وقت ہی کر لی جائے۔

قاعدہ نمبر ۱۰:

بیع میں کوئی شرط نہیں ہونی چاہئے، جس بیع میں کوئی شرط لگائی جائے وہ فاسد ہوگی، اِلا یہ کہ وہ شرط کاروباری عرف میں مروّج ہو اور اس کا عام چلن ہو۔

مثال: (۱) ''الف'' ''ب'' سے ایک کار اس شرط پر خریدتا ہے کہ وہ اس کے بیٹے کو اپنی فرم میں ملازم رکھے گا، بیع چونکہ مشروط ہے اس لئے فاسد ہوگی۔

(۲) ''الف'' ''ب'' سے ایک ریفریجریٹر اس شرط پر خریدتا ہے کہ ''ب'' دو سال تک اس کی مفت سروس کا ذمہ دار ہوگا۔ یہ شرط چونکہ اس طرح کے معاملے کے حصے کے طور پر متعارف ہے اس لئے صحیح ہے اور بیع بھی درست ہے۔

بیع مؤجل

(اُدھار ادائیگی کی بنیاد پر بیع)

(۱) ایسی بیع جس میں فریقین اس بات پر اتفاق کرلیں کہ قیمت کی ادائیگی بعد میں کی جائے گی ''بیع مؤجل'' کہلاتی ہے۔

(۲) بیع مؤجل بھی جائز ہے بشرطیکہ ادائیگی کی تاریخ غیر مبہم طور پر طے کرلی گئی ہو۔

(۳) ادائیگی کا وقت متعین تاریخ کے حوالے سے بھی طے کیا جاسکتا ہے (مثلاً یکم جنوری کو ادائیگی ہوگی)، اور متعین مدت کے حوالے سے بھی، مثلاً تین ماہ بعد ادائیگی ہوگی، لیکن ادائیگی کا وقت مستقبل کے کسی ایسے واقعے کے حوالے سے متعین نہیں کیا جاسکتا جس کی حتمی تاریخ غیر معلوم یا غیر یقینی ہو۔ اگر ادائیگی کا وقت غیر متعین یا غیر یقینی ہے تو بیع صحیح نہیں ہوگی۔

(۴) اگر ادائیگی کے لئے ایک خاص مدت متعین کی گئی ہے مثلاً ایک ماہ، تو اس کا آغاز قبضے کے وقت سے ہوگا، اِلا یہ کہ فریقین کسی اور بات پر متفق ہوجائیں۔

(۵) اُدھار کی صورت میں قیمت نقد سے زائد بھی ہوسکتی ہے، لیکن عقد کے وقت ہی اس کی تعیین ہوجانا ضروری ہے۔

(۶) ایک دفعہ جو قیمت متعین ہوگئی اس میں وقت سے پہلی ادائیگی کی وجہ سے کمی کرنا یا ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اضافہ کرنا درست نہیں ہے۔

(۷) قسطوں کی بروقت ادائیگی کے لئے خریدار پر دباؤ ڈالنے کی خاطر اسے یہ وعدہ کرنے کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ نادہندگی کی صورت میں وہ متعین مقدار میں رقم کسی خیراتی مقصد کے لئے دے گا۔ اس صورت میں بائع وہ رقم خریدار سے وصول کرسکتا ہے لیکن اپنی آمدن کا حصہ بنانے کے لئے نہیں بلکہ خریدار کی طرف سے خیراتی کاموں میں خرچ کرنے کے لیے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث اسی باب میں آگے چل کر آرہی ہے۔

(۸) اگر سامان کی بیع قسطوں پر ہوئی ہے تو بائع یہ شرط بھی عائد کرسکتا ہے کہ اگر خریدار کسی بھی قسط کی بروقت ادائیگی میں ناکام رہا تو باقی ماندہ تمام اقساط فوری طور پر واجب الادا ہوجائیں گی۔

(۹) قیمت کی ادائیگی یقینی بنانے کے لئے بائع خریدار سے یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ وہ اسے کوئی سیکورٹی فراہم کرے خواہ وہ رہن کی شکل میں ہو یا اس کے موجودہ اثاثوں میں کسی اثاثے

کے ذریعے اپنی رقم کی وصولی کے حق کی صورت میں ہو۔

(۱۰) خریدار سے پرامیسری نوٹ یا ہنڈی (Bill of Exchange) پر دستخط کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اس پرامیسری نوٹ یا ہنڈی کو کسی تیسرے فریق کے ہاتھ اس پر لکھی ہوئی قیمت سے کم یا زیادہ پر بیچا نہیں جا سکتا۔

مرابحہ

(۱) مرابحہ بیع کی ایک خاص قسم ہے جس میں بیچنے والا شخص بیچی جانے والی چیز کی لاگت صراحتاً بیان کرتا اور اس پر کچھ منافع شامل کر کے دوسرے شخص کو بیچتا ہے۔

(۲) مرابحہ میں نفع (Mark Up) کا تعین باہمی رضامندی سے دو طریقوں میں سے کسی طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ یا تو لگی بندھی مقدار طے کر لی جائے (مثلاً اصل لاگت پر اتنے روپے زائد) یا اصل لاگت پر خاص تناسب طے کر لیا جائے (یعنی اصل لاگت پر اتنے فیصد زائد)۔

(۳) بیچی جانے والی اشیاء حاصل کرنے کے لئے بائع کو جتنا خرچ کرنا پڑا ہے مثلاً مال برداری کا کرایہ اور کسٹم ڈیوٹی وغیرہ وہ سب لاگت میں شامل ہوگا اور نفع (Mark Up) اس مجموعی لاگت پر لاگو کیا جائے گا، لیکن کاروبار کے وہ خرچے جو ایک ہی مرتبہ چیز حاصل کرنے پر نہیں ہوتے بلکہ بار بار ہوتے رہتے ہیں جیسے ملازمین کی تنخواہیں، عمارت کا کرایہ وغیرہ انہیں انفرادی معاملے میں لاگت میں شامل نہیں کیا جا سکتا، البتہ اصل لاگت پر جو نفع متعین کیا جائے گا اس میں خرچوں کا بھی لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔

(۴) مرابحہ اسی صورت میں صحیح ہوگا جبکہ چیز کی پوری لاگت متعین کی جا سکتی ہو۔ اگر چیز کی پوری لاگت متعین نہ کی جا سکتی ہو تو اسے مرابحہ کے طور پر نہیں بیچا جا سکتا۔ اس صورت میں وہ چیز مساومہ (Bargaining) کی بنیاد پر ہی بیچی جا سکتی ہے، یعنی لاگت اور اس پر طے شدہ نفع کے حوالے کے بغیر۔ اس صورت میں قیمت باہمی رضامندی سے ایک متعین مقدار میں طے کی جائے گی۔

مثال: (۱) الف نے جوتوں کا ایک جوڑا سو روپے میں خریدا۔ وہ اسے دس فیصد مارک اپ پر بطور مرابحہ بیچنا چاہتا ہے۔ اصل لاگت چونکہ پورے طور پر معلوم ہے اس لئے بیع مرابحہ درست ہے۔

(۲) الف نے ایک ہی عقد میں ایک ریڈی میڈ سوٹ اور جوتوں کا ایک جوڑا پانچ سو روپے میں خریدا۔ اب وہ سوٹ اور جوتے دونوں ملا کر بطور مرابحہ بیچ سکتا ہے، لیکن وہ تنہا جوتے بطور مرابحہ نہیں بیچ سکتا، اس لئے کہ صرف جوتوں کی لاگت متعین نہیں کی جاسکتی۔ اگر وہ صرف جوتے ہی بیچنا چاہتا ہے تو انہیں لاگت اور اس پر نفع کے حوالے کے بغیر ایک لگی بندھی قیمت پر بیچنا ہوگا۔

مرابحہ بطور طریقۂ تمویل

بنیادی طور پر مرابحہ طریقۂ تمویل نہیں بلکہ بیع کی ایک خاص قسم ہے۔ شریعت کی رُو سے تمویل کے مثالی طریقے مشارکہ اور مضاربہ ہیں جن پر پہلے باب میں گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن موجودہ معاشی سیٹ اپ کے تناظر میں تمویل کے بعض شعبوں میں مشارکہ و مضاربہ کے استعمال میں کچھ عملی مشکلات ہیں، اس لئے اس دور کے ماہرینِ شریعت نے بعض خاص شرطوں کے ساتھ اُدھار ادائیگی کی بنیاد پر مرابحہ کو بطور طریقۂ تمویل استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دو بنیادی نقطوں کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے

۱۔ یہ بات کسی صورت نظر انداز نہیں ہونی چاہئے کہ مرابحہ اپنی اصل کے اعتبار سے طریقۂ تمویل نہیں ہے، یہ تو صرف سود سے بچنے کا ایک وسیلہ اور حیلہ ہے، ایسا مثالی ذریعۂ تمویل نہیں ہے جو اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل کرتا ہو۔ اس لئے معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے عمل میں اسے ایک عبوری مرحلے کے طور پر استعمال کرنا چاہئے، اور اس کا استعمال انہی صورتوں تک محدود رہنا چاہئے جہاں مشارکہ اور مضاربہ قابلِ عمل نہیں ہیں۔

۲۔ دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ محض سود کی جگہ نفع یا مارک اپ کا لفظ رکھ دینے سے مرابحہ وجود میں نہیں آجاتا۔ درحقیقت علماءِ شریعت نے مرابحہ کو بطور طریقۂ تمویل استعمال کرنے کی اجازت چند شرطوں کے ساتھ دی ہے۔ جب تک ان شرطوں کی پورے طور پر رعایت نہ کر لی جائے مرابحہ جائز نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان شرطوں کی رعایت ہی ایسی چیز ہے جس سے سودی قرضے اور مرابحہ کے معاملے میں خطِ امتیاز قائم ہوتا ہے۔ اگر ان شرطوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ معاہدہ شرعاً صحیح نہیں ہوگا۔

مرابحہ تمویل کی بنیادی خصوصیات

۱۔ مرابحہ سودی بنیاد پر دیا جانے والا قرضہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُدھار قیمت پر ایک چیز کی بیع ہے جس کی قیمت میں لاگت کے علاوہ طے شدہ نفع بھی شامل ہے۔

۲۔ چونکہ یہ ایک بیع ہے قرضہ نہیں ہے اس لئے اس میں ان تمام شرائط کو پورا کیا جانا ضروری ہے جو شرعاً بیع صحیح کے لئے مقرر ہیں، خصوصاً وہ شرطیں جو اسی باب میں پہلے شمار کی گئی ہیں۔

۳۔ مرابحہ بطور طریقۂ تمویل صرف اسی صورت میں استعمال ہوسکتا ہے جبکہ کلائنٹ کو واقعتاً کسی چیز کی خریداری کے لئے فنڈز درکار ہوں، مثلاً اسے اپنی جننگ فیکٹری کے لئے بطور خام مال کپاس درکار ہے تو اسے مرابحہ کی بنیاد پر کپاس بیچ سکتا ہے، لیکن جہاں فنڈز کسی اور مقصد کے لئے درکار ہوں، مثلاً جو چیزیں پہلے خریدی جا چکی ہیں ان کی قیمت ادا کرنے کے لئے، بجلی کے بل یا دوسرے یوٹیلٹی بلز کی ادائیگی کے لئے یا عملے کی تنخواہوں کے لئے رقم کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں مرابحہ کارآمد نہیں ہوگا، اس لئے کہ مرابحہ میں محض قرض دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ حقیقی بیع کا ہونا ضروری ہے۔

۴۔ تمویل کار کے کسی چیز کو کلائنٹ کے ہاتھ بیچنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ چیز تمویل کار کی ملکیت میں آچکی ہو۔

۵۔ بیچنے سے پہلے وہ چیز تمویل کار کے حسی یا معنوی قبضے میں آچکی ہو، یعنی وہ چیز کچھ دیر کے لئے اس کے ضمان (رسک) میں رہے، چاہے بہت مختصر سے وقت کے لئے ہو۔

۶۔ شریعت کی رُو سے مرابحہ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمویل کار خود وہ چیز خریدے اور اپنے قبضے میں لائے یا یہ کام کسی تیسرے شخص کو اپنا وکیل بنا کر اس کے ذریعے سے کرایا جائے، اس کے بعد وہ چیز کلائنٹ کو بیچی جائے، تاہم بعض استثنائی صورتوں میں جہاں کسی وجہ سے سپلائی کنندہ سے براہِ راست خریداری قابلِ عمل نہ ہو تو اس بات کی بھی اجازت ہے کہ وہ کلائنٹ کو اپنا وکیل بنادے، اور وہ اس کی طرف سے اس چیز کی خریداری کرے۔ اس صورت میں کلائنٹ پہلے وہ چیز تمویل کار کی طرف سے خریدے گا، اور اس پر اس کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے قبضہ کرے گا، اس کے بعد اس سے اُدھار قیمت پر خریدے گا۔ پہلے مرحلے میں اس چیز پر اس کا قبضہ تمویل کار کے وکیل کے طور پر ہوگا۔ یہ صرف امین ہوگا، جبکہ اس پر ملکیت تمویل کار کی ہے، اور اس کے منطقی نتیجے کے طور پر اس کا رسک بھی اسی کے ذمے ہوگا، البتہ جب کلائنٹ

تمویل کار سے وہ چیز خرید لے گا تو ملکیت اور رسک کلائنٹ کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

۷۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ جب تک کوئی چیز بائع کے قبضے میں نہ آ جائے اس کی بیع درست نہیں ہوتی، لیکن اگر وہ چیز بائع کے قبضے میں نہیں ہے تو وہ وعدہ بیع کر سکتا ہے، یہ اصول مرابحہ میں بھی قابلِ عمل ہے۔

۸۔ مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں ایک مالیاتی ادارہ درجِ ذیل طریقِ کار اختیار کرتے ہوئے مرابحہ کو بطور طریقۂ تمویل استعمال کر سکتا ہے۔

پہلا مرحلہ

مالیاتی ادارہ اور کلائنٹ ایک جامع معاہدے پر دستخط کریں گے جس کی رو سے ادارہ مطلوبہ چیز کی بیع اور عمیل اس کی وقتاً فوقتاً ایک طے شدہ نفع کے تناسب پر خریداری کا وعدہ کرے گا۔ اس معاہدے میں اس سہولت کے کارآمد ہونے کی آخری حد بھی مقرر کی جا سکتی ہے۔

دوسرا مرحلہ

جب عمیل (Client) کو متعین چیز کی ضرورت ہوگی تو مالیاتی ادارہ اس چیز کی خریداری کے لئے اسے اپنا وکیل مقرر کرے گا۔ وکالت کے اس معاہدے پر دونوں کے دستخط ہونے چاہئیں۔

تیسرا مرحلہ

کلائنٹ مالیاتی ادارے کی طرف سے وہ چیز خریدے گا اور ادارے کے وکیل کی حیثیت سے اس پر قبضہ کرے گا۔

چوتھا مرحلہ

کلائنٹ ادارے کو خریداری سے مطلع کرے گا اور وہ چیز اس سے خریدنے کی پیشکش (ایجاب) کرے گا۔

پانچواں مرحلہ

مالیاتی ادارہ اس ایجاب کو قبول کر لے گا اور بیع مکمل ہو جائے گی، جس کی رو سے اس چیز کی

ملکیت اور رسک دونوں کلائنٹ کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

صحیح مرابحہ کے لئے یہ پانچوں مرحلے ضروری ہیں۔ اگر مالیاتی ادارہ وہ چیز فراہم کنند (Supplier) سے براہِ راست خرید لیتا ہے (اور یہی زیادہ بہتر ہے) تو وکالت کے معاہدے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس صورت میں دوسرا مرحلہ ختم ہو جائے گا اور تیسرے مرحلہ پر ادارہ فراہم کنندہ سے خود خریداری کرے گا اور چوتھے مرحلے میں صرف کلائنٹ کی طرف سے ایجاب ہوگا۔

اس معاہدے کا سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ جس سامان پر مرابحہ ہو رہا ہے وہ تیسرے اور پانچویں مرحلے کے درمیان مالیاتی ادارے کے رسک اور ضمان میں رہے۔

یہ واحد خصوصیت ہے جو مرابحہ کو سودی قرضے سے ممتاز کرتی ہے، اس لئے ہر قیمت پر اس کی پوری رعایت رکھنا ضروری ہے، ورنہ مرابحہ کا عقد شرعاً صحیح نہیں ہوگا۔

۹۔ مرابحہ کے صحیح ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چیز کسی تیسری پارٹی سے خریدی گئی ہو، اسے خود کلائنٹ سے buy back کی بنیاد پر خرید لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے بائی بیک پر مبنی مرابحہ سودی قرضہ ہی ہے۔

۱۰۔ مرابحہ کا مذکورہ بالا طریق کار ایک پیچیدہ معاہدہ ہے جس میں متعلقہ فریق مختلف مرحلوں پر مختلف حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں:

(الف) پہلے مرحلے پر مالیاتی ادارہ اور عمیل مستقبل میں کسی چیز کی بیع اور خریداری کا وعدہ کرتے ہیں، یہ عملی بیع نہیں، یہ صرف مستقبل میں مرابحہ کی بنیاد پر بیع کا ایک وعدہ ہے، اس لئے ان دونوں کے درمیان تعلق وعدہ کرنے والے (Promisor) اور وعدہ لینے والے (Promisee) کا ہے۔

(ب) دوسرے مرحلے پر فریقین میں تعلق اصیل اور وکیل کا ہے۔

(ج) تیسرے مرحلے پر مالیاتی ادارے اور فراہم کنندہ (Supplier) کے درمیان تعلق بائع اور مشتری کا ہے۔

(د) چوتھے اور پانچویں مرحلے پر عمیل اور ادارے کے درمیان بائع اور مشتری کا تعلق شروع ہو جاتا ہے، اور چونکہ بیع اُدھار قیمت پر ہو رہی ہے اس لئے اسی کے ساتھ ہی دائن اور مدیون (قرض خواہ اور مقروض) کا تعلق بھی شروع ہو جاتا ہے۔

ان تمام حیثیتوں کو مدِنظر رکھا جانا اور ان کا اپنے اپنے وقت پر اپنے نتائج کے ساتھ روبہ عمل آنا ضروری ہے، ان حیثیتوں میں خلط ملط نہیں ہونا چاہئے۔

۱۱- قیمت کی بروقت ادائیگی کا اطمینان کرنے کے لئے ادارہ کلائنٹ سے کسی ضمانت کا مطالبہ بھی کر سکتا ہے، وہ پرامیسری نوٹ یا بل آف ایکسچینج پر دستخط کرنے کا مطالبہ بھی کر سکتا ہے، لیکن یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ عملاً بیع ہو چکی ہو، یعنی پانچویں مرحلے پر۔ وجہ یہ ہے کہ پرامیسری نوٹ پر دستخط مدیون (مقروض) دائن (قرض خواہ) کے حق میں کرتا ہے اور ادارے اور عمیل میں یہ تعلق پانچویں مرحلے پر ہی قائم ہوتا ہے جبکہ عملاً بیع وجود میں آ چکی ہوتی ہے۔

۱۲- اگر خریدار، قیمت کی بروقت ادائیگی میں ناکام رہے تو اس کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر خریدار نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ ایسی صورت میں خیراتی مقاصد کے لئے رقم دے گا تو یہ رقم ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی، جیسا کہ بیع مؤجل کے قواعد بیان کرتے ہوئے نمبرے پر پہلے بیان کیا جا چکا ہے، لیکن خریدار سے حاصل ہونے والی اس رقم کو تمویل کار یا بائع اپنی آمدن کا حصہ نہیں بنا سکتا، بلکہ اس پر لازم ہوگا کہ اسے خیراتی کاموں پر ہی خرچ کرے، جیسا کہ بعد میں تفصیل سے بتایا جائے گا۔

مرابحہ کے بارے میں چند مباحث

مرابحہ کے بنیادی تصور کی وضاحت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرابحہ میں پیش آنے والے چند اہم مسائل پر اسلامی اصولوں اور قابلِ عمل ہونے کے حوالے سے گفتگو کر لی جائے، اس لئے کہ ان مسائل کو صحیح طور پر سمجھے بغیر مرابحہ کا تصور غیر واضح رہتا اور عملاً غلطی کے امکانات باقی رہتے ہیں۔

ا- اُدھار اور نقد کے لئے الگ الگ قیمتیں مقرر کرنا

مرابحہ کے بارے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ جب اسے بطور طریقۂ تمویل اختیار کیا جاتا ہے تو بیع ہمیشہ اُدھار قیمت پر ہوتی ہے۔ تمویل کار مطلوبہ چیز نقد قیمت پر خریدتا ہے اور اپنے کلائنٹ کو اُدھار پر بیچ دیتا ہے۔ اُدھار قیمت پر بیچتے ہوئے وہ اس مدت کو پیشِ نظر رکھتا ہے جس میں کلائنٹ نے ادائیگی کرنا ہوتی ہے اور اسی نسبت سے وہ قیمت میں اضافہ بھی کر لیتا ہے۔ مرابحہ کی پختگی (ادائیگی کی تاریخ آنے) کی مدت جتنی زیادہ ہوگی قیمت بھی اتنی زیادہ ہوگی۔ اس لئے اسلامی بینکوں میں عملاً یہی ہو رہا ہے کہ مرابحہ میں قیمت بازاری قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر عمیل وہی چیز بازار

سے نقد قیمت پر خرید سکتا ہو تو اسے مرابحہ کی اُدھار قیمت سے کافی سستی مل جائے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُدھار بیع میں کسی چیز کی قیمت نقد کی نسبت زیادہ مقرر کی جاسکتی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ خریدار کو دی گئی مہلت کو پیشِ نظر رکھ کر اُدھار قیمت میں جو اضافہ ہوتا ہے اسے قرض پر لیے جانے والے سود ہی کے مترادف سمجھنا چاہئے، اس لئے کہ دونوں صورتوں میں زائد رقم ادائیگی کے مؤجل ہونے کی وجہ سے لی جارہی ہے۔ اس استدلال کی بنیاد پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی بینکوں میں مرابحہ پر جس طرح عمل ہورہا ہے وہ اپنی روح میں روایتی بینکوں کے سودی قرضوں سے مختلف نہیں ہے۔

یہ دلیل جو بظاہر بڑی معقول معلوم ہوتی ہے درحقیقت شریعت کے حرمتِ ربا کے اصول کے غلط فہم پر مبنی ہے۔ بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) جدید سرمایہ دارانہ نظریہ تجارتی معاملات میں اشیاء اور زر (نقد) میں کوئی فرق نہیں کرتا، باہمی تبادلے میں غیر نقد اشیاء اور نقد کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا ہے، دونوں ہی قابلِ تجارت ہیں اور دونوں ہی کی خرید وفروخت ہر ایسی قیمت پر ہوسکتی ہے جس پر فریقین متفق ہوں۔ کوئی شخص ایک ڈالر دو ڈالر کے بدلے میں نقد یا اُدھار اسی طرح بیچ سکتا ہے جیسے کہ وہ ایک ڈالر قیمت کی کوئی دوسری چیز دو ڈالر میں بیچ سکتا ہے۔ شرط صرف یہی ہے کہ ایسا باہمی رضامندی سے ہونا چاہئے۔

اسلامی اصول اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق نقد اور غیر نقد اشیاء کی الگ الگ خصوصیات ہیں، اس لئے ان پر احکام بھی الگ الگ جاری کیے جاتے ہیں۔ زر (Money) اور غیر نقد اشیاء (Commodity) میں فرق کے بنیادی نکات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ زر کی کوئی اپنی ذاتی افادیت نہیں ہوتی، اس سے براہِ راست انسانی ضرورتوں کی تکمیل نہیں کی جاسکتی، اسے صرف دوسری اشیاء اور خدمات کے حصول کے لئے ہی استعمال کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس کے برعکس غیر نقد اشیاء کی اپنی ذاتی افادیت ہوتی ہے، ان کا کسی اور چیز سے تبادلہ کیے بغیر براہِ راست بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ غیر نقد اشیاء معیار اور اوصاف میں مختلف ہوسکتی ہیں، جبکہ زر محض قدر و قیمت کی پیمائش کا آلہ اور ذریعۂ تبادلہ ہے، اس لئے زر کی کسی مالیت کی ایک اکائی اسی کی دوسری اکائی کے سو فیصد برابر ہے۔ ہزار روپے کا ایک پرانا اور میلا کچیلا نوٹ ہزار روپے کے نئے نوٹ کے بالکل برابر ہے، جبکہ غیر نقد اشیاء مختلف معیار کی ہوسکتی ہیں۔ ایک استعمال شدہ پرانی کار کی قیمت نئی کار سے کافی کم ہوسکتی ہے۔

۳۔ غیر نقد اشیاء میں بیع کا عقد ایک متعین چیز پر ہوتا ہے، یا کم از کم اس چیز کے اوصاف متعین ہوتے ہیں (مثلاً فلاں قسم کی گندم)۔ اگر الف نے ایک متعین کار کی طرف اشارہ کر کے اسے خریدا اور

بائع نے بھی اس سے اتفاق کرلیا تو اسے وہی کار لینے کا حق پہنچتا ہے، بائع اس کی جگہ کوئی اور کار لینے پر اسے مجبور نہیں کرسکتا، اگرچہ دوسری کار اسی قسم اور معیار کی ہو۔ ایسا صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ خریدار بھی اس سے متفق ہو، جس کا عملی مطلب یہ ہوگا کہ پہلی بیع فسخ ہوچکی ہے اور باہمی رضامندی سے نئی بیع وجود میں آگئی ہے۔

اس کے برعکس، زر کی، کسی مبادلہ کے معاملے مین تعیین نہیں کی جاسکتی۔ اگر ''الف'' نے ''ب'' سے کوئی چیز اسے ہزار روپے کا متعین نوٹ دکھا کر خریدی ہے تو بھی وہ اس کی جگہ اتنی ہی مالیت کا دوسرا نوٹ بھی دے سکتا ہے اور بائع اس بات پر اصرار نہیں کرسکتا کہ وہ صرف وہی نوٹ لے گا جو بیع کے وقت اسے دکھایا گیا تھا۔

ان فرقوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسلام نے زر اور غیر نقد اشیاء کے ساتھ الگ الگ برتاؤ کیا ہے۔ چونکہ زر کی اپنی ذاتی افادیت نہیں ہوتی وہ صرف آلۂ تبادلہ ہوتا ہے جس کے اوصاف اور معیار ہدر (کالعدم) ہوتے ہیں اس لئے زر کی ایک اکائی کا اسی مالیت کی دوسری اکائی سے تبادلہ صرف برابر سرابر ہی ہوسکتا ہے۔ اگر ہزار روپے کا پاکستانی کرنسی نوٹ سے تبادلہ دوسرے پاکستانی کرنسی نوٹ سے کیا جارہا ہے تو دوسرا نوٹ بھی ہزار روپے ہی کا ہونا چاہئے۔ اس کی مالیت ہزار روپے سے کم وبیش نہیں ہوسکتی، چاہے سودا نقد ہی ہو، اس لئے کہ کرنسی نوٹ کی نہ تو کوئی اپنی ذاتی افادیت ہے اور نہ ہی اس کی مختلف کوالٹی (جسے شرعاً تسلیم کیا گیا ہو) اس لئے کسی بھی طرف جو زائد مالیت ہوگی وہ معاوضے سے خالی ہوگی اس لئے شرعاً ناجائز ہوگی۔ یہ بات جس طرح نقد سودے پر منطبق ہوتی ہے اسی طرح اُدھار سودے پر بھی منطبق ہوگی جبکہ دونوں طرف روپے ہوں، اس لئے کہ روپے کا تبادلہ روپے سے کرتے وقت اُدھار سودے میں اگر ایک طرف سے زائد رقم وصول کی جاتی ہے تو وہ صرف اُدھار کی اس مدت اور وقت کے بدلے میں ہی ہوگی۔

عام غیر نقد اشیاء میں صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ چونکہ ان کی ذاتی افادیت ہوتی ہے اور ان کے معیار میں بھی فرق ہوتا ہے اس لئے مالک کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ طلب ورسد کی طاقتوں کے مطابق جس قیمت پر چاہے فروخت کرے۔ اگر بیچنے والا کسی فراڈ یا غلط بیانی کا مرتکب نہیں ہوتا تو وہ خریدار کی رضامندی سے اسے بازاری قیمت سے زائد پر بھی بیچ سکتا ہے۔ اگر خریدار اسی زائد قیمت پر رضامند ہے تو بیچنے والے کے لئے یہ زائد رقم بھی بالکل جائز ہوگی[1]۔ جب وہ نقد سودے میں چیز

---

(۱) چونکہ وہ ساری رقم اس بیچی جانے والی چیز کے بدلے میں ہے اور اس کا کوئی حصہ بھی خالی عن العوض نہیں ہے۔
مترجم

زائد قیمت پر فروخت کرسکتا ہے تو اُدھار سودے کی صورت میں بھی زائد قیمت وصول کرسکتا ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ بیچنے والا نہ تو خریدار کو کوئی دھوکہ دے اور نہ ہی اسے خریدنے پر مجبور کرے، بلکہ وہ اتنی قیمت ادا کرنے پر اپنی آزادانہ مرضی سے متفق ہوا ہو۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ نقد سودے کی صورت میں زائد قیمت مؤجل ادائیگی پر مبنی نہیں ہے اس لئے اس کی تو اجازت ہونی چاہئے لیکن جہاں بیع اُدھار قیمت پر ہورہی ہو وہاں قیمت میں اضافہ خالصتاً وقت کے مقابلے میں ہے جس نے اسے سود ہی کے مترادف بنادیا ہے، لیکن یہ استدلال بھی اسی غلط تصور پر مبنی ہے کہ جہاں بھی ادائیگی کے وقت کو مدِنظر رکھ کر قیمت میں اضافہ کرلیا جائے تو وہ معاملہ سود کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے، لیکن یہ مفروضہ ہی درست نہیں ہے۔مؤجل ادائیگی کے بدلے میں لی جانے والی زائد مقدار اسی صورت میں ربا ہوگی جبکہ دونوں طرف سے عقد زر پر واقع ہو رہا ہو۔لیکن اگر غیر نقد چیز زر کے بدلے میں بیچی جارہی ہو تو بیچنے والا قیمت کے تعین میں کئی عناصر کو مدِنظر رکھتا ہے جن میں ادائیگی کا وقت بھی شامل ہے اس لئے وہ زائد قیمت بھی مانگ سکتا ہے اور خریدار مختلف وجوہات کی بنیادوں پر اس سے اتفاق کرسکتا ہے:

الف۔ اس کی دکان خریدار کے زیادہ قریب ہے جو کہ مارکیٹ نہیں جانا چاہتا ہے اس لئے کہ وہ ذرا دور ہے۔

ب۔ بائع، خریدار کی نظر میں دوسروں کی نسبت زیادہ قابلِ اعتماد ہے اور اسے اس پر اس بات کا زیادہ بھروسہ ہے کہ وہ اسے مطلوبہ چیز بغیر کسی عیب کے مہیا کرے گا۔

ج۔ جن چیزوں کی زیادہ طلب ہوتی ہے (اس لئے وہ شارٹ بھی ہوجاتی ہیں) ان کی خریداری میں بائع اس خریدار کو ترجیح دیتا ہے، (اس لئے یہ خریدار بھی اس سے خریدنا پسند کرتا ہے تاکہ اس چیز کی بازار میں کمی کی صورت میں بھی اس کا ملنا یقینی ہو)

د۔ اس کی دکان کا ماحول دوسری دکانوں کی نسبت زیادہ صاف ستھرا اور آرام دہ ہے۔(۱)

یہ اور اس طرح کے دوسرے عناصر گاہک سے زیادہ قیمت کی وصولی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اسی طرح سے اگر کوئی بائع اپنے گاہک سے زائد قیمت اس لئے وصول کرتا ہے کہ وہ اسے اُدھار کی سہولت فراہم کررہا ہے تو شرعاً یہ بھی ناجائز نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ دھوکہ دہی نہ کرے اور خریدار اسے کھلی آنکھوں سے قبول کرے، اس لئے کہ قیمت میں زیادتی کی وجہ جو بھی ہو پوری کی پوری قیمت اس

(۱) حاصل یہ کہ قیمت اس لئے زیادہ کی جاتی ہے کہ گاہک کو اس شخص سے خریداری میں دلچسپی اور طلب زیادہ ہے، اس طلب کی وجوہ مختلف ہوسکتی ہیں۔مترجم

چیز کے بدلے میں ہی ہے زر کے بدلے میں نہیں ۔ یہ درست ہے کہ قیمت کا تعین کرتے وقت اس نے ادائیگی کے وقت کو ملحوظ رکھا ہے، لیکن جب قیمت طے ہوگئی تو یہ اسی چیز کی طرف منسوب ہوگی، وقت کی طرف نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر خریدار طے شدہ وقت کے اندر ادائیگی میں ناکام ہو جاتا ہے تو قیمت اتنی ہی رہے گی بائع اس میں اضافہ نہیں کرسکتا۔ اگر قیمت وقت کے مقابلے میں ہوتی تو جب بائع اسے مزید وقت دیتا تو وہ قیمت میں بھی اضافہ کرسکتا۔

دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ روپوں کا تبادلہ صرف برابر سرابر ہی ہوسکتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اس لئے اُدھار سودے میں جو بھی زائد رقم لی جائے گی (جبکہ روپوں کی بیع روپوں کے بدلے میں ہورہی ہو) تو وہ صرف وقت کے بدلے میں ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ (سودی نظام میں مقرّرہ وقت آجانے کے بعد قرض دہندہ مقروض کو مزید مہلت دیتا ہے تو اس سے مزید رقم بھی وصول کی جاتی ہے ۔ اس کے برعکس ایک اُدھار سودے کے اندر قیمت کے تعین میں وقت واحد عنصر نہیں ہے، قیمت اس چیز ہی کے بدلے میں مقرر کی گئی ہے وقت کے بدلے میں نہیں، تاہم پہلے ذکر کردہ دوسرے عناصر کی طرح وقت نے بھی قیمت کی تعیین میں جزوی اور اضافی کردار ادا کیا ہے لیکن اس عنصر نے جب ایک مرتبہ اپنا کردار ادا کرلیا تو قیمت کا ہر ہر حصہ اس چیز کی طرف ہی منسوب ہوگا ۔[1]

اس ساری بحث کا ماحاصل یہ ہے کہ جب رقم کا مبادلہ رقم کے ساتھ ہورہا ہو تو نقد سودے اور ادھار سودے دونوں میں کمی بیشی ناجائز ہے، لیکن جب کسی چیز کی بیع رقم کے بدلے میں ہورہی ہو تو فریقین میں طے شدہ قیمت بازاری قیمت سے زائد بھی ہوسکتی ہے چاہے سودا نقد ہو یا ادھار ۔ ادائیگی کا وقت، قیمت کی تعیین میں ایک اضافی اور ضمنی عامل کے طور پر اثر انداز ہوگا، رقم کے بدلے رقم کے تبادلے کی طرح نہیں ہوگا کہ زائد رقم صرف اور صرف وقت کا معاوضہ ہی بن سکے ۔

یہ صورتِ حال چاروں فقہی مکاتب میں متفقہ طور پر قابلِ قبول ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر بائع کسی چیز کی نقد اور ادھار بیع کے لئے دو الگ الگ قیمتیں متعین کرتا ہے اور ادھار قیمت نقد سے زائد ہے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے ۔ شرط صرف یہ ہے کہ عقد کے وقت ہی دو صورتوں میں سے ایک کا تعین کر لیا جائے کہ سودا نقد ہوگا یا اُدھار، اس میں کوئی ابہام باقی نہیں رہنا چاہئے ۔ مثال کے طور پر سودے کی بات چیت (Bargaining) کرتے وقت بائع خریدار سے کہتا ہے اگر تم یہ چیز نقد خریدو گے تو قیمت سو روپے ہوگی اور اگر چھ مہینے کے ادھار پر خریدو گے تو قیمت ایک سو دس روپے ہوگی، لیکن خریدار کو دو صورتوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اسی وقت کرنا ہوگا ۔ مثلاً وہ یہ کہتا ہے کہ وہ یہ چیز اُدھار

---

(۱) حاصل یہ کہ زیادہ سے زیادہ یہ اعتیاض عن الاجل ضمناً ہے، اصلاً نہیں ۔ (مترجم)

قیمت پر ایک سو دس روپے میں خرید تا ہے تو عملاً بیع کے وقت قیمت فریقین میں متعین ہے۔[1]

لیکن اگر دو صورتوں میں سے کسی کا واضح طور پر تعین نہ کیا گیا تو بیع صحیح نہیں ہوگی۔ ایسا قسطوں پر ہونے والے ان سودوں میں ممکن ہے جہاں الگ الگ وقتِ ادائیگی کے لحاظ سے الگ الگ قیمتوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں بائع ادائیگی کے شیڈول کے حوالے سے قیمتوں کا ایک شیڈول مرتب کرتا ہے، مثلاً تین ماہ ادھار کی صورت میں ہزار روپے لیے جائیں گے، چھ ماہ کے ادھار کی صورت میں گیارہ سو، نو ماہ کی صورت میں بارہ سو، وعلی ھذا القیاس۔ خریدار وہ چیز لے لیتا ہے لیکن یہ طے نہیں کرتا کہ ان مختلف صورتوں میں سے وہ کس کو اختیار کرے گا، اور یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ مستقبل میں ادائیگی اپنی سہولت کے مطابق کرے گا، (یعنی اگر تین ماہ میں ادائیگی ممکن ہوگئی تو ہزار روپے دیدے گا، اگر چھ ماہ میں ہوئی تو گیارہ سو) یہ عقد صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ قیمت اور ادائیگی کا وقت دونوں مجہول ہیں، لیکن اگر وہ ایک صورت واضح طور پر متعین کر لیتا ہے، مثلاً وہ یہ کہتا ہے کہ وہ یہ چیز چھ ماہ کے ادھار پر گیارہ سو روپے میں خرید تا ہے تو بیع صحیح ہوگی۔

ایک اور بات کا یہاں ذہن میں رہنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اوپر جس صورت کے جواز کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ادھار سودے میں نقد کی نسبت قیمت زیادہ مقرر کر لی جائے۔ لیکن اگر بیع نقد ہی ہوئی ہے[2] لیکن بائع یہ شرط عائد کر دیتا ہے کہ اگر خریدار نے ادائیگی میں تاخیر کی تو وہ سالانہ دس فیصد زائد بطور جرمانہ یا بطور سود وصول کرے گا تو یہ قطعاً ناجائز ہے، اس لئے کہ اب جو زائد رقم وصول کی جا رہی ہے وہ قرض پر لیا جانے والا سود ہی ہے۔

دونوں صورتوں میں عملی فرق یہ ہے کہ جہاں زائد رقم چیز کی قیمت کا ہی ایک حصہ ہو وہاں یہ زائد رقم ایک دفعہ ہی وصول کی جائے گی، دوہری یا تگنی نہیں ہوگی، اگر خریدار بروقت ادائیگی نہیں کرتا تو اس کی وجہ سے بائع مزید رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا، قیمت اتنی ہی رہے گی، اس کے برخلاف جہاں مارکیٹ ریٹ پر زائد رقم چیز کی قیمت کا حصہ نہیں ہے وہاں نادہندگی کا وقت زائد ہونے سے یہ رقم بڑھتی رہے گی۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: ابن قدامہ: المغنی، ج ۴، ص ۲۹۰۔ السرخسی المبسوط، ج ۱۳، ص ۸۔ الدسوقی، ج ۳، ص ۸۵۔ مغنی المحتاج، ج ۲، ص ۳۱۔

(۲) یہ خیال رہے کہ اگر سودے میں نقد یا ادھار کا کوئی ذکر نہیں ہوا تو شرعاً وہ بیع نقد ہی تصور ہوگی اور بائع جب چاہے قیمت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ مترجم

۲۔مروجہ شرح سود کو معیار بنانا

مرابحہ کے ذریعے تمویل کرنے والے بہت سے ادارے اپنے مارک اپ کا تعین مروّجہ شرح سود کی بنیاد پر کرتے ہیں جس کے لئے عموماً (LIBOR)[1] یعنی لندن میں بینکوں کی باہمی شرح سود کو بطور معیار استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر LIBOR چھ فیصد ہے تو یہ بینک اپنا مارک اپ چھ فیصد یا اس سے کچھ زائد مقرر کرلیں گے۔ اس طریقۂ کار پر بھی یہ تنقید کی جاتی ہے کہ جو نفع شرح سود پر مبنی ہو وہ بھی سود کی طرح حرام ہونا چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حلال منافع کے تعین کے لئے سود کی شرح کا استعمال پسندیدہ نہیں، اور اس سے یہ معاملہ کم از کم ظاہری طور پر سودی قرضے کے مشابہ بن جاتا ہے اور سود کی شدید حرمت کے پیش نظر اس ظاہری مشابہت سے بھی جہاں تک ہو سکے بچنا چاہئے، لیکن یہ حقیت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ مرابحہ کے صحیح ہونے کے لئے سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک حقیقی بیع ہو جس میں بیع کے تمام لوازم اور نتائج مکمل طور پر پائے جاتے ہوں۔ اگر کسی مرابحہ میں وہ تمام شرائط پائی جاتی ہیں جو پہلے شمار کی گئی ہیں تو محض نفع کے تعین کے لئے شرح سود کو بطور حوالہ استعمال کرنے سے یہ عقد غیر صحیح اور حرام نہیں بن جائے گا۔ اس لئے کہ معاملہ خود سود پر مشتمل نہیں ہے، شرح سود کو تو صرف حوالے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے سمجھی جاسکتی ہے۔

''الف'' اور ''ب'' دو بھائی ہیں۔ ''الف'' شراب کا کاروبار کرتا ہے جو کہ بالکل حرام ہے۔ ''ب'' چونکہ ایک باعمل مسلمان ہے اس لئے وہ اس کاروبار کو ناپسند کرتا ہے اس لئے وہ غیر نشہ آور مشروبات کا کاروبار شروع کرتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس کے کاروبار میں بھی اتنا نفع ہو جتنا دوسرا بھائی شراب کے کاروبار سے کماتا ہے، اس لئے وہ یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنے گاہکوں سے اسی نسبت سے نفع لے گا جس نسبت سے ''الف'' شراب پر لیتا ہے، تو اس نے اپنے نفع کے تناسب کو ''الف'' کے ناجائز کاروبار والے نفع سے مربوط کرلیا ہے۔ کوئی شخص اس طرح کرنے کے پسندیدہ ہونے یا نہ ہونے

(۱) کچھ بینکوں کے پاس زائد از ضرورت نقد رقم ہوتی ہے اور کچھ بینکوں کے پاس قرضے دینے کے لئے رقم کم ہوتی ہے۔ ایسے بینک اوّل الذکر سے عموماً قرض لے لیتے ہیں۔ اس سے بینکوں کی باہمی مارکیٹ وجود میں آجاتی ہے۔ اس مارکیٹ میں کسی مخصوص مدت کے لئے جو شرح سود ہوتی ہے اسے Inter-Bank Market Offered Rate کہا جاتا ہے، جس کا مخفف "IBOR" ہے۔ لندن میں بینکوں کی مارکیٹ کی اس طرح کی شرح سود کو London Inter-Bank Offered Rate کہا جاتا ہے جس کا مخفف "LIBOR" ہے۔ قرضوں کے لین دین میں اس کا حوالہ بہت کثرت سے آتا ہے۔ مترجم

کا سوال تو اُٹھا سکتا ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس جائز کاروبار سے حاصل کیا ہوا نفع حرام ہے، اس لئے کہ اس نے شراب کے نفع کو صرف حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اسی طرح اگر مرابحہ اسلامی اصولوں پر مبنی ہے اور اس کی ضروری شرائط کو بھی پورا کر لیا جاتا ہے تو شرح منافع کو مروّجہ شرح سود کے حوالے سے طے کرنے سے یہ معاہدہ ناجائز نہیں ہو جائے گا۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو جتنا جلدی ممکن ہو اس طریقۂ کار سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اوّل تو اس میں شرح سود کو حلال کاروبار کے لئے مثالی اور معیاری سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ پسندیدہ بات نہیں، دوسرے اس لئے کہ اس سے اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفے کو فروغ نہیں ملتا، اس لئے کہ اس سے تقسیمِ دولت کے نظام پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو چاہئے کہ وہ اپنے معیار تشکیل دیں۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے اپنی انٹر بینک مارکیٹ تشکیل دیں جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مشترکہ شعبہ بنایا جا سکتا ہے جو کہ حقیقی اثاثوں پر مبنی قابلِ تبادلہ دستاویزات میں سرمایہ کاری کرے، جیسے مشارکہ، اجارہ وغیرہ۔ اگر اس شعبے کے اثاثے حسی اور مادی شکل میں ہیں جیسے کرایہ (Lease) پر دی ہوئی جائیداد اور ساز وسامان اور کاروباری اداروں کے حصص وغیرہ، تو اس شعبے کے یونٹس کی خرید وفروخت ان کے اثاثوں کی صافی مالیت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے جس کا تعین وقفے وقفے سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ یونٹ قابلِ تبادلہ ہوں گے اور انہیں فوری اور وقتی تمویل (Overnight Finance) کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جن بینکوں کے پاس زائد از ضرورت سیولت (Liquidity) ہے وہ ان یونٹس کو خرید سکیں گے اور جب انہیں سیولت دوبارہ حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی وہ انہیں فروخت کر سکیں گے۔ اس بندوبست سے ایک انٹر بینک مارکیٹ وجود میں آ جائے گی اور یونٹس کی مروّجہ قیمت کو مرابحہ اور اجارہ (Lease) میں نفع کے تعین میں حوالے کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکے گا۔

۳۔ خریداری کا وعدہ

اس وقت ماہرینِ شریعت کے درمیان مرابحہ سے متعلق ایک اور موضوع زیرِ بحث یہ ہے کہ بینک / تمویل کار اسی وقت عقدِ بیع میں داخل نہیں ہو سکتا جس وقت عمیل (Client) اس سے مرابحہ فنانس کا مطالبہ کرے، اس لئے کہ مطلوبہ چیز اس وقت بینک کی ملکیت میں نہیں ہوتی، جیسا کہ پہلے وضاحت کی گئی ہے کہ کوئی شخص ایسی چیز نہیں بیچ سکتا جو اس کی ملکیت میں نہیں ہے اور نہ ہی ایسی بیع کر

سکتا ہے جو مستقبل میں وجود میں آئے (Forward Sale)۔لہٰذا اسے لازماً پہلے وہ چیز سپلائی کنندہ سے خریدنی ہوگی، اس کے بعد اس پر حسی یا معنوی قبضہ کر کے اسے اپنے عمیل کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ اگر عمیل اس بات کا پابند نہ ہو کہ تمویل کار یا بینک کے اس چیز کو خرید لینے کے بعد وہ اسے خرید لے گا تو تمویل کار کو ایسی صورت کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے کہ وہ مطلوبہ چیز حاصل کرنے کے لئے کافی خرچہ برداشت کر چکا ہو لیکن عمیل اسے خریدنے سے انکار کر دے۔ یہ چیز ایسی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے کہ مارکیٹ میں اس کی عام طلب نہ ہو اور اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جائے۔ اس صورت میں تمویل کار کو نا قابلِ تحمل نقصان ہو سکتا ہے۔

مرابحہ میں اس مشکل کا حل یوں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عمیل (Client) ایک معاہدے پر دستخط کرے، جس کی رو سے وہ یہ وعدہ کرے کہ جب تمویل کار وہ چیز حاصل کرے گا تو یہ اسے خرید لے گا، بجائے اس کے کہ دوطرفہ طور پر مستقبل کی طرف منسوب بیع (Forward Sale) وجود میں آئے عمیل کی طرف سے خریداری کا یک طرفہ وعدہ ہو رہا ہے جس کا عمیل پابند ہے تمویل کار نہیں، یہ فارورڈ سیل سے مختلف طریقہ ہے۔

اس حل پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یک طرفہ معاہدے سے عمیل پر صرف اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس پر شرعاً عدالت کے ذریعے عمل درآمد نہیں کرایا جا سکتا۔ اس سے ہم ایک اور سوال کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں کہ کیا شریعت کی رو سے یک طرفہ وعدہ قضاءً بھی لازم ہے یا نہیں، عمومی تأثر یہی ہے کہ یہ قضاءً لازم نہیں ہے، لیکن اس تأثر کو اسی طرح قبول کرنے سے پہلے ہم شریعت کے اصل مآخذ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں گے۔

فقہ اسلامی کی کتابوں میں متعلقہ مواد کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فقہاء کے اس مسئلے میں مختلف نقطۂ نظر ہیں جنہیں ذیل میں اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔　بہت سے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا ایک اچھا خلق ہے اور وعدہ کرنے والے کو یہ پورا کرنا چاہئے، اسے پورا نہ کرنا قابلِ مذمت فعل ہے لیکن اسے پورا کرنا نہ تو لازم اور واجب ہے اور نہ ہی عدالت کے ذریعے اسے پورا کرایا جا سکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر نقل کیا گیا ہے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور بعض مالکی فقہاء سے[1] تاہم جیسا کہ آگے بتایا جائے گا بہت سے حنفی اور مالکی فقہاء اور بعض شافعی فقہاء اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتے۔

---

(۱)　دیکھئے عمدۃ القاری، ج۱۲، ص۱۲۱۔ مرقاۃ المفاتیح، ج۴، ص۶۵۳۔ الاذکار للنووی، ص۲۸۲۔ فتح العلی المالک، ج۱، ص۲۵۴۔

۲۔ بہت سے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے اور وعدہ کرنے والے کی اخلاقی کے ساتھ قانونی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ وعدہ ایفاء کرے۔ ان کے مذہب کے مطابق وعدے پر عمل عدالت کے ذریعے بھی کرایا جا سکتا ہے۔ یہ مذہب مشہور صحابی حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ، عمر بن عبدالعزیزؒ، حسن بصریؒ، سعید بن الأشوعؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور امام بخاریؒ کی طرف منسوب ہے۔[۱] بعض مالکی فقہاء کا مذہب بھی یہی ہے۔ ابن العربی اور ابن الشاط نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ معروف شافعی فقیہہ امام غزالیؒ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ وعدہ اگر حتمی طریقے سے کیا گیا ہو تو اسے پورا کرنا واجب ہے۔ یہی رائے ابن شبرمہ کی ہے۔[۲]

بعض مالکی فقہاء نے ایک تیسرا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عام حالات میں تو ایفائے عہد (قضاءً) واجب نہیں ہوتا۔ اگر وعدہ کرنے والے کے وعدے کی وجہ سے دوسرے شخص کو کوئی خرچ برداشت کرنا پڑ جائے یا وہ اس وعدے کی بنیاد پر کوئی بوجھ یا ذمہ داری قبول کر لے تو ایسے وعدے کا ایفا ضروری ہے جس پر اسے عدالت کے ذریعے مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔[۳]

بعض معاصر علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ جن فقہاء نے وعدے کی وجوبی نوعیت کو تسلیم کیا ہے، یہ یک طرفہ ہبہ یا دوسری رضاکارانہ ادائیگیوں کے بارے میں ہے، دوطرفہ تجارتی یا مالیاتی معاہدوں کے بارے میں ان فقہاء نے اس وجوب کو تسلیم نہیں کیا، لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ موقف درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ حنفی اور مالکی فقہاء نے وعدے کے وجوب کی بنیاد پر بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا ہے۔ ''بیع بالوفاء'' بیع کی ایک خاص قسم ہے جس کے ذریعے سے کسی غیر منقولہ جائیداد کا خریدار یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب بائع اسے اس کی قیمت واپس لوٹا دے گا تو وہ اس جائیداد کو دوبارہ بیچ دے گا۔ بیع بالوفاء کے صحیح ہونے پر بحث پہلے باب میں ہو چکی ہے جہاں شرکت متناقصہ کی بنیاد پر ہاؤس فائنانس کے تصور پر گفتگو کی گئی تھی۔ اس بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ اگر دوبارہ خریداری کو اصل اور پہلی بیع کے لئے شرط بنایا جائے تو یہ معاملہ صحیح نہیں ہوگا۔ اگر فریقین نے پہلی بیع غیر مشروط طور پر کی ہے لیکن بائع نے علیحدہ اور مستقل طور پر اس بیچی ہوئی جائیداد کو دوبارہ خریدنے کے وعدے پر دستخط کیے ہیں تو وعدہ کرنے والے پر اس کا ایفاء لازم ہوگا اور عدالت کے ذریعے بھی اس پر عمل کرایا جا سکے گا۔ اس صورت

---

(۱) دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب الشہادات، باب من أمر بانجاز الوعد، ج۱، ص ۳۶۸۔

(۲) الجامع للأحکام القرآن للقرطبی، ج ۱۸، ص ۲۹۔ حاشیہ ابن الشاط علی فروق القرافی، ج ۴، ص ۲۴۔ احیاء علوم الدین للغزالی، ج ۳، ص ۱۳۳۔ المحلی لابن حزم، ج ۸، ص ۲۸۔

(۳) الفروق للقرافی، ج ۴، ص ۲۵۔ فتح العلی المالک، ج ۱، ص ۲۵۴۔

میں ایفاء کے وجوب کو حنفیہ اور مالکیہ دونوں نے تسلیم کیا ہے۔ (۱)

ظاہر ہے کہ اس وعدے کا تعلق ہبہ کے ساتھ نہیں ہے، یہ مستقبل میں بیع کرنے کا ایک وعدہ ہے، اس کے باوجود حنفی اور مالکی فقہاء نے اسے واجب اور بذریعہ عدالت قابلِ نفاذ قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جو فقہاء وعدے کو واجب قرار دیتے ہیں وہ ہبہ وغیرہ کے وعدے کے ساتھ اس حکم کو خاص نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں یہی اصول مستقبل کے کسی دوطرفہ معاہدے کے وعدے پر بھی لاگو ہوگا۔ (۲)

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور احادیث ایفاء عہد کے بارے میں واضح ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے:

"واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا." (بنی اسرائیل: ٣٤)

''اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں (قیامت کے دن) سوال کیا جائے گا۔''

"يا ايها الذين امنوا لم تقولون ما لا تفعلون كبر مقتا عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون." (الصف: ٢، ٣)

''اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو جسے تم کرو نہیں۔''

امام ابوبکر بصاص فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کام کو کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے خواہ وہ عبادات میں سے ہو یا معاملات میں سے، اسے پورا کرنا اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ (۳)

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

"اية المنافق ثلاث: اذا حدث كذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان."

''منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا

(۱) الحطاب: تحریر الکلام، ص ۲۳۹، بیروت، ۱۴۰۴ھ۔

(۲) خیال رہے کہ یہاں وعدہ یک طرفہ ہی ہے، البتہ اس وعدے کے نتیجے میں جو معاہدہ وجود میں آئے گا وہ دوطرفہ بھی ہوسکتا ہے، جیسے بیع۔ مترجم

(۳) الجصاص، احکام القرآن، ج ۳، ص ۴۲۰۔

ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے، جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جاتی ہے تو اس میں خیانت کرتا ہے۔"(۱)

یہ تو صرف ایک مثال ہے، وگرنہ حضور اقدس ﷺ کی احادیث کی ایک بڑی تعداد ایسی موجود ہے جن میں ایفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے اور بغیر معقول عذر کے وعدہ خلافی سے منع کیا گیا ہے۔

ان نصوص سے یہ بات تو واضح ہے کہ وعدہ پورا کرنا واجب ہے البتہ یہ سوال کہ بذریعہ عدالت بھی اس پر عمل کرایا جا سکتا ہے یا نہیں تو یہ وعدہ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ واقعی کچھ وعدے ایسی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں جو بذریعہ عدالت قابلِ نفاذ نہیں ہیں، مثلاً منگنی کے موقع پر فریقین شادی کا وعدہ کرتے ہیں، اس وعدے سے ایک اخلاقی ذمہ داری تو عائد ہو جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ وعدہ عدالت کے ذریعے پورا نہیں کرایا جا سکتا۔ لیکن کاروباری معاملات میں جہاں کسی پارٹی سے کسی چیز کی فروخت یا خریداری کا وعدہ کیا جاتا ہے اور وہ اس کی بنیاد پر کچھ ذمہ داریاں قبول کر لیتا ہے تو یہاں اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس وعدے کو بذریعۂ عدالت قابلِ نفاذ قرار نہ دیا جائے۔ لہٰذا اسلام کی واضح تعلیمات کی روشنی میں، اگر فریقین اس بات پر متفق ہوں کہ یہ وعدہ، کرنے والے پر لازم ہوگا تو یہ قضاءً بھی لازم ہونا چاہئے۔ اس مسئلے کا تعلق صرف مرابحہ کے ساتھ نہیں ہے، اگر تجارتی معاملات میں وعدوں کو قضاءً لازم قرار نہ دیں تو اس سے تجارتی سرگرمیوں کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ایک شخص کسی تاجر کو آرڈر دیتا ہے کہ میرے لئے فلاں چیز منگوالو اور یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تم سے خرید لوں گا، اور وہ تاجر اس وعدے کی بنیاد پر کافی خرچہ برداشت کر کے وہ چیز باہر سے منگوالیتا ہے، اب وعدہ کرنے والے کو اس بات کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے کہ وہ اسے خریدنے سے انکار کر دے، قرآنِ کرم اور سنتِ نبوی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس طرح کے وعدوں کو لازمی قرار دینے سے مانع ہو۔

انہی وجوہ کی بنیاد پر مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے تجارتی معاملات میں وعدوں کو درجِ ذیل شرائط کے ساتھ لازمی قرار دیا ہے۔

۱۔　یہ وعدہ یک طرفہ ہو۔

۲۔　اس وعدہ کی وجہ سے دوسرے شخص نے (جس سے وعدہ کیا گیا ہے) کوئی ذمہ داری اُٹھا لی ہو۔

۳۔　اگر وعدہ کسی چیز کی خرید و فروخت کا ہے تو یہ ضروری ہے کہ طے شدہ وقت پر ایجاب و قبول کے ذریعے عملاً بیع کی جائے، بذاتِ خود وعدے کو بیع نہیں سمجھا جائے گا۔

---

(۱)　صحیح بخاری، کتاب الایمان۔

۴۔ اگر وعدہ کرنے والا اپنے وعدے کو پورا نہیں کرتا تو عدالت اسے مجبور کرے گی کہ یا تو وہ چیز خرید کر اپنا وعدہ پورا کرے یا وہ بائع کو حقیقی نقصان کی ادائیگی کرے۔ اس نقصان میں وہ حقیقی مالی نقصان شامل ہوگا جو عملاً اسے ہوا ہے۔ متوقع اور ممکنہ نفع (Opportunity Cost) کو اس میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

اس لئے یہ جائز ہے کہ عمیل تمویل کار سے یہ وعدہ کرے کہ جب تمویل کار مال سپلائی کرنے والے سے حاصل کر لے گا تو وہ اس سے خرید لے گا۔ اس وعدے کا ایفاء اس پر لازم ہوگا اور مذکورہ طریقے سے عدالت کے ذریعے بھی اس پر عمل کرایا جا سکتا ہے۔ یہ محض وعدہ ہوگا، اسے حقیقی بیع نہیں سمجھا جائے گا، عملاً بیع اس وقت ہوگی جبکہ تمویل کار متعلقہ مال حاصل کرے گا، جس کے لئے ایجاب و قبول ضروری ہوں گے۔

۴۔ قیمتِ مرابحہ کے مقابلے میں سیکورٹی

مرابحہ تمویل سے متعلق ایک اور بحث یہ ہے کہ مرابحہ کی قیمت بعد میں ادا کی جاتی ہوتی ہے، اس لئے فطری بات ہے کہ بائع (تمویل کار) یہ یقین دہانی چاہے گا کہ قیمت بروقت ادا کر دی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے یہ اپنے کلائنٹ سے سیکورٹی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ یہ سیکورٹی رہن، جائیداد پر کسی قسم کے حقِ احتباس وغیرہ کی شکل میں ہو سکتی ہے۔ اس سیکورٹی کے بارے میں چند بنیادی قواعد کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

۱۔ سیکورٹی کا صرف اسی صورت میں مطالبہ کیا جا سکتا ہے جبکہ معاہدے کی وجہ سے کوئی قرض یا ذمہ داری وجود میں آچکی ہو۔ ایسے شخص سے کسی سیکورٹی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا جس پر ابھی تک کوئی قرض نہیں یا اس نے کسی ذمہ داری کو قبول نہیں کیا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مرابحہ تمویل مختلف معاہدوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ مختلف مراحل پر وجود میں آتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں کلائنٹ پر کوئی قرضہ نہیں ہوتا۔ ایسا صرف اسی وقت ہوتا ہے جبکہ تمویل کار متعلقہ چیز اسے ادھار قیمت پر بیچ دے، جس سے دونوں میں قرض خواہ اور مقروض کا تعلق قائم ہو جاتا ہے، اس لئے مرابحہ کے عقد کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ تمویل کار اپنے کلائنٹ سے سیکورٹی کا مطالبہ اسی صورت میں کرے جبکہ عملاً بیع ہو چکی ہو اور قیمت کلائنٹ کے ذمے واجب الادا ہو، اس لئے کہ اس مرحلے پر کلائنٹ مدیون بن چکا ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ کلائنٹ اس مرحلے سے پہلے ہی سیکورٹی مہیا کر دے، لیکن یہ اسی وقت ہونا چاہئے جبکہ مرابحہ کی قیمت متعین ہو چکی ہو۔ اس صورت میں اگر تمویل کار اس سیکورٹی پر قبضہ کر لیتا ہے تو یہ

چیز اس کے ضمان (Risk) میں ہوگی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ چیز عملاً بیع منعقد ہونے سے پہلے تباہ ہو جاتی ہے تو یا تمویل کار کلائنٹ کو اس رہن رکھے ہوئے اثاثے کی بازاری قیمت ادا کرے گا اور مرابحہ کا معاہدہ منسوخ کر دے گا، یا مطلوبہ چیز تو کلائنٹ کو بیچ دے گا لیکن اس کی قیمت میں سے رہن رکھے ہوئے اثاثے کی بازاری قیمت کے برابر کمی کرے گا۔ (۱)

۲۔ یہ بھی جائز ہے کہ بیچی گئی چیز ہی بائع کو بطور توثیق (سیکورٹی) دے دی جائے۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ ایسا کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہے جبکہ خریدار ایک مرتبہ اس خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کر چکا ہو، جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے خریدار اس چیز پر حسی یا معنوی قبضہ کرے گا پھر وہ دوبارہ بائع کو بطور رہن دیدے گا، تاکہ رہن کا عقد بیع کے عقد سے ممتاز ہو جائے، لیکن متعلقہ مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قدیم فقہاء نے پہلے قبضہ کر کے پھر بطور رہن دینے کی شرط نقد سودوں میں لگائی ہے ادھار بیع میں نہیں۔ (۲)

لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ کلائنٹ خریدی ہوئی چیز بطور رہن دینے سے پہلے اس پر خود قبضہ کرے، شرط صرف یہ ہے کہ یہ تعین کر لیا جائے کہ یہ جائیداد کس وقت سے رہن شدہ تصور ہوگی، اس لئے کہ اس خاص متعین وقت سے ہی یہ جائیداد بائع کے قبضے میں پہلے سے مختلف حیثیت میں ہوگی، اس لئے اس کا واضح طور پر تعین ہونا چاہئے۔ مثال کے طور پر یکم جنوری کو ''الف'' نے ''ب'' کو ایک کار پانچ لاکھ روپے میں بیچی۔ قیمت تیس جون کو ادا کی جائے گی۔ ''الف'' نے ''ب'' سے سیکورٹی کا مطالبہ کیا تاکہ قیمت کی بروقت ادائیگی یقینی ہو سکے۔ ''ب'' نے ابھی تک کار پر قبضہ نہیں کیا۔ وہ ''الف'' کو یہ پیشکش کرتا ہے کہ وہ ۲ جنوری سے اس کار ہی کو اپنے پاس بطور رہن رکھ لے۔ اگر یہ کار ۲ جنوری سے پہلے ہلاک ہوگئی تو بیع فسخ ہو جائے گی اور ''ب'' کے ذمے کسی چیز کی ادائیگی نہیں ہوگی، لیکن اگر کار ۲ جنوری کے بعد ہلاک ہوئی تو بیع فسخ نہیں ہوگی، البتہ یہاں وہ اصول لاگو ہوں گے جو کہ رہن رکھی ہوئی چیز کے تباہ ہو جانے کی صورت میں متعین ہیں۔ حنفیہ کے مذہب کے مطابق اس چیز کی بازاری قیمت اور دونوں کے درمیان طے شدہ قیمت میں سے جو کم ہو اس حد تک بائع کار کے نقصانات کا ذمہ دار ہوگا۔ لہٰذا اگر کار کی بازاری قیمت ساڑھے چار لاکھ ہے (جبکہ طے شدہ قیمت پانچ لاکھ تھی) تو بائع

---

(۱) ابن نجیم لکھتے ہیں: انما یصح الرهن بدین ولو موعودا...... ولواخذ الرهن بشرط ان یقرضه کذا، فهلك فی یده قبل ان یقرضه هلك بالأقل من قیمته ومما سمی له من القرض.
(البحر الرائق، ج۸، ص ٤٥٠، طبع مكة)

(۲) اس موضوع پر مفصل بحث میری عربی کتاب ''بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة'' میں مل سکتی ہے۔

خریدار سے صرف باقی ماندہ قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے یعنی پچاس ہزار روپے (ساڑھے چار لاکھ کا نقصان بائع کا سمجھا جائے گا)۔ اگر اس کار کی بازاری قیمت پانچ لاکھ یا اس سے زائد ہے تو بائع مشتری سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ (۱)

یہ تو فقہ حنفی کا نقطۂ نظر تھا، شافعی اور حنبلی فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اگر گاڑی مرتہن (جس کے پاس رہن رکھی گئی ہے جو یہاں بائع ہے) کی غفلت کی وجہ سے تباہ ہوئی ہے تو وہ اس کی بازاری قیمت کی حد تک نقصان برداشت کرے گا، لیکن اگر کار کی تباہی میں اس کی کسی غلطی کا دخل نہیں ہے تو وہ کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہے اور یہ نقصان خریدار برداشت کرے گا اور بائع کو پوری رقم ادا کرے گا۔ (۲)

مذکورہ بالا مثال سے یہ بات واضح ہوگئی کہ "الف" کے کار پر بحیثیت بائع قبضے پر جو احکام مرتب ہوں گے وہ ان احکام سے مختلف ہیں جو بحیثیت مرتہن اس کے قبضے پر مرتب ہوں گے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس وقت کا تعین اچھی طرح کرلیا جائے جب سے وہ کار اس کے پاس مرتہن ہونے کی حیثیت سے ہوگی، ورنہ مختلف حیثیتیں خلط ملط ہو جائیں گی اور کوئی تنازعہ پیدا ہونے کا امکان ہوگا جس سے یہ سیکیورٹی صحیح نہیں رہے گی۔

۵۔ مرابحہ میں ضمانت

مرابحہ تمویل میں بائع، خریدار (کلائنٹ) سے یہ مطالبہ بھی کرسکتا ہے کہ وہ کسی تیسری پارٹی کی ضمانت فراہم کرے گا۔ اگر خریدار مقررہ وقت پر قیمت ادا نہ کرے تو بائع، کفیل (ضامن) کی طرف رجوع کرسکتا ہے، جس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس رقم کی ادائیگی کرے جس کی اس نے ضمانت دی ہے۔ کفالت (ضمانت) کے شرعی احکام پر فقہ کی کتابوں میں تفصیلی بحث کی گئی ہے، تاہم میں اسلامی بینکاری کے حوالے سے دو مسئلوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

---

(۱) اگر بازاری قیمت اور طے شدہ قیمت برابر ہیں یعنی دونوں پانچ لاکھ ہیں تو ظاہر ہے کہ بائع پانچ لاکھ ہی کا ضامن ہے لہٰذا وہ خریدار سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرسکتا، اور اگر بازاری قیمت طے شدہ قیمت سے زائد ہو مثلاً بازاری قیمت چھ لاکھ روپے ہے تو پانچ لاکھ کا تو بائع ضامن ہوگا، لہٰذا پانچ لاکھ جو اس نے خریدار سے لینے تھے ختم ہوگئے اور زائد ایک لاکھ روپے کی مالیت اس کے پاس امانت ہے۔ اگر بغیر تعدی کے کار ہلاک ہوئی ہے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہے لہٰذا خریدار بھی اس لاکھ روپے کا اس سے مطالبہ نہیں کرسکتا۔ البتہ تعدی ثابت ہو جائے تو وہ اس کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ مترجم

(۲) دیکھئے: ابن قدامہ، المغنی، ج ۵، ص ۴۴۲۔ الغزالی، الوسیط، ج ۳، ص ۵۰۹۔ ابن عابدین، ردالمحتار، ج ۵، ص ۳۴۱۔

موجودہ کاروباری ماحول میں ضامن عموماً اصل مدیون سے فیس لیے بغیر کسی ادائیگی کی ضمانت نہیں دیتے۔قدیم فقہی لٹریچر اس بات پر تقریباً متفق ہے کہ کفالت ایک عقد تبرع ہے جس پر کوئی فیس نہیں لی جاسکتی۔زیادہ سے زیادہ ضامن ان حقیقی دفتری اخراجات کا مطالبہ کرسکتا ہے جو اسے ضمانت دینے کے عمل پر اُٹھانے پڑے ہیں۔فیس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جوشخص کسی کو قرض دے رہا ہے وہ قرض دے کر کوئی فیس نہیں لے سکتا،اس لئے کہ یہ فیس ربا اور سود کی تعریف میں داخل ہو جائے گی،جو کہ ممنوع اور ناجائز ہے۔ضمانت دینے والا اس ممانعت میں بطریق اولیٰ داخل ہوگا،اس لئے کہ وہ رقم بطور قرض نہیں دے رہا بلکہ وہ تو اصل مدیون کی طرف سے عدم ادائیگی کی صورت میں اس کی جگہ متعین رقم ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔اگر حقیقتاً رقم دینے والا شخص کوئی فیس وصول نہیں کر سکتا تو جوشخص ادائیگی کا صرف وعدہ کرتا ہے عملاً کوئی ادائیگی نہیں کرتا وہ فیس کیسے لے سکتا ہے۔

فرض کیجئے زید نے عمرو سے سو ڈالر قرض لیے۔عمرو زید سے ضامن مہیا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔بکر زید سے کہتا ہے کہ میں تمہارا قرض عمرو کو ابھی ادا کر دیتا ہوں،لیکن تم بعد کی کسی تاریخ پر مجھے ایک سو دس ڈالر ادا کرنا۔ظاہر ہے کہ زید سے جو دس ڈالر زائد لیے جارہے ہیں وہ چونکہ سود ہیں اس لئے ناجائز ہیں۔اب خالد زید کے پاس آتا ہے کہ میں تمہاری طرف سے ضامن بنتا ہوں،لیکن تمہیں اس کام پر مجھے دس ڈالر دینے ہوں گے۔اگر ہم ضمانت کی فیس کو جائز قرار دے دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بکر عملاً اتنی رقم ادا کرنے کے باوجود دس ڈالر نہیں لے سکتا،اور خالد نے باوجودیکہ عملاً کچھ نہیں دیا،صرف زید کی عدم ادائیگی کی صورت میں محض ادائیگی کا وعدہ کیا ہے،وہ دس ڈالر لے سکتا ہے۔چونکہ یہ صورتِ حال ظاہراً غیر منصفانہ ہے اس لئے قدیم فقہاء نے ضمانت پر فیس لینے سے منع کر دیا ہے تاکہ مذکورہ مثال میں بکر اور خالد کے ساتھ یکساں برتاؤ ہو۔

البتہ بعض معاصر فقہاء مسئلے کو ذرا مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ضمانت اب ایک ضرورت بن چکی ہے،بالخصوص بین الاقوامی تجارت میں،جہاں بائع اور مشتری کی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہوتی اور ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ مال ملتے ہی خریدار کی طرف سے قیمت کی ادائیگی ہو جائے،اس لئے ایک ایسے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے جو ادائیگی کی ضمانت دے،بغیر کسی معاوضے کے مطلوبہ تعداد میں ضمانت فراہم کرنے والوں کی تلاش کرنا انتہائی مشکل ہے،ان حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے موجودہ دور کے بعض علماءِ شریعت ایک مختلف سوچ رکھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ کفالت (ضمانت) پر اُجرت کی ممانعت قرآن وحدیث کی کسی واضح ہدایت پر مبنی نہیں ہے،بلکہ یہ حکم حرمتِ ربا سے مستنبط کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ اس کا ایک ضمنی نتیجہ ہے،مزید یہ کہ ماضی میں ضمانت

سادہ نوعیت کی ہوتی تھی، موجودہ دور میں ضامن کو بہت سا دفتری کام کرنا پڑتا ہے اور متعدد امور کا جائزہ لینا پڑتا ہے، اس لئے ان حضرات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ضمانت پر اجرت کی ممانعت پر بھی اس حوالے سے دوبارہ غور کی ضرورت ہے۔ اس سوال پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور اسے علماء کے وسیع تر فورم پر غور کے لئے رکھا جانا چاہئے، لیکن جب تک اس طرح کے کسی فورم سے واضح فیصلہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک اسلامی مالیاتی اداروں کو ضمانت پر کوئی اجرت دینی چاہئے نہ لینی چاہئے، البتہ ضمانت دینے کے عمل میں جو واقعی اخراجات ہوئے ہیں انہیں پورا کرنے کے لئے معاوضہ لیا اور دیا جا سکتا ہے۔

۶۔ نادہندگی پر جرمانہ

مرابحہ تمویل میں ایک اور مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اگر کلائنٹ قیمت بروقت ادا نہ کرے تو قیمت میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ سودی قرضوں میں تو نادہندگی کے عرصے کے مطابق قرضے کی مقدار بڑھتی رہتی ہے، لیکن مرابحہ تمویل میں جو قیمت ایک مرتبہ متعین ہو جائے اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا، اس پابندی کو بعض اوقات وہ بددیانت کلائنٹ غلط استعمال کرتے ہیں جو جان بوجھ کر قیمت کی بروقت ادائیگی سے گریز کرتے ہیں، اس لئے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ نادہندگی کی وجہ سے انہیں اضافی رقم ادا نہیں کرنی ہوگی۔

مرابحہ کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان ملکوں میں کوئی بڑی مشکل پیدا نہیں ہونی چاہئے جہاں سارے کے سارے بینک اور مالیاتی ادارے اسلامی اصولوں کے مطابق چلائے جاتے ہوں، اس لئے کہ اس صورت میں حکومت یا مرکزی بینک ایسا نظام وضع کر سکتے ہیں جس کے مطابق نادہندگان کو یہ سزا دی جائے کہ انہیں کسی بھی مالیاتی ادارے سے کوئی سہولت حاصل کرنے سے محروم کر دیا جائے، یہ نظام بالقصد نادہندگی کے خلاف ایک رکاوٹ کا کام دے گا، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے، سودی کاروبار کرنے والے مالیاتی اداروں پر مشتمل اکثریت سے الگ تھلک کام کر رہے ہوں وہاں ایسے نظام پر عمل مشکل ہوگا، اس لئے کہ اگر عمیل کو کسی بھی اسلامی بینک سے کوئی سہولت حاصل کرنے سے محروم بھی کر دیا جائے تو وہ روایتی بینکوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے موجودہ دور کے بعض علماء یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جو کلائنٹ جان بوجھ کر ادائیگی میں تاخیر کرے اسے اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ نادہندگی کی وجہ سے اسلامی بینک کو ہونے والے خسارے کا معاوضہ ادا کرے۔ یہ حضرات تجویز کرتے ہیں کہ اس معاوضے کی

مالیت اس منافع کے برابر بھی ہوسکتی ہے، جو اس عرصے میں بینک نے اپنے کھاتہ داروں کو دیا ہے، مثلاً نادہندہ نے مقررہ وقت سے تین ماہ کی تاخیر کر کے قیمت ادا کی ہے۔ اگر ان تین ماہ میں بینک نے اپنے کھاتہ داروں کو پانچ فیصد کے حساب سے نفع دیا ہے تو یہ نادہندہ بھی اصل رقم پر مزید پانچ فیصد بطور خسارے کے معاوضے کے بینک کو ادا کرے گا۔ لیکن جو علماء اس تعویض کو جائز قرار دیتے ہیں وہ اسے مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں:

(۱) ادائیگی کا وقت آجانے کے بعد نادہندہ کو کم از کم ایک ماہ کی مزید مہلت دی جانی چاہئے جس کے دوران اسے ہفتہ وار نوٹس بھیجے جائیں جن میں اسے وارننگ دی جائے کہ وہ قیمت کی ادائیگی کرے وگرنہ اسے خسارے کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔

(۲) یہ بات شک وشبہ سے بالا ہو کہ وہ تاخیر اور ٹال مٹول بغیر کسی صحیح عذر کے کر رہا ہے۔ اگر یہ ظاہر ہو کہ وہ تاخیر غربت کی وجہ سے کر رہا ہے تو اس سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاسکتا۔ درحقیقت جب تک وہ ادائیگی کے قابل نہیں ہو جاتا اسے مہلت دینا ضروری ہے اس لئے کہ قرآنِ کریم واضح طور پر کہتا ہے:

"وان کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة"

''اور اگر وہ (مدیون) تنگ دست ہو تو اسے کشادگی تک مہلت دی جائے۔''

(البقرة: ۲۸۰)

(۳) یہ مالی تعویض صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ جبکہ اسلامی بینک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں کچھ نفع ہوا ہو جو کہ کھاتہ داروں میں تقسیم کیا گیا ہو۔ اگر بینک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ کو اس عرصے میں کوئی نفع نہیں ہوا تو عمیل سے بھی کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ دور کے اکثر علماء نے تعویض کے اس تصور کو قبول نہیں کیا (راقم الحروف کی بھی یہی رائے ہے)۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ یہ تجویز نہ تو شریعت کے اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ ہی نادہندگی کے مسئلے کو حل کرنے کی قابلیت۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مقروض سے جو بھی اضافی رقم لی جائے گی وہ رِبا ہوگی۔ زمانۂ جاہلیت میں جب مقروض مقررہ تاریخ پر ادائیگی سے قاصر ہوتا تو قرض خواہ اس سے عموماً زائد رقم وصول کیا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر عموماً یوں کہا جاتا تھا:

"اما ان تقضی و اما ان تربی"

''یا تو قرض ابھی ادا کر دو یا واجب الادا رقم میں اضافہ کر دو۔''

معاوضہ ادا کرنے کی مذکورہ بالا تجویز اسی نقطۂ نظر کے مشابہ ہے۔

اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مزکورہ تجویز زمانۂ جاہلیت کے اس عمل سے اصولی طور پر مختلف ہے، اس لئے کہ معاوضے والی تجویز میں مقروض کو ایک ماہ کی اضافی مدت دی جاتی ہے تا کہ یہ یقین کیا جا سکے کہ وہ کسی معقول عذر کے بغیر ادائیگی سے گریز کر رہا ہے اور تا کہ اگر یہ واضح ہو جائے کہ عدم ادائیگی کی وجہ غربت یا کوئی مشکل ہے تو اسے معاوضہ سے مستثنیٰ کیا جا سکے۔ لیکن اس تصور کے عملی انطباق کے وقت ان شرطوں کو پورا کرنا انتہائی مشکل ہے، اس لئے کہ ہر مقروض یہی دعویٰ کرے گا کہ اس کی طرف سے بروقت عدم ادائیگی کی وجہ اس کا مالی طور پر اس قابل نہ ہونا ہے۔ کسی مالیاتی ادارے کے لئے ہر کلائنٹ کی مالی حیثیت کے بارے میں تحقیق کرنا اور اس بات کی تصدیق کرنا کہ وہ عدم ادائیگی کے قابل ہے یا نہیں انتہائی مشکل ہے۔ عام طور پر بینک یہی کرتے ہیں کہ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہر کلائنٹ ادائیگی کے قابل ہے، اِلا یہ کہ اسے دیوالیہ قرار دے دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ تجویز میں جو سہولت اور رعایت دی گئی ہے اس سے صرف دیوالیہ لوگ ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے دیوالیہ پن کا وجود بہت نادر ہوتا ہے، اور ایسی نادر صورت میں عام سودی بینک بھی مقروض سے سود وصول نہیں کر سکتے، اس لئے اس تجویز کے مطابق سودی تمویل اور اسلامی تمویل میں کوئی عملی اور بامقصد فرق باقی نہیں رہتا۔

جہاں تک اضافی مدت کا تعلق ہے تو یہ معمولی رعایت ہے جو بعض اوقات روایتی بینکوں کی طرف سے بھی دے دی جاتی ہے۔ بات پھر وہی نکلی کہ سود میں اور تاخیر پر مالی معاوضہ قبول کرنے میں عملی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔

معاوضہ وصول کرنے کے حق میں بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس شخص کی مذمت فرمائی ہے جو بغیر کسی عذر کے مالی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے۔ ایک معروف حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لي الواجد يحل عقوبته و عرضه." (۱)

''جو مالی طور پر خوشحال شخص اپنے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے وہ سزا کا بھی مستحق ہے اور ملامت کا بھی۔''

اس سے استدلال یوں کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو سزا دینے کی اجازت دی ہے، اور سزا مختلف قسم کی ہو سکتی ہے جن میں مالی جرمانہ بھی شامل ہے، لیکن اس استدلال میں اس

---

(۱) صحیح البخاری مع فتح الباری، ج ۵، ص ۶۲۔

حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مالی جرمانہ لگانا جائز ہے[1] تب بھی یہ عدالت کے ذریعے لگایا جاتا ہے اور عموماً حکومت کو ادا کیا جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال کسی کے نزدیک بھی درست نہیں ہے کہ متاثرہ فریق معاملے کا فیصلہ کرنے کی اہل عدالت کے کسی فیصلے کے بغیر خود ہی اپنے ہی مفاد کے لئے جرمانے لاگو کر دے۔

مزید براں یہ کہ اگر اسے ایک سزا ہی تسلیم کیا جائے تو یہ اس صورت میں بھی لاگو ہونی چاہئے جبکہ سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں کوئی نفع نہ ہوا ہو، اس لئے کہ نادہندہ کا جرم تو پایا گیا ہے اور اس کا بینک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں نفع ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

درحقیقت بینک کے نفع کے برابر معاوضہ کی ادائیگی روپے (Money) کے بالقوۃ اور ممکنہ نفع (Opportunity Cost) کے تصور پر مبنی ہے۔ یہ تصور شرعی اصولوں سے میل نہیں رکھتا۔ اسلام ممکنہ نفع کے اس تصور کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے کہ معیشت سے سود کے خاتمے کے بعد روپے (money) کا کوئی متعین نفع باقی نہیں رہتا۔ اس میں جہاں نفع کمانے کی صلاحیت ہے وہیں اسے خسارے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، اور خسارے کا یہ رسک ہی ہے جو اسے نفع حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے۔

یہاں ایک اور بڑا اہم قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جو شخص نادہندگی کا مرتکب ہوتا ہے اسے زیادہ سے زیادہ ایک چور یا غاصب کی طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ چوری اور غصب کے بارے میں شرعی قواعد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چور ایک بہت بڑی سزا یعنی ہاتھ کاٹے جانے کا مستحق ہے لیکن اس سے یہ کبھی بھی مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ متاثرہ شخص کو کسی قسم کا معاوضہ ادا کرے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کی رقم غصب کر لیتا ہے تو اسے بطورِ تعزیر کے سزا تو دی جا سکتی ہے لیکن کسی بھی فقیہہ نے اس پر اصل رقم سے زائد مالیاتی جرمانہ مقرر نہیں کیا جو مالک کو نقصان کی تلافی کے طور پر ادا کیا جائے۔

امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے تو اسے بازاری نرخ کے مطابق اس جگہ کا کرایہ ادا کرنا ہوگا، لیکن اگر اس نے نقد رقم غصب کی ہے تو وہ اتنی ہی رقم لوٹائے گا جتنی اس نے غصب کی ہے، اس سے زائد نہیں۔ [2]

---

(۱) بہت سے قدیم فقہاء نے عدالت کے ذریعے بھی مالی جرمانے (تعزیر بالمال) کو جائز قرار نہیں دیا، لیکن بعض قدیم فقہاء جیسے امام احمدؒ اور امام ابو یوسفؒ اسے جائز قرار دیتے ہیں، اور بہت سے معاصر علماء نے اسی نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے۔

(۲) الشیرازی، المہذب، ج ۱، ص ۳۷۰۔

ان احکام سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ روپے (Money) کے ممکنہ نفع (Opportunity Cost) کو شریعت نے تسلیم نہیں کیا، کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ زر پر متعین نفع نہیں لیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی ذاتی افادیت ہوتی ہے۔

اوپر بیان کردہ وجوہات کی بنیاد پر موجودہ دور کے اکثر علماء نے نادہندہ سے نقصان کی تلافی وصول کرنے کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا۔ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے سالانہ اجلاس میں بھی اس سوال پر تفصیلی غور ہوا، اور اس میں بھی یہی طے ہوا کہ اس طرح کا معاوضہ وصول کرنا شرعاً درست نہیں۔ (۱)

اب تک جو بات ہو رہی تھی وہ اس تعویض مالی کے شرعی جواز یا عدم جواز کے حوالے سے تھی، اب یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ اس تجویز سے نادہندگی کا مسئلہ بالکل حل نہیں ہوگا، بلکہ اس سے مقروض کا جتنی چاہے نادہندگی کا حوصلہ بڑھے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس تجویز کے مطابق نادہندہ کو جس معاوضے کی ادائیگی کے لئے کہا جائے گا وہ اس نفع کے برابر ہوگا جو نادہندگی کے اس عرصے میں کھاتہ داروں کو حاصل ہوا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ کھاتہ داروں کو حاصل ہونے والا نفع اس شرح منافع سے ہمیشہ کم ہوتا ہے جو مرابحہ کے معاہدے میں کلائنٹ کو ادا کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہ کلائنٹ جتنا نفع نادہندگی سے پہلے دے رہا تھا نادہندگی کے بعد اس سے کافی کم ادا کر رہا ہوگا، لہٰذا وہ جان بوجھ کر یہ رقم ادا کرنا قبول کرے گا اور اصل قیمت ادا نہیں کرے گا بلکہ اسے کسی زیادہ نفع بخش کام میں لگا دے گا۔ فرض کیجئے چھ ماہ کے ایک مرابحہ معاہدے میں پندرہ فیصد سالانہ کے حساب سے نفع طے ہوا، اور کھاتہ داروں کو جو نفع دیا گیا ہے وہ دس فیصد سالانہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ ادائیگی کے بعد بھی اگر کلائنٹ مزید چھ ماہ کے لئے یہ قیمت اپنے پاس رکھتا ہے اور ادا نہیں کرتا تو اسے سالانہ دس فیصد کے حساب سے معاوضہ ادا کرنا ہوگا، جو کہ اصل مرابحہ کی شرح منافع یعنی پندرہ فیصد سے بہت کم ہے۔ اس صورت میں وہ قیمت ادا نہیں کریگا اور مزید چھ ماہ کے لئے کم شرح منافع پر یہ سہولت حاصل کر لے گا۔

متبادل تجویز

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بینک یا مالیاتی ادارہ اس مسئلے کو کیسے حل کرے، اگر نادہندہ سے بھی کچھ وصول نہ کیا جائے تو اس سے بددیانت شخص کو مزید رغبت ملے گی کہ وہ مسلسل نادہندگی کا مرتکب ہوتا رہے، تو اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔

(۱) قرارداد نمبر ۵۳ سالانہ اجلاس پنجم، شمارہ نمبر: ۶، ج ۱، ۴۴۷۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس مسئلے کا اصل حل یہ ہے کہ ایسا نظام وجود میں لایا جائے جہاں نادہندگان کو یہ سزا دی جائے کہ وہ مستقبل میں تمام مالیاتی سہولتوں سے محروم ہو جائیں، لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا یہ صرف وہیں ہوسکتا ہے جہاں پورا بینکاری نظام اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو، یا اسلامی بینکوں کو نادہندگان کے خلاف ضروری تحفظ فراہم کیا گیا ہو، اس لئے جب تک یہ ہدف حاصل نہیں کر لیا جاتا ہمیں کسی اور متبادل کی ضرورت ہے۔

اس مقصد کے لئے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مرابحہ کے عقد میں داخل ہوتے وقت عمیل یہ ذمہ داری قبول کرے کہ وقت پر عدم ادائیگی کی صورت میں وہ بینک کے انتظام میں چلنے والے ایک خیراتی فنڈ میں ایک متعین رقم جمع کرائے گا۔ اس میں یہ یقین دہانی ضروری ہے کہ اس رقم کا کوئی بھی حصہ بینک کی آمدن کا جز نہیں بنے گا۔ بینک اس مقصد کے لئے ایک خیراتی فنڈ قائم کرے گا اور اس مد میں حاصل ہونے والی رقم کو صرف اور صرف شریعت کے مطابق خیراتی مقاصد کے لئے ہی خرچ کیا جائے گا۔ بینک اس خیراتی فنڈ سے مستحقین کو بلاسود قرضے بھی دے سکتا ہے۔

یہ تجویز بعض مالکی فقہاء کے بیان کردہ ایک فقہی قاعدے پر مبنی ہے۔ بعض مالکی فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر مقروض سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بروقت عدم ادائیگی کی صورت میں اضافی رقم ادا کرے گا تو یہ صورت تو شرعاً جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ سود لینے کے مترادف ہے، لیکن قرض دہندہ کو بروقت ادائیگی کی یقین دہانی کرانے کے لئے مقروض یہ ذمہ داری قبول کرسکتا ہے کہ وہ بروقت عدم ادائیگی کی صورت میں کچھ رقم بطور خیرات دے گا۔ یہ درحقیقت یمین (قسم) کی ایک صورت ہے جو کسی شخص کی طرف سے خود اپنے اوپر عائد کردہ ایک سزا ہے تاکہ وہ خود کو نادہندی سے بچا سکے۔ عام حالات میں اس طرح کی یمین (قسم) سے اخلاقی اور دینی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور عدالت کے ذریعے اس پر عمل درآمد نہیں کرایا جا سکتا، لیکن بعض مالکی فقہاء کے نزدیک اسے قضاءً بھی لازم قرار دیا جا سکتا ہے[1] اور قرآن وسنت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس طرح کی یمین کو عدالت کے ذریعے قابلِ عمل قرار دینے میں مانع ہو، لہٰذا جہاں واقعتاً ضرورت ہو وہاں اس نقطۂ نظر پر عمل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے درجِ ذیل نقاط کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اس تجویز کا مقصد صرف یہ ہے کہ مقروض پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ بروقت اپنے واجبات ادا کرے، اس کا مقصد قرض دہندہ / تمویل کار کی آمدن میں اضافہ کرنا یا اسے متوقع منافع (Opportunity Cost) کا معاوضہ ادا کرنا نہیں ہے، اس لئے یہ بات یقینی بنانا ضروری ہے کہ

(۱) الحطاب، تحریر الکلام، ص ۱۷۶، بیروت، ۱۴۰۴ھ۔

اس جرمانے کا کوئی حصہ کسی بھی صورت میں بینک کی آمدن کا حصہ نہیں بنے گا، اور نہ ہی اس کے ذریعے ٹیکس ادا کیے جائیں گے اور نہ ہی انہیں تمویل کار کی کسی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

۲۔ چونکہ جرمانے کی اس رقم کا بینک بطور اپنی آمدن کے مالک نہیں ہے بلکہ یہ خیراتی مقاصد کے لئے استعمال ہوگی اس لئے یہ کوئی بھی ایسی رقم ہوسکتی ہے جو مقروض رضامندی سے قبول کرے، اس کا تعین سالانہ فیصد کے حساب سے بھی ہوسکتا ہے، اس لئے یہ رقم، بالقصد نادہندگی کے خلاف حقیقی تحفظ کا کام دے گی، بخلاف مالی معاوضے کی سابقہ تجویز کے، کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا وہ نادہندگی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

۳۔ چونکہ یہ جرمانہ اصل کے اعتبار سے کلائنٹ کی خود اپنے اوپر عائد کی ہوئی ایک قسم ہے، ایسا جرمانہ نہیں ہے جس کا تمویل کار کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہو اس لئے معاہدے میں اس تصور کا انعکاس ضروری ہے، اس لئے جرمانے سے متعلقہ شق کے الفاظ کچھ اس طرح کے ہونے چاہئیں:

> ''کلائنٹ بذریعہ ہذا یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ اگر وہ اس معاہدے کی رو سے واجب الادا رقم کا کوئی حصہ بروقت ادا نہیں کرتا تو وہ بینک کے زیرِ انتظام خیراتی اکاؤنٹ / فنڈ میں اتنی رقم جمع کرائے گا جس کا حساب عدم ادائیگی کے ہر دن کے بدلے میں ...... % سالانہ کی بنیاد پر کیا جائے گا، اِلا یہ کہ وہ ایسی شہادت سے جو بینک / تمویل کار کے نزدیک قابلِ اطمینان ہو یہ ثابت کردے کہ نادہندگی کا سبب غربت یا کوئی ایسا سبب تھا جو اس کے اختیار سے باہر تھا۔''

۴۔ چونکہ یہ خیراتی کام کی قسم ہے اس لئے اصل میں تو یہ بات بھی جائز تھی کہ کلائنٹ مقررہ رقم خود اپنی مرضی سے کسی خیراتی کام میں خرچ کردے، لیکن یہ بات یقینی بنانے کے لئے کہ وہ واقعی اس رقم کی ادائیگی کردے گا معاہدے میں بینک / تمویل کار کے زیرِ انتظام چلنے والے خیراتی فنڈ یا اکاؤنٹ کا تعین کیا گیا ہے، اس طرح متعین طور پر ذمہ داری قبول کرنا شریعت کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہے، لیکن یہ بہرحال ضروری ہے کہ بینک یا مالیاتی ادارہ اس مقصد کے لئے ایک مستقل فنڈ یا کم از کم مستقل اکاؤنٹ کا انتظام کرے اور اس اکاؤنٹ میں جمع ہونے والی رقم اچھی طرح طے شدہ خیراتی کاموں میں خرچ ہونی چاہئے جو کلائنٹ / مدیون کو معلوم ہوں۔

اب اسلامی مالیاتی اداروں کی بڑی تعداد میں اس تجویز پر کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔

۶۔ مرابحہ میں رول اوور کی کوئی گنجائش نہیں

ایک اور ضابطہ جس کا ذہن میں رہنا اور اس پر عمل کیا جانا بہت ضروری ہے یہ ہے کہ مرابحہ کے معاملے میں مزید اگلی مدت کے لئے رول اوور (Roll Over) کی گنجائش نہیں ہے۔[1] سود پر مبنی تمویل میں اگر کسی بینک کا کلائنٹ کسی وجہ سے مقررہ وقت پر قرض ادا نہیں کرسکتا تو وہ بینک سے درخواست کرسکتا ہے کہ وہ اس کے قرضے کی سہولت میں ایک اور متعین مدت کے لئے توسیع کردے۔ اگر بینک اس سے متفق ہو تو اس سہولت کو باہمی طور پر طے پانے والی شرائط پر رول اوور کردیا جاتا ہے جس کی رو سے نئی مدت میں نئی شرح سود لاگو ہوگی۔ عملاً اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اتنی ہی مقدار میں ایک نیا قرضہ (نئی شرح سود پر) مقروض کو دوبارہ دے دیا گیا ہے۔

بعض اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے جو مرابحہ کے تصور کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے اور اسے سودی تمویل کی طرح کا محض ایک طریقۂ تمویل سمجھتے ہیں انہوں نے رول اوور کا تصور مرابحہ میں بھی استعمال کرنا شروع کردیا۔ اگر کلائنٹ ان سے درخواست کرتا ہے کہ مرابحہ کی تاریخ ادائیگی میں توسیع کردیں تو یہ بینک اس مرابحہ کو رول اوور کردیتے اور ادائیگی کے وقت میں مزید مارک اپ کی شرط کے ساتھ اضافہ کردیتے ہیں۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسی سامان (Commodity) پر ایک اور مرابحہ ہو گیا ہے (یعنی بینک نے وہی چیز کلائنٹ کو نئے نفع کے ساتھ بیچ دی ہے)۔ یہ عمل شریعت کے طے شدہ اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ مرابحہ کوئی قرض نہیں ہے، بلکہ ایک چیز کی بیع ہے جس کی قیمت کی ادائیگی ایک مقررہ تاریخ تک مؤخر کردی گئی ہے۔ جب ایک مرتبہ یہ چیز بک گئی تو اس کی ملکیت کلائنٹ کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ اب یہ بیچنے والے (بینک) کی ملکیت نہیں رہی۔ بیچنے والا قانونی طور پر صرف اس کی قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے جو کہ خریدار کے ذمے واجب الاداء دین (Debt) ہے، اس لئے انہی فریقین کے درمیان اسی چیز کی دوبارہ بیع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رول اوور (Roll Over) خالص اور سادہ سود ہے، اس لئے کہ یہ بیع مرابحہ سے پیدا ہونے والے دین (Debt) پر اضافی رقم لینے کا معاہدہ ہے۔

---

(۱) (Roll Over) کی اصطلاح کی وضاحت خود اگلی سطور سے ہو رہی ہے۔ (مترجم)

۷۔ وقت سے پہلے ادائیگی کی وجہ سے رعایت

بعض اوقات مدیون (Debtor) مقرر تاریخ سے پہلے ادائیگی کرنا چاہتا ہے، اس صورت میں وہ مقررہ مؤجل قیمت میں کمی کا بھی خواہش مند ہوتا ہے، کیا اس کی قبل از وقت ادائیگی کی وجہ سے اسے رعایت دینے کی شرعاً گنجائش ہے، اس سوال پر قدیم فقہاء نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اسلام کے قانونی لٹریچر میں یہ مسئلہ "ضع و تعجل" (دین میں کمی کرو اور جلدی وصول کرلو) کے عنوان سے معروف ہے۔ بعض قدیم فقہاء نے اس بندوبست کو جائز قرار دیا ہے، لیکن ائمہ اربعہ سمیت اکثر فقہاء کے نزدیک اگر قبل از وقت ادائیگی کے لئے اس کمی کو شرط قرار دیا جائے تو جائز نہیں ہے۔[۱]

جن فقہاء کے نزدیک یہ انتظام جائز ہے ان کا نقطہ نظر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث پر مبنی ہے کہ جب بنونضیر کے یہودیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تو کچھ لوگ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ نے تو انہیں جلاوطن ہونے کا حکم دے دیا ہے لیکن کچھ لوگوں نے ان یہودیوں کے قرضے دینے ہیں جن کی تاریخِ ادائیگی ابھی تک نہیں آئی، اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان یہودیوں سے جو قرض خواہ تھے فرمایا:

"ضعوا و تعجلوا."[۲]

''اپنے قرضوں میں کمی کرو اور جلدی وصول کرلو۔''

اکثر فقہاء اس حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے، خود امام بیہقی جنہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے، نے صراحۃً کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی بنونضیر کی جلاوطنی ہجرت کے دوسرے سال میں ہوئی تھی، جبکہ رِبا کی حرمت ابھی نازل نہیں ہوئی تھی۔

نیز یہ کہ واقدی نے روایت کیا ہے کہ بنونضیر سودی قرضے دیا کرتے تھے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انتظام کی اجازت دی تھی وہ یہ تھا کہ قرض خواہ سود چھوڑ دیں اور مدیون اصل سرمایہ جلدی ادا کردیں۔ واقدی نے روایت کیا ہے کہ بنونضیر کے ایک یہودی سلام بن ابی حقیق نے اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو اسّی دینار دیئے ہوئے تھے جو کہ ایک سال بعد مزید چالیس دینار کے ساتھ واجب الادا تھے۔

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی، ج۴، ص۱۷۴، ۱۷۵، تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو: بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ، ص۲۵۔

(۲) البیہقی، السنن الکبری، ج۶، ص۲۸۔

اس طرح ایک سال بعد حضرت اسید رضی اللہ عنہ کے ذمہ سلام یہودی کے ۱۲۰ دینار واجب الادا تھے۔ اس مذکورہ بندوبست کے بعد حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے سلام کو اصل سرمایہ یعنی اسّی دینار ادا کر دیئے اور سلام باقی سے دستبردار ہوگیا۔ (۱)

ان وجوہات کی بنیاد پر اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر قبل از وقت ادائیگی میں دین میں کمی کی شرط لگائی گئی ہے تو یہ جائز نہیں ہے، البتہ اگر جلدی ادائیگی کے لئے یہ شرط نہیں ہے اور قرض خواہ رضا کارانہ طور پر اپنی مرضی سے رعایت دے دیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

یہی نقطۂ نظر اسلامی فقہ اکیڈمی نے اپنے ایک سالانہ اجلاس میں اختیار کیا ہے۔ (۲)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک اسلامی بینک یا مالیاتی ادارے میں طے پانے والے مرابحہ کے عقد میں اس طرح کی رعایت عقد میں طے نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی کلائنٹ اپنے حق کے طور پر اس کا مطالبہ کرسکتا ہے، البتہ اگر بینک یا مالیاتی ادارہ اپنی مرضی سے اس طرح کی چھوٹ دے دیتا ہے تو یہ بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے، خاص طور پر جبکہ کلائنٹ محتاج شخص ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک غریب کسان نے ٹریکٹر یا زرعی بیج وغیرہ مرابحہ کی بنیاد پر خریدے تو بینک کو چاہئے کہ وہ رضا کارانہ طور پر جلدی ادائیگی کی صورت میں اسے رعایت دیدے۔

۸۔ مرابحہ میں لاگت کا حساب

یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ مرابحہ کا عقد اسلامی بیع کے تصور پر مشتمل ہے جس میں اصل لاگت پر منافع شامل کیا گیا ہو، اس لئے مرابحہ وہیں کارآمد ہوسکتا ہے جہاں بائع بیچی جانے والی چیز پر آنے والی لاگت کا پورا پورا حساب کرسکتا ہو۔ اگر لاگت کا پورا پورا حساب نہ کیا جاسکتا ہو تو مرابحہ ممکن نہیں ہوگا، اس صورت میں بیع مساومہ ہی ہوسکتی ہے (یعنی ایسی بیع جس میں اصل لاگت کا حوالہ نہ ہو)۔

اس اصول سے ہم ایک اور ضابطے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں وہ یہ کہ مرابحہ اسی کرنسی پر مبنی ہونا چاہئے جس کے ذریعے سے بائع نے اس چیز کو خریدا ہے۔ اگر اس نے وہ چیز پاکستانی روپے میں خریدی ہے تو اگلی بیع بھی پاکستانی روپے پر ہی مبنی ہونی چاہئے۔ اگر پہلی بیع امریکی ڈالرز پر ہوئی ہے تو مرابحہ بھی امریکی ڈالرز پر مبنی ہونا چاہئے، تاکہ صحیح لاگت کا تعین ہوسکے۔

---

(۱) الواقدی، المغازی، ج ۱، ص ۳۷۴۔

(۲) قرارداد نمبر ۶۶، اجلاس ششم، مجلہ نمبر ۷، ج ۲، ص ۲۱۷۔

لیکن بین الاقوامی تجارت میں دونوں بیعوں کا ایک ہی کرنسی پر مبنی ہونا مشکل ہوسکتا ہے۔ کلائنٹ کو جو چیز بیچی جاتی ہے اگر وہ دوسرے ملک سے درآمد کی جارہی ہے، جبکہ آخری خریدار پاکستان میں ہے تو اصل بیع کی قیمت غیر ملکی کرنسی میں ادا کی جارہی ہوگی اور دوسری بیع کا تعین پاکستانی روپوں میں ہوگا۔

اس صورتِ حال کا حل دو طریقوں سے نکالا جاسکتا ہے، پہلا یہ کہ اگر خریدار متفق ہو اور اس ملک کے قوانین بھی اس کی اجازت دیتے ہوں تو دوسری بیع بھی ڈالرز میں ہوسکتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر بائع (بینک) نے وہ چیز پاکستانی روپے کو ڈالر میں تبدیل کرا کے خریدی ہے تو پاکستانی روپے کی وہ مقدار جو اسے ڈالرز تبدیل کرانے کے لئے ادا کرنی پڑی ہے اسے اصل لاگت والی قیمت شمار کیا جاسکتا ہے اور مرابحہ میں اس پر منافع کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض صورتوں میں بینک وہ چیز باہر سے خریدتا ہے اور قیمت تین ماہ بعد یا قسطوں میں ادا کرنا ہوتی ہے، اور وہ اصل فراہم کنندہ کو قیمت کی پوری ادائیگی سے پہلے وہ چیز اپنے کلائنٹ کو بیچ دیتا ہے۔ چونکہ بینک قیمت کی ادائیگی ڈالرز میں کرے گا اور اتنے ڈالرز کے مقابلے میں پاکستانی روپے کتنے ہوں گے اس کا علم اس وقت نہیں ہوسکتا جس وقت وہ چیز کلائنٹ کو بیچی جارہی ہو، چونکہ ڈالر اور پاکستانی روپے کی قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ایسا ہوسکتا ہے کہ بینک کو اس سے زیادہ رقم ادا کرنی پڑ جائے جتنا مرابحہ کرتے وقت اندازہ لگایا تھا۔ مثال کے طور پر مرابحہ کرتے وقت ایک امریکی ڈالر چالیس روپے کا تھا، مرابحہ کی قیمت کا تعین بھی اسی ریٹ کے حوالے سے کیا گیا تھا، لیکن جب بینک نے اصل فراہم کنندہ کو قیمت ادا کی تو ڈالر کا ریٹ بڑھ کر اکتالیس روپے ہو چکا تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بینک کی لاگت میں ۲٫۵ فیصد اضافہ ہوگیا ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے بعض مالیاتی ادارے مرابحہ کے معاہدے میں یہ شرط رکھ دیتے ہیں کہ کرنسی ریٹ میں اس طرح کے اُتار چڑھاؤ کی صورت میں اضافی لاگت کلائنٹ برداشت کرے گا۔ لیکن قدیم فقہاء کے مطابق اس طرح کی شرط پر مرابحہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں بیع کے وقت قیمت (ثمن) میں جہالت پائی جاتی ہے اور یہ جہالت تین ماہ بعد تک اس وقت تک باقی رہتی ہے جبکہ خریدار (بینک) فراہم کنندہ کو قیمت کی ادائیگی کرے گا۔ اس طرح کی جہالت کی وجہ سے عقد غیر صحیح ہو جاتا ہے، اس لئے اس مسئلے کے حل کے لئے بینک کے پاس تین راستے ہیں:

(۱) بینک وہ چیز L/C at sight کی بنیاد پر خرید لے (جس میں خریدار کو مال پہنچتے ہی ادائیگی کرنا ہوتی ہے) اور بینک اپنے کلائنٹ کے ساتھ بیع کرنے سے پہلے قیمت کی ادائیگی کر دے۔ اس

صورت میں کرنسی ریٹ میں اُتار چڑھاؤ کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ مرابحہ کی قیمت کا تعین اس دن کے کرنسی نرخ کے مطابق ہوگا جس دن بینک نے فراہم کنندہ (Supplier) کو قیمت کی ادائیگی کی ہے۔

(۲) بینک مرابحہ کی قیمت کا تعین بھی پاکستانی روپے کی بجائے امریکی ڈالرز میں کرے تاکہ کلائنٹ مرابحہ کی مؤجل قیمت کی ادائیگی بھی امریکی ڈالرز میں کرے، اس صورت میں بینک اپنے کلائنٹ سے امریکی ڈالرز وصول کرنے کا حق دار ہوگا، اس لئے ڈالر کی قیمت میں اُتار چڑھاؤ کا خطرہ بھی خریدار (کلائنٹ) کو اُٹھانا پڑے گا۔

(۳) مرابحہ کی بجائے سودا مساومہ کی بنیاد پر ہو (یعنی ایسی بیع جس میں اصل لاگت کا حوالہ نہیں ہوتا) اور قیمت اس انداز سے متعین کی جائے کہ وہ کرنسی ریٹ میں متوقع کمی بیشی کا بھی احاطہ (Cover) کرلے۔

۹۔ مرابحہ کس چیز پر ہوسکتا ہے

وہ اشیاء جن کی نفع پر بیع ہوسکتی ہے ان پر مرابحہ بھی ہوسکتا ہے، اس لئے کہ مرابحہ بھی بیع ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا کسی کمپنی کے حصص کی بھی مرابحہ کی بنیاد پر خرید وفروخت ہوسکتی ہے، اس لئے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق کمپنی کا شیئر اس کے حامل کی کمپنی کے اثاثہ جات میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر کمپنی کے اثاثہ جات کی بیع منافع پر ہوسکتی ہے تو اس کے حصص کو بھی بطور مرابحہ بیچا جاسکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ عقد میں بیع کی تمام شرائط جو پہلے بیان کی گئی ہیں وہ پوری ہوں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ بائع پہلے شیئرز پر ان کے حقوق وواجبات کے ساتھ قبضہ حاصل کرے پھر انہیں اپنے کلائنٹ کو بیچے، Buy Back یا شیئرز کو ان پر قبضہ کیے بغیر بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اس کے برعکس جن چیزوں کی بیع نہیں ہوسکتی ان پر مرابحہ بھی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کرنسیوں کے باہمی تبادلے میں مرابحہ ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ کرنسیوں کی ایک دوسرے کے ساتھ بیع یا تو نقد ہونی چاہئے یا ادھار ہونے کی صورت میں اس بازاری قیمت پر ہونی چاہئے جو سودا طے پانے کے دن مروّج تھی۔[1] اسی طرح وہ تجارتی دستاویزات جو ایسے قرض کی نمائندگی کرتے ہوں جو حامل کے لئے قابلِ وصول ہے ان کی خرید وفروخت بھی لکھی ہوئی قیمت پر ہی ہوسکتی ہے، اس لئے اس طرح کی

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میری عربی کتاب ''احکام الاوراق النقدیۃ'' (اس کا اُردو ترجمہ ''کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور کتاب ''فقہی مقالات'' میں بھی شامل ہے۔)

دستاویزات میں بھی مرابحہ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ہر ایسا کاغذ جو حامل کو جاری کنندہ کی طرف سے متعین رقم کی وصولی کا حقدار بناتا ہے اس کی خرید وفروخت نہیں ہوسکتی۔ ان کے مبادلے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ یہ مبادلہ قیمت اسمیہ (Face Value) پر ہو، لہٰذا مرابحہ کی بنیاد پر ان کی بیع نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ مرابحہ میں ادائیگی کو ری شیڈول کرنا

اگر خریدار / کلائنٹ معاہدۂ مرابحہ میں طے شدہ تاریخ پر ادائیگی کے کسی وجہ سے قابل نہ ہو تو وہ بعض اوقات بائع / بینک سے درخواست کرتا ہے کہ قسطوں کو ری شیڈول کر دیا جائے۔ روایتی بینکوں میں تو قرضے عموماً اضافی سود کی بنیاد پر ری شیڈول کیے جاتے ہیں، لیکن مرابحہ کی ادائیگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر قسطوں کو ری شیڈول کیا جاتا ہے تو ری شیڈولنگ کی وجہ سے اضافی رقم نہیں لی جا سکتی، مرابحہ کی واجب الادا قیمت اتنی ہی اور اسی کرنسی میں رہے گی۔

بعض اسلامی بینکوں کی یہ تجویز ہے کہ مرابحہ کی قیمت کو ایسی مضبوط کرنسی میں ری شیڈول کیا جائے جو کہ اس کرنسی سے مختلف ہو جس میں اصل مرابحہ طے پایا تھا۔ اس تجویز کا مقصد مضبوط کرنسی کی قیمت میں اضافے کے ذریعے سے بینک کو معاوضہ دلانا ہے۔ یہ فائدہ چونکہ ری شیڈولنگ کے ذریعے حاصل کیا جارہا ہے اس لئے یہ جائز نہیں ہے۔ ری شیڈولنگ لازماً اسی کرنسی اور اسی مقدار میں ہونی چاہئے۔ البتہ ادائیگی کے وقت خریدار بائع کی رضامندی سے بطور مبادلہ کے مختلف کرنسی میں اسی دن (یعنی ادائیگی والے دن) کے ریٹ کے مطابق ادائیگی کرسکتا ہے، لیکن جس دن عقد ہوا تھا اس دن کے ریٹ کے مطابق یہ تبادلہ نہیں ہوسکتا۔

۱۱۔ مرابحہ کو سیکورٹیز میں تبدیل کرنا

مرابحہ ایک عقد ہے جسے قابلِ تبادلہ دستاویزات میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ثانوی بازار (Secondary Market) میں خرید وفروخت ہو سکے۔ اس کی وجہ واضح ہے، اگر خریدار / کلائنٹ ایسی دستاویز پر دستخط کر دیتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بائع / تمویل کار کی طرف اتنی رقم کا مقروض ہے تو یہ کاغذ زر کے اس قرض کی نمائندگی کرتا ہے جو اس سے وصول کیا جانا ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسی رقم کی نمائندگی کرتا ہے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے، لہٰذا اس دستاویز کی تیسرے فریق کے ہاتھ بیع کرنا زر (Money) کی بیع ہی ہے، اور یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ جب

زر کا تبادلہ اسی کرنسی کے زر کے ساتھ ہو تو یہ ضروری ہے کہ یہ تبادلہ برابر برابر ہو، کم یا زیادہ قیمت پر اس کی بیع نہیں ہو سکتی، لہٰذا مرابحہ کے نتیجے میں جو زر کی ذمہ داری پیدا ہوئی ہے اس کی نمائندگی کرنے والے کاغذ سے قابلِ تبادلہ دستاویز وجود میں نہیں آ سکتی۔ اگر اس میں کاغذ کا تبادلہ ہو تو وہ لکھی ہوئی قیمت پر ہی ہونا چاہئے، تاہم اگر کوئی ملاجلا شعبہ موجود ہو جو مختلف معاہدوں مثلاً مشارکہ، لیزنگ اور مرابحہ پر مشتمل ہو تو اس مشترکہ شعبے کی بنیاد پر قابلِ تبادلہ سرٹیفکیٹ جاری کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان شرطوں کا لحاظ رکھ کر جن پر ''اسلامی فنڈز'' کے باب میں تفصیلی گفتگو ہوگی۔

مرابحہ کے استعمال میں چند بنیادی غلطیاں

مرابحہ کے تصور اور اس سے متعلقہ مباحث کو بیان کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بنیادی غلطیوں کی وضاحت کر دی جائے جو عام طور پر اسلامی مالیاتی اداروں سے مرابحہ کے تصور پر عمل کرتے وقت ہو جاتی ہیں۔

۱۔ پہلی اور سب سے زیادہ قابلِ اعتراض غلطی یہ مفروضہ قائم کرنا ہے کہ مرابحہ ایک عمومی طریقۂ تمویل ہے جسے ان تمام انواع کی تمویل کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو روایتی بینک اور غیر مصرفی تمویلی ادارے (NBFIs) کرتے ہیں۔ اسی غلط مفروضے کی بنیاد پر بعض بینکوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ روزمرہ کے کاروباری اخراجات (Over Head Expenses) کی تمویل کے لئے بھی مرابحہ کو استعمال کرتے ہیں، جیسے عملے کی تنخواہوں کی ادائیگی، بجلی کے بلوں کی ادائیگی وغیرہ، اسی طرح ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے جو کہ اس کمپنی نے دوسروں کو ادا کرنے ہیں۔ یہ عمل قطعاً ناقابلِ قبول ہے، اس لئے کہ مرابحہ وہیں استعمال ہو سکتا ہے جہاں کلائنٹ کوئی چیز خریدنا چاہتا ہو۔ اگر کسی اور مقصد کے لئے فنڈز درکار ہیں تو وہاں مرابحہ قابلِ عمل نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں ضرورت کی نوعیت کے مطابق مشارکہ، لیزنگ وغیرہ مناسب طریقہ ہائے تمویل کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بعض صورتوں میں کلائنٹ مرابحہ کے کاغذات پر صرف فنڈز کے حصول کے لئے دستخط کرتا ہے۔ اس کا مقصد ان فنڈز سے کوئی متعین چیز خریدنا نہیں ہوتا، اسے غیر متعین مقاصد کے لئے فنڈز درکار ہوتے ہیں، لیکن رسمی دستاویزات کی ضرورت پوری کرنے کے لئے وہ مصنوعی طور پر کسی چیز کا نام ذکر کر دیتا ہے، رقم وصول کرنے کے بعد وہ اسے جہاں چاہتا ہے خرچ کر لیتا ہے (اور وہ چیز خریدتا نہیں ہے)۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک مصنوعی اور جعلی معاملہ ہے۔ اسلامی تمویل کاروں کو اس کے بارے میں

بہت محتاط رہنا چاہئے۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ یقین حاصل کریں کہ کلائنٹ واقعی وہ چیز خریدنا چاہتا ہے جس کی بنیاد پر مرابحہ ہو رہا ہے۔ جو بااختیار لوگ مرابحہ کی سہولت کی منظور دیتے ہیں انہیں اس بات کی یقین دہانی ضرور حاصل کرنی چاہئے اور یہ بات یقینی بنانے کے لئے کہ معاملہ اصلی ہے تمام اقدامات کرنے چاہئیں۔ مثلاً:

(۱) بجائے اس کے کہ کلائنٹ کو (وہ چیز خریدنے کے لئے) فنڈز دے دیئے جائیں بینک کو چاہئے کہ فراہم کنندہ کو براہِ راست ادائیگی کر دے۔

(۲) جہاں فنڈز کے بارے میں کلائنٹ پر ہی اعتماد کرنا ضروری ہو کہ وہ یہ چیز بینک کی طرف سے خریدے تو اسے چاہئے کہ انوائس یا کوئی اور دستاویزی ثبوت تمویل کار کو پیش کرے۔

(۳) جہاں اوپر ذکر کردہ دونوں تقاضوں کو پورا نہ کیا جا سکے تو مالیاتی ادارے کو چاہئے کہ وہ خریدی ہوئی چیز کی ظاہری پڑتال کا انتظام کرے۔

بہرحال اسلامی مالیاتی ادارے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ مرابحہ ایک حقیقی اور اصلی معاہدہ ہے جس میں عملاً بیع ہوئی ہے، اسے سودی قرضے کو چھپانے کے لئے غلط استعمال نہیں کیا گیا۔

۳۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بینک، فراہم کنندہ سے چیز حاصل کرنے سے پہلے ہی کلائنٹ کو بیچ دیتا ہے۔ اس غلطی کا ارتکاب ان معاملوں میں ہوتا ہے جہاں مرابحہ کی تمام دستاویزات پر ایک ہی وقت دستخط کیے جاتے ہیں اور مرابحہ کے مختلف مراحل کو ذہن میں نہیں رکھا جاتا۔ بعض مالیاتی ادارے مرابحہ کا صرف ایک ہی معاہدہ کرتے ہیں جس پر رقم دیئے جانے کے وقت یا بعض صورتوں میں اس سہولت کی منظوری کے وقت دستخط کیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ مرابحہ کے بنیادی اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔ اس مضمون میں پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرابحہ کا بندوبست مختلف عقدوں کا ایک پیکیج ہے جو باری باری اپنے متعلقہ مراحل میں بروئے کار آتے ہیں۔ ان مراحل پر مرابحہ تمویل کے تصور پر گفتگو کرتے ہوئے مکمل روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مرابحہ کی اس بنیادی خصوصیت کو مدِنظر رکھے بغیر سارا کا سارا معاملہ سودی قرضے میں تبدیل ہو جاتا ہے، محض اصطلاحات اور نام تبدیل کرنے سے معاملہ شرعاً جائز نہیں ہو جاتا۔

اسلامی بینکوں کے شریعہ ایڈوائزری بورڈز کے نمائندے بینک کے معاملات کو شریعت کے مطابق ہونے کے حوالے سے چیک کریں تو انہیں اس بات کا یقین ضرور حاصل کر لینا چاہئے کہ ان تمام مراحل کا خیال رکھا گیا ہے اور ہر معاملہ اس کے مقررہ وقت پر وجود میں آیا ہے

۴۔ سیولیت (Liquidity) کے بندوبست کے لئے عموماً اشیاء کے بین الاقوامی معاملوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بعض اسلامی بینک محسوس کرتے ہیں کہ یہ معاہدے چونکہ اثاثوں پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے ان میں بآسانی مرابحہ کی بنیاد پر داخل ہوا جاسکتا ہے، اور یہ بینک اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس میدان میں داخل ہو جاتے ہیں کہ اشیاء کے معاملات جیسا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں مروّج ہیں وہ شرعی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں۔ اکثر صورتوں میں یہ غیر حقیقی معاہدے ہوتے ہیں جن میں کسی چیز کی کوئی سپردگی نہیں ہوتی، پارٹیاں فرق برابر کر کے معاملے کو ختم کر دیتی ہیں۔ بعض صورتوں میں حقیقۃً اشیاء ملوث ہوتی ہیں لیکن ان کی فارورڈ سیل ہوتی ہے یعنی مستقبل کی طرف مضاف بیع، یا سودا خود حاصل کیے بغیر بیع (Short Sale) ہوتی ہے اور یہ دونوں شرعاً ناجائز ہیں، حتیٰ کہ اگر یہ معاملے حاضر سودوں تک بھی محدود رہیں تب بھی یہ مرابحہ کے اسلامی اصولوں کے مطابق ہونے چاہئیں جن میں تمام ان ضروری شرطوں کو پورا کیا گیا ہو جو کہ اس کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔

۵۔ بعض مالیاتی اداروں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ان اشیاء پر بھی مرابحہ کر لیتے ہیں جو کلائنٹ پہلے ہی کسی تیسرے فریق سے خرید چکا ہوتا ہے، یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ جب ایک مرتبہ وہ چیز خود خرید چکا ہے تو وہ دوبارہ اسی فراہم کنندہ سے نہیں خریدی جاسکتی۔ اگر اس چیز کو بینک کلائنٹ سے خرید کر پھر اسے ہی بیچ دیتا ہے تو یہ Buy Back کی تکنیک ہے جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے، خاص طور پر مرابحہ میں۔ درحقیقت اگر کلائنٹ پہلے وہ چیز خرید چکا ہے اور وہ فنڈز کے لئے بینک کے پاس آتا ہے تو یا تو اس کے بائع کی طرف جو اس کی ذمہ داری بنتی ہے وہ اس سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے، یا وہ ان فنڈز کو اور مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے، دونوں صورتوں میں بینک مرابحہ کی بنیاد پر اسے تمویل نہیں دے سکتا، مرابحہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ وہ چیز کلائنٹ نے پہلے خریدی ہوئی نہ ہو۔

خلاصہ:

مرابحہ کے مختلف پہلوؤں پر سابقہ گفتگو سے درجِ ذیل نتائج نکالے جاسکتے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل بنیادی اصول ہیں:

۱۔ مرابحہ اپنی اصل کے اعتبار سے کوئی طریقۂ تمویل نہیں ہے، یہ ایک سادہ بیع ہے جو اصل لاگت پر اضافے (Cost Plus) کے تصور پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں مؤجل ادائیگی کا تصور شامل کر

کے اسے صرف ان صورتوں میں طریقۂ تمویل کے طور پر استعمال کرنے کا راستہ نکالا گیا ہے جہاں کلائنٹ واقعی کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے، اسی لئے نہ تو اسے مثالی طریقۂ تمویل کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے ہر قسم کی تمویل کے لئے عمومی طریقے کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے، اسے مشارکہ اور مضاربہ پر مبنی مثالی تمویلی نظام کی طرف ایک عبوری قدم کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے، وگرنہ اس کا استعمال انہی صورتوں تک محدود رہنا چاہئے جہاں مشارکہ اور مضاربہ کام نہیں دیتے۔

۲۔ مرابحہ سہولت کی منظوری دیتے وقت منظوری دینے والی اتھارٹی کو اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ کلائنٹ واقعی اس چیز کو خریدنا چاہتا ہے جس پر مرابحہ منعقد ہوگا، اسے محض کاغذی کاروائی نہیں بنانا چاہئے جس میں کوئی واقعی بیع نہ ہو۔

۳۔ Over Head Expenses، بلوں کی ادائیگی یا کلائنٹ کے ذمے قرضوں کی ادائیگی کے لئے مرابحہ منعقد نہیں ہوسکتا، اسی طرح کرنسی کی خریداری کے لئے بھی مرابحہ نہیں ہوسکتا۔

۴۔ مرابحہ کے جائز ہونے کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ متعلقہ چیز کلائنٹ کو مرابحہ کی بنیاد پر بیچنے سے پہلے تمویل کار کی ملکیت اور اس کے حسی یا معنوی قبضے میں آجائے۔ درمیان میں کچھ وقت ایسا ہونا چاہئے جس میں اس چیز کا ضمان (Risk) تمویل کار پر ہو۔ اس چیز کی ملکیت حاصل کیے بغیر اور اس کا رسک برداشت کیے بغیر، اگرچہ وہ مختصر وقت کے لئے ہو، یہ معاملہ شریعت کی نظر میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والا نفع بھی حلال نہیں ہوگا۔

۵۔ مرابحہ کرنے کا بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ تمویل کار فراہم کنندہ سے وہ چیز براہِ راست خریدے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے کلائنٹ کو مرابحہ کی بنیاد پر بیچ دے۔ کلائنٹ کو وکیل بنا دینا تاکہ وہ تمویل کار کی طرف سے اس چیز کو خرید لے، مرابحہ کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔ اس وجہ سے بعض شریعہ بورڈز نے اس تکنیک کو ممنوع قرار دے دیا ہے، سوائے ان صورتوں کے جہاں براہِ راست خریداری ممکن نہ ہو، اس لئے جہاں تک ممکن ہو وکالت کے اس تصور سے گریز کرنا چاہئے۔

۶۔ واقعی ضرورت کی صورت میں اگر تمویل کار اپنے کلائنٹ کو اس چیز کی خریداری کے لئے اپنا وکیل بناتا ہے تو اس کی مختلف حیثیتوں (یعنی وکیل کی حیثیت اور آخرکار خریدار کی حیثیت) کو ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز رکھنا چاہئے۔ بطور وکیل وہ امین ہے، جب تک وہ چیز تمویل کار کے وکیل کے طور پر اس کے قبضے میں ہو وہ اس کے کسی نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ کسی کوتاہی یا فراڈ کا ارتکاب کرے۔ جب بحیثیت وکیل وہ اس چیز کو خرید لے تو وہ تمویل کار کو اطلاع کرے کہ بطور وکیل اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اس نے خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرلیا ہے اور

اب وہ تمویل کار سے اسے خریدنے کے لئے پیشکش (ایجاب) کرتا ہے۔ جب اس ایجاب کے جواب میں تمویل کار اپنی طرف سے قبول ظاہر کر دے گا تو بیع مکمل سمجھی جائے گی اور اس چیز کا ضمان (Risk) بحیثیت خریدار کلائنٹ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اس مرحلے پر یہ کلائنٹ مدیون (Debtor) بن جائے گا اور مدیون ہونے کے اثرت بھی مرتب ہوں گے۔ یہ مرابحہ تمویل کے بنیادی تقاضے ہیں جن کے بغیر مرابحہ نہیں کیا جا سکتا۔ مرابحہ بطور طریقۂ تمویل کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے بھی ہم وکالت کے معاہدے کے ساتھ مرابحہ کے پانچ مراحل بیان کر چکے ہیں۔ ان پانچ مراحل میں سے ہر ہر مرحلے کا اپنی صحیح شکل میں ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرنے سے پورا بندوبست ہی شرعاً ناقابلِ قبول ہو جاتا ہے۔

یہ بات پوری احتیاط کے ساتھ مدِنظر رکھنی چاہئے کہ مرابحہ ایسا معاملہ ہے جو سرحد پر واقع ہے، اور بیان کردہ طریقۂ کار سے معمولی سا بھی ہٹنے سے قدم سودی تمویل کے ممنوعہ علاقے میں واقع ہو جاتے ہیں، اس لئے یہ معاملہ پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ کرنا چاہئے اور شریعت کے کسی بھی تقاضے میں کوتاہی نہیں برتنی چاہئے۔

۷۔ اُدھار اور نقد کی بنیاد پر دو الگ الگ قیمتیں بتانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ گاہک دو شقوں میں سے کسی ایک کو متعین طور پر منتخب کر لے۔ جب ایک مرتبہ قیمت متعین ہو گئی تو نہ تو ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اسے بڑھایا جا سکتا ہے اور نہ ہی جلدی ادائیگی کی وجہ سے کمی کی جا سکتی ہے۔

۸۔ یہ بات یقینی بنانے کے لئے کہ خریدار قیمت بروقت ادا کر دے گا وہ یہ ذمہ داری لے سکتا ہے کہ نادہندگی کی صورت میں وہ متعین رقم ایسے خیراتی فنڈ میں جمع کرائے گا جو مالیاتی ادارے کے زیرِ انتظام ہو۔ یہ مقدار سالانہ فیصد کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ رقم لازمی طور پر خالص خیراتی مقاصد کے لئے ہی خرچ ہونی چاہئے اور کسی بھی صورت میں مالیاتی ادارے کی آمدن کا حصہ نہیں بننی چاہئے۔

۹۔ قبل از وقت ادائیگی کی صورت میں کلائنٹ کسی چھوٹ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ تاہم مالیاتی ادارہ معاہدے میں پیشگی شرط کے بغیر اپنی مرضی سے قیمت کا کچھ حصہ معاف کر سکتا ہے۔

اجارہ

اجارہ

''اجارہ'' اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے، جس کا لغوی معنی ہے کوئی چیز کرائے پر دینا۔ اسلامی فقہ میں ''اجارہ'' کی اصطلاح دو مختلف صورتوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں اجارے کا معنی ہے کسی شخص کی خدمات حاصل کرنا جس کے معاوضے میں اسے تنخواہ دی جاتی ہے۔ خدمات حاصل کرنے والے کو ''متاجر'' اور اس ملازم کو ''اجیر'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ''الف'' ''ب'' کو اپنے دفتر میں ماہانہ تنخواہ کی بنیاد پر منیجر یا کلرک رکھتا ہے تو ''الف'' متاجر ہے اور ''ب'' اجیر ہے۔ اسی طرح اگر ''الف'' کسی قلی (پورٹر) کی خدمات حاصل کرتا ہے تاکہ وہ اس کا سامان ائرپورٹ تک پہنچائے تو ''الف'' متاجر ہے جبکہ وہ پورٹر اجیر ہے، اور دونوں صورتوں میں فریقین کے درمیان طے پانے والا معاملہ ''اجارہ'' کہلائے گا۔ اجارے کی اس قسم میں تمام وہ معاملات شامل ہیں جن میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی خدمات (Services) حاصل کرتا ہے۔ جس کی خدمات حاصل کی گئی ہیں وہ کوئی ڈاکٹر، قانون دان، معلم، مزدور یا کوئی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو ایسی خدمات مہیا کرسکتا ہو جن کی کوئی قیمت لگائی جاسکتی ہو۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح کے مطابق ان میں سے ہر شخص کو ''اجیر'' کہا جاسکتا ہے، اور جو شخص ان کی خدمات حاصل کرتا ہے اسے متاجر کہا جائے گا، جبکہ اجیر کو دی جانے والی تنخواہ ''اجرت'' کہلائے گی۔

''اجارہ'' کی دوسری قسم کا تعلق انسانی خدمات کے ساتھ نہیں بلکہ اثاثہ جات اور جائیداد کے منافع (حقِ استعمال) کے ساتھ ہے۔ اس مفہوم میں ''اجارہ'' کا معنی ہے ''کسی متعین مملوکہ چیز کے منافع (Usufructs) کسی دوسرے شخص کو ایسے کرائے کے بدلے میں منتقل کردینا جس کا اس سے مطالبہ کیا جائے''۔ اس صورت میں ''اجارہ'' کی اصطلاح انگریزی اصطلاح Leasing کے ہم معنی ہوگی، کرایے پر دینے والا (Lessor) ''موجر'' کہلاتا ہے اور کرایے پر لینے والے (Lessee) کو ''متاجر'' کہا جاتا ہے، اور موجر کو جو کرایہ دیا جاتا ہے اسے ''اجرت'' کہتے ہیں۔

اجارے کی دونوں قسموں پر اسلامی فقہی لٹریچر میں تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے اپنے قواعد وضوابط ہیں۔ لیکن اس کتاب کے مقصد کے زیادہ متعلق دوسری قسم ہے، اس لئے کہ اسے عموماً سرمایہ کاری یا تمویل کے طریقے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

لیز نگ کے مفہوم میں اجارے کے قواعد بیع کے قواعد کے کافی مشابہ ہیں، اس لئے کہ دونوں صورتوں میں کوئی چیز دوسرے شخص کو معاوضے کے بدلے میں منتقل کی جاتی ہے۔ بیع اور اجارہ میں فرق صرف یہ ہے کہ بیع میں جائیداد بذاتِ خود خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور اجارے کی صورت میں جائیداد خود منتقل کرنے والے کی ملکیت میں رہتی ہے، صرف اسے استعمال کرنے کا حق مستاجر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اس لئے یہ بات آسانی سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے کہ اجارہ اپنی اصل کے اعتبار سے کوئی طریقۂ تمویل نہیں ہے، بلکہ یہ بیع کی طرح ایک معمول کی کاروباری سرگرمی ہے۔ تاہم بعض وجوہات کی بنیاد پر، خاص طور پر اس میں جو ٹیکسوں کی سہولتیں ہیں ان کی وجہ سے، مغربی ملکوں میں اسے تمویل کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض مالیاتی اداروں نے سادہ سودی قرضے دینے کی بجائے بعض اشیاء اپنے کلائنٹس کو لیز پر دینا شروع کر دیں۔ ان اشیاء کا کرایہ متعین کرتے وقت یہ مالیاتی ادارے اس مجموعی لاگت کا بھی حساب لگاتے ہیں جو انہیں ان اثاثوں کی خریداری کے لئے اُٹھانا پڑی اور اس میں وہ متعین سود بھی شامل کر لیتے ہیں جو لیز کی مدت میں اس رقم پر وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طریقے سے حساب کی ہوئی مجموعی رقم کو لیز (اجارہ) کی مدت کے مہینوں پر تقسیم کر لیا جاتا ہے، اور اس بنیاد پر ماہانہ کرایہ متعین کر لیا جاتا ہے۔

لیز کو شرعاً بطور طریقۂ تمویل استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں یہ سوال کسی معاہدے کی شرائط پر موقوف ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا لیز ایک معمول کا کاروباری عقد ہے، طریقۂ تمویل نہیں ہے، اس لئے لیز پر وہ تمام قواعد لاگو ہوں گے جو شریعت میں اجارے کے لئے بیان کیے گئے ہیں، لہٰذا ہمیں لیز کے متعلق ان قواعد پر گفتگو کر لینی چاہئے جو اسلامی فقہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکیں گے کہ کونسی شرائط کے تحت اجارے کو تمویل کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ ''اجارہ'' کے اصول اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے لئے ایک مستقل جلد درکار ہے، ہم اس باب میں صرف ان بنیادی اصولوں کو مختصراً بیان کرنے کی کوشش کریں گے جن کا جاننا اس عقد کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے اور جن کی عموماً جدید معاشی سرگرمیوں میں ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اصول یہاں مختصر نوٹس کی شکل میں بیان کیے جا رہے ہیں تاکہ قارئین انہیں مختصر حوالے کے لئے استعمال کر سکیں۔

لیزنگ (اجارہ) کے بنیادی قواعد

۱۔ لیزنگ ایک ایسا عقد ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا مالک طے شدہ مدت کے لئے طے شدہ معاوضے کے بدلے میں اس چیز کے استعمال کا حق کسی اور شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

۲۔ لیز ایسی چیز کا ہو سکتا ہے جس کا کوئی ایسا استعمال ہو جس کی کوئی قدر و قیمت ہو، لہٰذا جس چیز کا کوئی استعمال نہ ہو وہ لیز پر نہیں دی جا سکتی۔

۳۔ لیز کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لیز پر دی گئی چیز کی ملکیت مؤجر (Lessor) ہی کے پاس رہے اور مستاجر (Lessee) کو صرف حق استعمال منتقل ہو، لہٰذا ہر ایسی چیز جسے صرف کیے بغیر (یعنی ختم کیے بغیر یا اپنے پاس سے نکالے بغیر) استعمال نہیں کیا جا سکتا ان کی لیز بھی نہیں ہو سکتی، اس لئے نقد رقم، کھانے پینے کی اشیاء، ایندھن اور گولہ بارود وغیرہ کی لیز ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ انہیں خرچ کیے بغیر ان کا استعمال ممکن نہیں ہے۔ اگر اس نوعیت کی کوئی چیز لیز پر دے دی گئی ہے تو اسے ایک قرض سمجھا جائے گا اور قرض کے سارے احکام اس پر لاگو ہوں گے۔ اس غیر صحیح لیز پر جو بھی کرایہ لیا جائے گا وہ قرض پر لیا جانے والا سود ہوگا۔

۴۔ لیز پر دی گئی جائیداد بذاتِ خود چونکہ موجر (Lessor) کی ملکیت میں ہے اس لئے ملکیت کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کو بھی وہ خود ہی اُٹھائے گا، لیکن اس کے استعمال کے متعلق ذمہ داریوں کو مستاجر (Lessee) اُٹھائے گا۔

مثال: ''الف'' نے اپنا گھر ''ب'' کو کرایہ پر دیا۔ خود اس جائیداد کی طرف منسوب ٹیکس ''الف'' کے ذمے ہوں گے، جبکہ پانی کا ٹیکس، بجلی کے بل اور مکان کے استعمال کے حوالے سے دیگر اخراجات ''ب'' یعنی مستاجر پر ہوں گے۔

۵۔ لیز کی مدت کا تعین واضح طور پر ہو جانا چاہئے۔

۶۔ لیز کے معاہدے میں لیز کا جو مقصد متعین ہوا ہے مستاجر (Lessee) اس اثاثے کو اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر معاہدے میں کوئی مقصد طے نہیں ہوا تو مستاجر اسے ان مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا ہے جن کے لئے عام حالات میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اسے غیر معمولی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے (جس کے لئے عموماً وہ چیز استعمال نہیں ہوتی) تو ایسا وہ موجر (مالک) کی صریح اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔

۷۔ مستاجر کی طرف سے اس چیز کے غلط استعمال یا غفلت و کوتاہی کی وجہ سے جو نقصان ہو وہ اس

کا معاوضہ دینے کا ذمہ دار ہے۔

۸۔ لیز پر دی گئی چیز لیز کی مدت کے دوران موجر (Lessor) کے ضمان (Risk) میں رہے گی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سبب سے نقصان ہو جائے جو مستاجر (Lessee) کے اختیار سے باہر ہو تو یہ نقصان موجر (مالک) برداشت کرے گا۔

۹۔ جو جائیداد دو یا زیادہ شخصوں کی مشترکہ ملکیت میں ہو وہ بھی لیز پر دی جا سکتی ہے اور کرایہ مالکان کے درمیان ملکیت میں ان کے حصے کے تناسب سے تقسیم ہوگا۔

۱۰۔ جو شخص کسی جائیداد کی ملکیت میں شریک ہو وہ اپنا متناسب حصہ اپنے شریک ہی کو کرائے پر دے سکتا ہے کسی اور شخص کو نہیں۔ (۱)

۱۱۔ لیز کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لیز پر دی جانے والی چیز فریقین کے لئے اچھی طرح متعین ہونی چاہئے۔

مثال: ''الف'' ''ب'' سے کہتا ہے کہ میں تمہیں اپنی دو دکانوں میں سے ایک کرایہ پر دیتا ہوں۔ ''ب'' بھی اس سے اتفاق کر لیتا ہے تو یہ اجارہ باطل ہوگا اِلا یہ کہ دونوں دکانوں میں سے ایک کی تعیین اور شناخت ہو جائے۔

کرائے کا تعین

۱۲۔ لیز کی پوری مدت کے لئے کرائے کا تعین عقد کے وقت ہی ہو جانا چاہئے۔

یہ بھی جائز ہے کہ لیز کی مدت کے مختلف مراحل کے لئے کرایہ کی مختلف مقداریں طے کر لی جائیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ہر مرحلے کے کرائے کی مقدار کا پوری طرح تعین لیز کے روبہ عمل آتے ہی ہو جانا چاہئے۔ اگر بعد میں آنے والے کسی مرحلے کا کرایہ طے نہیں کیا گیا یا اسے موجر کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تو یہ اجارہ صحیح نہیں ہوگا۔

مثال: (۱) ''الف'' اپنا گھر پانچ سال کی مدت کے لئے ''ب'' کو کرائے پر دیتا ہے۔ پہلے سال کا کرایہ دو ہزار ماہانہ مقرر کیا گیا ہے اور یہ بھی طے پا گیا ہے کہ ہر اگلے سال کا کرایہ پچھلے سال سے دس فیصد زیادہ ہوگا، تو یہ اجار (lease) صحیح ہے۔

(۲) مذکورہ مثال میں ''الف'' معاہدے میں شرط لگاتا ہے کہ دو ہزر ماہانہ کرایہ صرف ایک سال کے لئے مقرر کیا گیا ہے، اگلے سالوں کا کرایہ بعد میں موجر کی مرضی سے طے ہوگا، تو یہ

(۱) دیکھئے ابن عابدین، ردالمحتار، ج ۶، ص ۴۷، ۴۸۔

اجارہ باطل ہے اس لئے کہ کرایہ غیر متعین ہے۔

۱۳۔ کرائے کا تعین اس مجموعی لاگت کی بنیاد پر کرنا جو موجر کو اس چیز کی خریداری پر پڑی ہے، جیسا کہ عموماً تمویلی اجارہ (Financial Lease) میں ہوتا ہے، یہ بھی شریعت کے اصولوں کے خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ اجارہ صحیحہ کی دوسری شرعی شرائط پر مکمل طور پر عمل کیا جائے۔

۱۴۔ موجر (Lessor) یک طرفہ طور پر کرائے میں اضافہ نہیں کر سکتا، اور اس طرح کی شرط رکھنے والا معاہدہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔

۱۵۔ مستاجر (Lessee) کو کرائے پر دیا گیا اثاثہ سپرد کرنے سے پہلے کرایہ یا اس کا کچھ حصہ پیشگی بھی قابل ادا قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن موجر اس طرح سے جو رقم حاصل کرے گا وہ علی الحساب (On Account) ادائیگی کی بنیاد پر ہوگی اور کرائے کے واجب الادا ہونے کے بعد اسے اس میں ایڈجسٹ کر لیا جائے گا۔

۱۶۔ اجارے کی مدت اس تاریخ سے شروع ہوگی جبکہ اجارے پر دیا گیا اثاثہ مستاجر کے سپرد کر دیا جائے، چاہے وہ اسے استعمال کرنا شروع کرے یا نہ کرے۔

۱۷۔ اگر اجارے پر دی گئی چیز اپنا متعلقہ کام کھو بیٹھتی ہے جس کے لئے وہ چیز کرائے پر دی گئی تھی اور اس کی مرمت بھی ممکن نہیں ہے تو اجارہ اس تاریخ سے فسخ ہو جائے گا جس تاریخ کو اس طرح کا نقصان ہوا ہے۔ تاہم اگر یہ نقصان مستاجر کے غلط استعمال یا اس کی غفلت کی وجہ سے ہوا ہے تو وہ موجر کو قیمت میں واقع ہونے والی کمی کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا، یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ نقصان سے ذرا پہلے اس کی قیمت کیا تھی اور اب نقصان کے بعد کیا ہے۔

اجارہ بطور طریقۂ تمویل

مرابحہ کی طرح اجارہ (Lease) بھی اپنی اصل کے اعتبار سے طریقۂ تمویل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سادہ معاہدہ ہے جس کا مقصد کسی چیز کے استعمال کا حق ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف طے شدہ معاوضے کے بدلے میں منتقل کرنا ہے، تاہم بعض مالیاتی اداروں نے سودی بنیاد پر طویل المیعاد قرضے دینے کی بجائے لیز کو بطور طریقۂ تمویل استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح کی لیز کو عموماً تمویلی اجارہ (Financial Lease) کہا جاتا ہے جو کہ عملی اجارہ (Operational Lease) سے مختلف ہے اور اس میں (یعنی فنانشل لیز میں) عملی اجارہ کی بہت سی خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ماضی قریب میں جب غیر سودی مالیاتی ادارے قائم ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ لیز پوری دنیا میں تسلیم شدہ طریقۂ تمویل ہے، دوسری طرف انہوں نے یہ حقیقت بھی محسوس کی کہ لیز شرعاً ایک جائز عقد ہے اور اسے غیر سودی طریقۂ تمویل کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے، اس لئے اسلامی مالیاتی اداروں نے لیز کو اختیار کرنا شروع کر دیا، لیکن ان میں سے بہت کم نے اس حقیقت کی طرف توجہ دی کہ تمویلی اجارہ (Financial Lease) میں بہت سی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو عملاً اجارہ کی بجائے سود کے زیادہ مشابہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بغیر کسی تبدیلی کے لیز کے معاہدے کے انہی ماڈلز کو استعمال کرنا شروع کر دیا جو روایتی مالیاتی اداروں میں مستعمل تھے، حالانکہ ان کی بہت سی شقیں شریعت کے مطابق نہیں تھیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے لیز اپنی اصل کے اعتبار سے طریقۂ تمویل نہیں ہے، تاہم چند متعین شرائط کے ساتھ اس عقد کو تمویل کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ سود (Interest) کی جگہ کرایہ (Rent) کا نام رکھ دیا جائے اور رہن (Mortgage) کی جگہ لیز پر دیئے گئے اثاثے کا نام، بلکہ لیزنگ اور سودی قرضے میں عملی فرق ہونا چاہئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ لیز کے تمام اسلامی اصولوں کی پیروی کی جائے، جن میں سے کچھ کا بیان اس باب کے ابتدائی حصے میں ہو چکا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے ذیل میں اس وقت جاری تمویلی اجارہ (Financial Lease) اور شرعاً جائز عملی لیز میں چند بنیادی فرق لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ بیع کے برعکس اجارہ مستقبل کی کسی تاریخ سے بھی نافذ العمل ہو سکتا ہے۔[1] لہٰذا فارورڈ سیل تو شرعاً ناجائز ہے لیکن مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب اجارہ جائز ہے، اس شرط کے ساتھ کہ کرایہ اس وقت واجب الادا ہوگا جبکہ اجارہ پر دیا گیا اثاثہ متاجر (Lessee) کے سپرد کر دیا جائے۔

تمویلی اجارہ کی بہت سی صورتوں میں موجر یعنی مالیاتی ادارہ اس اثاثے کو خود متاجر (Lessee) کے ذریعے خریدتا ہے۔ متاجر وہ چیز موجر کی طرف سے خریدتا اور اس کی قیمت فراہم کنندہ (Supplier) کو ادا کرتا ہے۔ کبھی تو یہ قیمت براہِ راست اسے ادا کر دیتا ہے اور کبھی متاجر کے ذریعے سے۔ لیز کے بعض معاہدوں میں لیز اسی دن سے شروع ہو جاتی ہے جس دن موجر قیمت ادا کر دیتا ہے قطع نظر اس سے کہ متاجر نے وہ قیمت فراہم کنندہ کو ادا کر دی ہے اور اس چیز پر قبضہ حاصل کر لیا ہے یا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ متاجر کے اجارہ پر لی جانے والی چیز پر قبضہ کرنے سے

---

(۱) دیکھئے: ردالمحتار، ج۴، ص۶۴۔

پہلے ہی اس پر کرایہ کی ذمہ داری شروع ہو جاتی ہے، یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ کلائنٹ کو دی جانے والی رقم پر کرایہ لینے کے مترادف ہے جو کہ سادہ اور خالص سود ہے۔

شرعاً صحیح طریقہ یہ ہے کہ کرایہ اس تاریخ سے لیا جائے جس دن سے مستاجر نے اجارہ والے اثاثے پر قبضہ کیا ہے، اس تاریخ سے نہیں جس کو قیمت کی ادائیگی کی گئی ہے۔ اگر فراہم کنندہ رقم وصول کرنے کے بعد اس چیز کی سپردگی میں تاخیر کر دیتا ہے تو مستاجر تاخیر کی اس مدت کے کرائے کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

فریقین میں مختلف تعلقات

۲۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ جب اجارہ پر دی جانے والی چیز کی خریداری کا کام خود مستاجر کو سونپا جائے تو یہاں پر مالیاتی ادارے اور کلائٹ کے درمیان دو مختلف تعلق ہوں گے جو کہ یکے بعد دیگرے روبہ عمل آئیں گے۔ پہلے مرحلے میں کلانٹ اس اثاثے کی خریداری کے لئے مالیاتی ادارے کا وکیل ہے۔ اس مرحلے پر فریقین کے درمیان تعلق وکیل اور موکل سے زیادہ نہیں ہے، موجر اور مستاجر ہونے کا تعلق ابھی عمل میں نہیں آیا۔

دوسرا مرحلہ اس تاریخ سے شروع ہوگا جبکہ کلائنٹ فراہم کنندہ سے اس چیز کا قبضہ حاصل کر لے، اس مرحلے پر موجر اور مستاجر کا تعلق اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دے گا۔

فریقین کی ان دو مختلف حیثیتوں کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ پہلے مرحلے کے دوران کلائنٹ پر مستاجر کی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوں گی، اس مرحلے پر وہ صرف ایک وکیل کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا ذمہ دار ہے، البتہ جب اس اثاثے کا قبضہ اسے دے دیا گیا تو وہ بطور مستاجر اپنی ذمہ داریوں کا پابند ہے۔

تاہم یہاں مرابحہ اور لیزنگ میں ایک فرق ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا عملاً بیع اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ کلائنٹ فراہم کنندہ سے اس چیز پر قبضہ حاصل کر لے اور مرابحہ کا سابقہ معاہدہ بیع کے نافذ العمل ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، لہٰذا بطور وکیل اس اثاثے پر قبضہ کرنے کے بعد کلائنٹ اس بات کا پابند ہے کہ وہ مالیاتی ادارے کو اس سے مطلع کرے اور اس کی خریداری کے لئے ایجاب (Offer) کرے۔ بیع اس وقت منعقد ہوگی جبکہ مالیاتی ادارہ اس ایجاب کو قبول کر لے گا۔

لیزنگ میں طریقۂ کار اس سے مختلف اور ذرا مختصر ہے۔ یہاں فریقین کو قبضہ کرنے کے بعد اجارہ کا عقد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کلائنٹ کو اپنا وکیل بناتے وقت مالیاتی ادارے نے قبضے کی

تاریخ سے یہ اثاثہ اجارہ پر دینے سے اتفاق کرلیا تھا تو اس تاریخ سے اجارہ خود بخود شروع ہو جائے گا۔

مرابحہ اور اجارہ میں اس فرق کی دو وجوہ ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ فوری طور پر نافذ العمل ہو، لہٰذا مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب بیع شرعاً صحیح نہیں ہوتی، لیکن اجارہ مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف بھی مضاف ہوسکتا ہے، لہٰذا مرابحہ کی صورت میں سابقہ معاہدہ کافی نہیں ہے، جبکہ لیزنگ میں یہ بالکل کافی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی شخص ایسی چیز کا نفع یا فیس حاصل نہیں کرسکتا جس کا ضمان (رسک) اس نے برداشت نہ کیا ہو۔

اس اصول کو مرابحہ پر منطبق کریں تو بائع ایسی چیز پر نفع نہیں لے سکتا جو ایک لمحے کے لئے بھی اس کے ضمان (رسک) میں نہ آئی ہو، اس لئے کلائنٹ اور مالیاتی ادارے کے درمیان بیع منعقد ہونے کے لئے سابقہ معاہدے ہی کو کافی قرار دے دیا جائے تو یہ اثاثہ اسی وقت کلائنٹ کی طرف منتقل ہو جائے گا جب وہ اس پر قبضہ کرے گا اور وہ اثاثہ ایک لمحے کے لئے بھی بائع کے رسک میں نہیں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرابحہ میں بیک وقت منتقلی ممکن نہیں ہے، اس لئے اس میں قبضے کے بعد نئے ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے۔

لیزنگ کی صورت میں لیزنگ کی پوری مدت کے دوران وہ اثاثہ موجر (Lessor) کی ملکیت اور اس کے ضمان میں رہتا ہے، اس لئے کہ اس میں ملکیت تبدیل نہیں ہوتی، لہٰذا اگر لیزنگ کی مدت بالکل اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جبکہ کلائنٹ نے قبضہ کیا ہے تو اس میں بھی مذکورہ بالا اصول کی مخالفت نہیں ہے۔

ملکیت کی وجہ سے ہونے والے اخراجات

۳۔ چونکہ موجر اس اثاثے کا مالک ہے اور اس نے اسے اپنے وکیل کے ذریعے خریدا ہے اس لئے اس کی خریداری اور اس ملک میں درآمد پر ہونے والے اخراجات کی ادائیگی کا بھی وہی ذمہ دار ہے، لہٰذا کسٹم ڈیوٹی اور مال برداری وغیرہ کے اخراجات اسی کے ذمے ہیں۔ وہ ان اخراجات کو لاگت میں شامل کر کے کرائے کے تعین میں انہیں مدِنظر رکھ سکتا ہے لیکن اصولی طور پر مالک ہونے کی وجہ سے وہ ان تمام اخراجات کو برداشت کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ہر ایسا معاہدہ جو اس کے خلاف ہو جیسا کہ روایتی فنانشل لیز میں ہوتا ہے، شریعت کے موافق نہیں ہے۔

نقصان کی صورت میں فریقین کی ذمہ داری

جیسا کہ لیزنگ کے بنیادی قواعد میں پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مستاجر (Lessee) ہر ایسے نقصان کا ذمہ دار ہے جو اثاثے کو اس کے غلط استعمال یا غفلت کی وجہ سے لاحق ہو، اسے معمول کے استعمال کی وجہ سے ہونے والی خرابیوں کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے، لیکن اسے اس نقصان کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا جو اس کے اختیار سے باہر ہو۔ روایتی تمویلی اجارہ (Financial Lease) میں عموماً ان دوقسموں کے نقصانات میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اسلامی اصولوں پر مبنی لیز میں دونوں قسم کی صورتِ حال میں الگ الگ معاملہ کرنا چاہئے۔

طویل المیعاد لیز میں قابلِ تغیر کرایہ

۵۔ لیز کے طویل المیعاد معاہدوں میں عموماً مؤجر (Lessor) کے لئے عموماً یہ فائدہ مند نہیں ہوتا کہ وہ لیز کی پوری مدت کے لئے کرایے کی ایک شرح مقرر کرلے، اس لئے کہ مارکیٹ کی صورتِ حال وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے، اس صورت میں موجر کے پاس دو اختیار ہیں:

(الف) وہ لیز کا معاہدہ اس شرط کے ساتھ کرسکتا ہے کہ خاص مدت کے بعد (مثلاً ایک سال کے بعد) کرایہ خاص نسبت سے (مثلاً پانچ فیصد) بڑھادیا جائے گا۔

(ب) وہ ایک مختصر مدت کے لئے لیز کا معاہدہ کرلے، اس کے بعد فریقین باہمی رضامندی سے نئی شرائط پر لیز کی تجدید کرسکتے ہیں۔ اس صورت میں فریقین میں سے ہر ایک آزاد ہوگا کہ وہ تجدید سے انکار کردے۔ اس صورت میں مستاجر (Lessee) پر لازم ہوگا کہ وہ لیز پر لی گئی چیز فارغ کر کے موجر (Lessor) کو لوٹادے۔

یہ دو اختیار تو قدیم فقہی قواعد کی بنیاد پر ہیں، بعض معاصر علماء طول المیعاد لیز میں اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ کرایے کی مقدار کو ایسے قابلِ تغیر معیار (Benchmark) کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے جو اچھی طرح معلوم ہو اور اس کی اچھی طرح وضاحت کردی گئی ہو اور اس میں جھگڑے کا کوئی امکان باقی نہ رہا ہو۔ مثلاً ان علماء کے نزدیک لیز کے معاہدے میں یہ شرط لگانا جائز ہے کہ اگر حکومت کی طرف سے موجر پر لگائے گئے ٹیکس میں اضافہ ہوگا تو کرایہ میں بھی اسی حساب سے اضافہ کردیا جائے گا، اسی طرح یہ علماء اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ کرائے میں سالانہ اضافے کو افراطِ زر کی شرح کے ساتھ منسلک کردیا جائے، لہٰذا اگر افراطِ زر کی شرح پانچ فیصد ہے تو کرایہ بھی پانچ فیصد

بڑھ جائے گا۔

اسی اصول کی بنیاد پر بعض اسلامی بینک مروّجہ شرح سود کو کرائے کی تعیین کے لئے بطور معیار استعمال کرتے ہیں۔ یہ بینک لیزنگ کے ذریعے اتنا ہی نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں جتنا روایتی بینک سودی قرضے دے کر حاصل کرتے ہیں، اس لئے وہ کرایوں کی شرح سود سے منسلک کر لیتے ہیں اور کرائے کی ایک متعین مقدار طے کرنے کی بجائے وہ لیز پر دیئے جانے والے اثاثے کی خریداری کی لاگت کا حساب لگاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے کرائے کے ذریعے اتنی رقم حاصل کرلیں جو سود کی شرح کے برابر ہو، اس لئے معاہدے میں یہ شرط ہوتی ہے کہ کرایہ شرح سود کے برابر ہوگا یا شرح سود سے کچھ زیادہ۔ چونکہ سود کی شرح بدلتی رہتی ہے اس لئے لیز کی پوری مدت کے لئے اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے ان معاہدوں میں کسی خاص ملک کی شرح سود کو بطور معیار استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً Libor[1] کو)

اس انتظام پر دو بنیادوں پر اعتراض کیا گیا ہے۔

پہلا اعتراض یہ اُٹھایا گیا ہے کہ کرائے کی ادائیگی کو شرح سود کے ساتھ منسلک کرنے سے یہ معاملہ سودی تمویل کی طرح ہی ہوگیا ہے۔ اس اعتراض کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ جیسا کہ مرابحہ میں تفصیلی بحث سے ثابت کیا گیا ہے کہ شرح سود کو تو صرف معیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جب تک صحیح اجارہ کے لئے شرعاً مطلوب شرائط کو پورا کیا جاتا ہے تو معاہدے میں کرائے کی تعیین کے لئے کسی بھی معیار کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سودی تمویل اور صحیح اجارہ (Lease) میں فرق اس مقدار میں مضمر نہیں ہے جو تمویل کار یا موجر (Lessor) کو ادا کی جائے گی، بلکہ بنیادی فرق یہ ہے کہ لیز کی صورت میں لیز پر دینے والا لیز پر دی گئی چیز کا مکمل ضمان (Risk) برداشت کرتا ہے۔ اگر لیز پر دیا ہوا اثاثہ لیز کی مدت میں تباہ ہو جاتا ہے تو موجر (Lessor) یہ نقصان برداشت کرے گا، اسی طرح اگر مستاجر کے غلط استعمال یا اس کی غفلت و کوتاہی کے بغیر اس اثاثے کے منافع ضائع ہو جاتے ہیں (یعنی وہ اس مقصد کے لئے قابلِ استعمال نہیں رہتا جس مقصد کے لئے اسے کرائے پر لیا گیا تھا) تو موجر (Lessor) کرائے کا مطالبہ نہیں کرسکتا، جبکہ سودی تمویل میں تمویل کار (Financier) ہر حالت میں سود کا مستحق سمجھا جاتا ہے اگرچہ قرض لینے والے نے قرض کے طور پر لی گئی رقم سے کوئی بھی فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ جب تک اس بنیادی فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے (یعنی موجر لیز والے اثاثے کا رسک برداشت

(۱) London Inter-bank offered rate

اس کی کچھ وضاحت مرابحہ کے باب میں گزر چکی ہے۔ (مترجم)

کرتا ہے) تو اس معاہدے کو سودی معاہدے کے خانے میں نہیں رکھا جا سکتا، اگر چہ مستاجر سے لی جانے والی کرائے کی رقم شرح سود کے برابر ہو۔

لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ شرح سود کو محض پیمانے کے طور پر استعمال کرنے سے یہ معاملہ سودی قرضے کی طرح ناجائز نہیں ہو جاتا، اگر چہ بہتر یہی ہے کہ سود کو بطور پیمانہ استعمال کرنے سے بھی گریز کیا جائے تا کہ ایک اسلامی معاملہ غیر اسلامی معاملے سے بالکل ممتاز ہو اور سود کی کسی قدر مشابہت نہ پائی جائے۔

اس انتظام پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ چونکہ شرح سود میں ہونے والی تبدیلی پہلے سے معلوم نہیں ہوتی اس لئے جو کرایہ اس سے منسلک ہوگا اس میں بھی جہالت اور غرر ہوگا جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔ یہ شریعت کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے کہ کسی عقد میں داخل ہوتے وقت فریقین کو معاوضہ معلوم ہونا چاہئے۔ یہ معاوضہ لیز کے معاملے میں وہ کرایہ ہے جو مستاجر (Lessee) سے لیا جاتا ہے، لہٰذا لیز کے معاملے کے بالکل آغاز میں ہی یہ کرایہ فریقن کو معلوم ہونا چاہئے۔ اگر ہم کرائے کو مستقبل کی شرح سود کے ساتھ منسلک کر دیں جو کہ اس وقت غیر معلوم ہے تو کرایہ بھی غیر معلوم ہو جائے گا۔ یہ جہالت یا غرر ہے، جس کی وجہ سے عقد صحیح نہیں رہتا۔

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ جہالت دو وجوہ سے ممنوع ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ جہالت فریقین میں تنازعہ کا باعث بن سکتی ہے، اس وجہ کا اطلاق یہاں پر نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہاں فریقین باہمی رضامندی سے ایک ایسے اچھی طرح واضح پیمانے پر متفق ہو گئے ہیں جو کرائے کی تعیین کے لئے معیار کا کام دے گا اور اس کی بنیاد پر جو کرایہ بھی متعین کیا جائے گا وہ فریقین کے لئے قابلِ قبول ہوگا، اس لئے فریقین میں تنازعہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جہالت (کرائے کا معلوم نہ ہونا) کے ممنوع ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے فریقین کو غیر متوقع نقصان سے متاثر ہونے کا خدشہ لاحق رہے گا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی خاص عرصے میں شرح سود غیر متوقع طور پر بہت زیادہ بڑھ جائے، اس صورت میں مستاجر کو نقصان ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص عرصے میں شرح سود غیر متوقع حد تک کم ہو جائے، اس صورت میں موجر کا نقصان ہوگا، ان ممکنہ صورتوں میں ہونے والے نقصان کے خطرے سے نمٹنے کے لئے بعض معاصر علماء نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ کرایہ اور شرح سود میں ربط اور تعلق کو خاص حد تک محدود کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر معاہدے میں یہ شق رکھی جا سکتی ہے کہ خاص مدت کے بعد کرائے کی مقدار شرح سود میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق تبدیل ہو جائے گی، لیکن یہ اضافہ کسی بھی صورت میں پندرہ فیصد سے

زائد اور پانچ فیصد سے کم نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر شرح سود میں اضافہ پندرہ فیصد سے زائد ہوتا ہے تو کرایہ پندرہ فیصد تک ہی بڑھے گا، اس کے برعکس اگر شرح سود میں کمی پانچ فیصد سے زائد ہو جاتی ہے تو کرایہ میں کمی پانچ فیصد سے زائد نہیں ہوگی۔

ہماری رائے میں یہ ایک معتدل نقطۂ نظر ہے جس میں مسئلے کے تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

کرایہ کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ

فنانشل لیز کے بعض معاہدوں میں کرائے کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں مستاجر پر جرمانہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس جرمانے سے اگر موجر کی آمدن میں اضافہ ہوتا ہو تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کرایہ جب واجب الادا ہو گیا تو یہ مستاجر کے ذمے ایک دین ہے اور اس پر دین (Debt) کے تمام اصول و احکام لاگو ہوں گے۔ مدیون سے دین کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے مزید رقم وصول کرنا عین رِبا ہے جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے، لہٰذا اگر مستاجر کرائے کی ادائیگی میں تاخیر بھی کر دے تب بھی موجر اس سے اضافی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اس ممانعت سے غلط فائدہ اُٹھانے کی وجہ سے ہونے والے نقصانات سے بچنے کے لئے ایک اور متبادل کی مدد لی جا سکتی ہے وہ یہ کہ مستاجر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ یہ عہد کرے کہ اگر وہ مقررہ تاریخ پر کرایہ ادا کرنے سے قاصر رہا تو وہ متعینہ رقم خیرات کے طور پر دے گا۔ اس مقصد کے لئے تمویل کار / موجر ایک خیراتی فنڈ قائم کر سکتا ہے جہاں اس طرح کی رقم جمع کرائی جائیں اور انہیں خیراتی مقاصد کے لئے خرچ کیا جائے۔ جن میں حاجت مند لوگوں کو غیر سودی قرضے جاری کرنا بھی شامل ہے۔ خیراتی مقاصد کے لئے دی جانے والی یہ رقم تاخیر کی مدت کے حساب سے مختلف بھی ہو سکتی ہے اور اس کا حساب سالانہ فیصد کی بنیاد پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے لیز کے معاہدے میں درجِ ذیل شق شامل کی جا سکتی ہے:

> ''مستاجر (Lessee) بذریعہ ہذا یہ عہد کرتا ہے کہ اگر وہ مقررہ تاریخ تک کرایہ ادا کرنے سے قاصر رہا تو وہ...... فیصد سالانہ کے حساب سے رقم ایسے خیراتی فنڈ میں جمع کرائے گا جو موجر (Lessor) کے زیرِ انتظام ہوگا اور جسے صرف موجر ہی شریعت کے مطابق خیراتی کاموں کے لئے استعمال کرے گا اور یہ فنڈ کسی بھی صورت میں موجر کی آمدن کا حصہ نہیں ہوگا۔''

اس انتظام سے اگر چہ موجر کو متوقع منافع (Opportunity Cost) کا معاوضہ نہیں ملے گا لیکن یہ مستاجر کی طرف سے بروقت ادائیگی کے سلسلے میں (تاخیر سے) مضبوط رکاوٹ کا کام ضرور دے گا۔

مستاجر کی طرف سے اس طرح کی ذمہ داری لینے کے جواز اور موجر کے لئے اپنے نفع کی خاطر کسی قسم کی تعویض یا جرمانے کے عدم جواز پر مرابحہ کے باب میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے، جسے وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

لیز کو ختم کرنا

۶۔　اگر مستاجر معاہدے کی کسی شرط کی خلاف ورزی کرے تو موجر کو حق حاصل ہے کہ وہ لیز کو یک طرفہ طور پر ختم کردے، البتہ اگر مستاجر کی طرف سے کسی شرط کی خلاف ورزی نہیں ہوئی تو لیز کو باہمی رضامندی کے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ فنانشل لیز کے بعض معاہدوں میں یہ ملاحظہ کیا گیا ہے کہ موجر کو جب وہ چاہے اپنی یک طرفہ مرضی اور فیصلے سے لیز ختم کرنے کا غیر محدود اختیار دے دیا جاتا ہے، یہ شریعت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

۷۔　فنانشل لیز کے بعض معاہدوں میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ لیز کے خاتمے کی صورت میں لیز کی باقی ماندہ مدت کا کرایہ بھی مستاجر پر واجب الادا ہوگا، اگر چہ لیز کا خاتمہ موجر کی مرضی سے ہوا ہو۔

یہ شرط ظاہر ہے کہ شریعت اور عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اس شرط کو شامل کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ معاہدے کے پیچھے بنیادی تصور سودی قرضے ہی کا ہوتا ہے جو لیز کے ظاہری لبادے میں دیا جانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیز کے معاہدے کے منطقی نتائج سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ اس طرح کی شرط شرعاً قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ لیز کے خاتمے کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ موجر اپنی چیز واپس لے لے۔ مستاجر سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ لیز کے خاتمے کی تاریخ تک کا کرایہ ادا کرے۔ اگر لیز کا خاتمہ مستاجر کے غلط استعمال یا کسی کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کے غلط استعمال یا کوتاہی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا معاوضہ بھی موجر طلب کرسکتا ہے۔ لیکن اسے باقی ماندہ مدت کے کرائے کی ادائیگی پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔

اثاثے کی انشورنس

۸۔ اگر لیز پر دیئے گئے اثاثے کی اسلامی طریقۂ تکافل کے مطابق انشورنس کرائی جاتی ہے تو وہ موجر کے خرچ پر ہونی چاہئے مستاجر کے خرچ پر نہیں۔

اثاثے کی باقی ماندہ قیمت

۹۔ جدید تمویلی اجارہ (Financial Lease) کی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لیز کی مدت پوری ہونے کے بعد لیز پر دیئے گئے اثاثے کی ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ چونکہ موجر (Lessor) اپنی لاگت اضافی نفع کے ساتھ وصول کر چکا ہوتا ہے اور یہ نفع عموماً اس سود کے برابر ہوتا ہے جو اس مدت کے دوران اس رقم پر حاصل کیا جا سکتا تھا اس لئے اسے (موجر کو) لیز شدہ اثاثے میں مزید دلچسپی نہیں ہوتی، دوسری طرف مستاجر (Lessee) چاہتا ہے کہ لیز کی مدت پوری ہونے کے بعد وہ اثاثہ اس کے پاس ہی رہے۔

ان وجوہات کی بنیاد پر لیز شدہ اثاثہ لیز کی مدت پوری ہونے کے بعد عموماً مستاجر کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ کبھی بغیر معاوضے کے اور کبھی برائے نام قیمت پر۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ یہ اثاثہ مستاجر کی طرف منتقل کر دیا جائے گا لیز کے معاہدے میں یہ شرط صراحتاً شامل کر دی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ شرط صراحتاً تو ذکر نہیں کی جاتی لیکن یہ بات فریقین میں معہود اور طے شدہ سمجھی جاتی ہے کہ لیز کی مدت ختم ہونے کے بعد اس اثاثے کی ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

یہ شرط، خواہ صراحتاً مذکور ہو یا عملاً طے شدہ سمجھی جائے، دونوں صورتوں میں شریعت کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ یہ اسلامی فقہ کا معروف اصول ہے کہ ایک عقد اور معاہدے کو دوسرے کے ساتھ اس انداز سے منسلک نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دوسرے کے لئے پیشگی شرط کی حیثیت رکھتا ہو۔ یہاں پر اثاثے کے مستاجر کی طرف انتقال کو لیز کے معاہدے کے لئے پیشگی لازمی شرط قرار دیا گیا ہے جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

شریعت میں اصل پوزیشن یہ ہے کہ یہ اثاثہ صرف موجر (Lessor) کی ملکیت ہوگا اور لیز کی مدت پوری ہونے کے بعد اسے یہ آزادی ہوگی کہ چاہے تو یہ اثاثہ واپس لے لے، یا لیز کی تجدید کر لے، یا کسی اور کو لیز پر دے دے، یا یہ اثاثہ مستاجر یا کسی اور شخص کو بیچ دے۔ مستاجر اسے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اسے برائے نام قیمت پر بیچے اور نہ ہی اس طرح کی شرط لیز کے معاہدے میں

لگائی جاسکتی ہے۔البتہ لیز کی مدت کے خاتمے کے بعد اگر موجر وہ اثاثہ مستاجر کو بطور ھبہ دینا چاہے یا اسے بیچنا چاہے تو وہ اپنی رضامندی سے ایسا کرسکتا ہے۔

تاہم بعض معاصر سکالرز نے اسلامی مالیاتی اداروں کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک متبادل تجویز کیا ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ عقد اجارہ خود تو مدت ختم ہونے پر اثاثہ بیچنے یا اسے ہبہ کرنے کی شرط پر مشتمل نہیں ہونا چاہئے، البتہ موجر یک طرفہ وعدہ کرسکتا ہے کہ وہ لیز کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ اثاثہ مستاجر کو بیچ دے گا، یہ وعدہ صرف موجر پر لازم ہوگا۔ان حضرات کا کہنا ہے کہ اصول یہ ہے کہ مستقبل میں کوئی عقد کرنے کا یک طرفہ وعدہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ وعدہ کرنے والا تو وعدہ پورا کرنے کا پابند ہو لیکن جس سے وعدہ کیا گیا ہے وہ اس عقد میں داخل ہونے کا پابند نہ ہو، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے (مستاجر کو) خریدنے کا اختیار حاصل ہے جسے وہ استعمال کر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی کرسکتا، البتہ اگر وہ خریدنے کے اس اختیار کو استعمال کرنا چاہے تو وعدہ کرنے والا اس سے انکار نہیں کرسکتا اس لئے کہ وہ اپنے وعدے کا پابند ہے، اس لئے یہ سکالرز یہ تجویز کرتے ہیں کہ لیز کے معاہدے میں داخل ہونے کے بعد موجر ایک الگ یک طرفہ وعدے پر دستخط کرے جس کے ذریعے سے وہ اس بات کا عہد کرے کہ اگر مستاجر کرایہ پورا کا پورا ادا کر دیتا ہے اور وہ باہمی رضامندی سے طے شدہ قیمت پر وہ اثاثہ خریدنا چاہتا ہے تو وہ اس قیمت پر اثاثہ اسے بیچ دے گا۔

جب ایک مرتبہ موجر نے وعدے پر دستخط کر دیئے تو وہ وعدے کو پورا کرنے کا پابند ہے، اور مستاجر اگر خریدنے کے اپنے اختیار کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے اس صورت میں استعمال کرسکتا ہے جبکہ وہ لیز کے طے شدہ معاہدے کے مطابق کرایہ پورے طور پر ادا کر چکا ہو۔

اسی طرح ان سکالرز نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ موجر بیع کی بجائے مدت کے اختتام پر اثاثہ مستاجر کو ہبہ کرنے کا الگ سے وعدہ کرے بشرطیکہ وہ کرائے کی رقم پورے طور پر ادا کر دے۔

اس طریقۂ کار کو ''اجارۃ واقتناء'' کہا جاتا ہے۔اس کی بہت بڑی تعداد میں معاصر علماء نے اجازت دی ہے۔اس پر اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں میں وسیع پیانے پر عمل ہورہا ہے۔اس طریقۂ کار کا جواز دو بنیادی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ اجارہ (Lease) کا معاہدہ بذاتِ خود وعدۂ بیع یا وعدۂ ھبہ پر دستخط کرنے کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہونا چاہئے، بلکہ یہ وعدہ الگ دستاویز کے ذریعے ہونا چاہئے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وعدہ یک طرفہ ہونا چاہئے اور صرف وعدہ کرنے والے پر لازم ہونا

چاہئے، یہ دو طرفہ معاہدہ نہیں ہونا چاہئے جو فریقین پر لازم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں یہ ایک مکمل عقد ہوگا جو کہ مستقبل کی ایک تاریخ کو موثر ہو رہا ہے اور ایسا کرنا بیع اور ھبہ کی صورت میں جائز نہیں ہے۔

ضمنی اجارہ (Sub-Lease)

۱۰۔ اگر لیز پر لیا گیا اثاثہ ایسا ہے جسے مختلف استعمال کرنے والے مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں (یعنی استعمال کنندہ کے مختلف ہونے سے اس چیز پر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں) تو مستاجر (Lessee) موجر (Lessor) کی واضح اجازت کے بغیر آگے کسی اور کو کرائے پر نہیں دے سکتا۔ اگر موجر آگے کسی اور کو اجارہ پر دینے کی اجازت دے دیتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اگر اس دوسرے ضمنی اجارے (Sub-Lease) سے حاصل ہونے والا کرایہ اس کرائے کے برابر یا اس سے کم ہے جو مالک (اصل موجر) کو ادا کیا جانا ہے تو تمام معروف فقہاء اس کے جواز پر متفق ہیں۔ لیکن اگر ضمنی اجارے (Sub-Lease) سے حاصل ہونے والا کرایہ مالک کو ادا کیے جانے والے کرائے سے زائد ہے تو اس کے بارے میں فقہاء کے نقطہ ہائے نظر مختلف ہیں۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک یہ جائز ہے اور دوسری لیز (Sub-Lease) سے حاصل ہونے والا زائد کرایہ استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ فقہ حنبلی میں بھی اسی نقطۂ نظر کو راجح قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سب لیز سے حاصل ہونے والا زائد کرایہ اپنے پاس رکھنا اس کے لئے جائز نہیں ہے اور یہ زائد رقم صدقہ کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر اس دوسرے موجر (Sub-Lessor) نے اس اثاثے میں کوئی اضافہ کر کے اسے ترقی دی ہے یا یہ اسے کرایہ پر ایسی کرنسی میں دیتا ہے جو اس کرنسی سے مختلف ہے جس میں یہ خود مالک کو کرایہ ادا کرتا ہے تو یہ اس ضمنی اجارے (Sub-Lease) سے زائد کرایہ لے سکتا اور اسے اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔[۱]

اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کا نقطۂ نظر زیادہ محتاط ہے اور ممکنہ حد تک اس پر عمل بھی کرنا چاہئے لیکن ضرورت کے مواقع پر فقہ شافعی اور فقہ حنبلی پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اس زائد رقم کی قرآن و حدیث میں کوئی صریح ممانعت موجود نہیں ہے۔ ابن قدامہ نے اس زائد مقدار کے جواز پر مضبوط دلائل ذکر کیے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: ابن قدامہ: المغنی، ج۵، ۴۷۵، ریاض، ۱۹۸۱ء اور ابن عابدین: ردالمحتار، ج۵۔

لیز کا انتقال

۱۱۔ موجر لیز شدہ جائیداد کسی تیسرے شخص کو بھی بیچ سکتا ہے، جس کی وجہ سے موجر اور مستاجر ہونے کا تعلق نئے مالک اور مستاجر کے درمیان قائم ہو جائے گا۔ لیکن لیز شدہ اثاثے کی ملکیت منتقل کیے بغیر خود ہی لیز کو کسی مالی معاوضے کے بدلے میں منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔

دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں اثاثے کی ملکیت دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں ہوئی، بلکہ اسے صرف اس کا کرایہ وصول کرنے کا حق حاصل ہوا ہے، اس طرح کی تفویض (حوالہ) شرعاً صرف اسی صورت میں جائز ہے جبکہ اس شخص سے کوئی معاوضہ وصول نہ کیا جائے جس کی طرف یہ حق منتقل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک موجر مستاجر سے کرایہ وصول کرنے کا حق اپنے بیٹے یا اپنے دوست کی طرف ہدیے کے طور پر منتقل کر سکتا ہے، اسی طرح موجر یہ اختیار اپنے قرض خواہ کی طرف منتقل کر سکتا ہے، تاکہ کرائے کے ذریعے اس کے قرض کی ادائیگی ہو سکے، لیکن اگر موجر کسی کو متعین قیمت کے بدلے میں بیچنا چاہتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں زر (کرایہ کی رقم) کی بیع زر کے بدلے میں ہو رہی ہے، جس کا جواز برابری کے اصول کے ساتھ مشروط ہے، وگرنہ یہ رِبا بن جائے گا جو کہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

اجارہ کے تمسکات جاری کرنا

اجارہ کے انتظام میں تمسکات بنانے کے بہت اچھے امکانات ہیں جن کے ذریعے سے اجارہ کی بنیاد پر تمویل کرنے والوں کے لئے ثانوی بازار وجود میں لانے میں مدد مل سکتی ہے۔ چونکہ اجارہ میں موجر اثاثے کا مالک ہے اس لئے وہ اسے کُلی یا جزوی طور پر تیسرے فریق کو بیچ بھی سکتا ہے، جس کے ذریعے سے خریدار اور خریدے ہوئے حصے کی حد تک موجر والے حقوق اور ذمہ داریوں میں بائع کے قائم مقام ہوگا۔ (۱)

لہٰذا اگر موجر عقد اجارہ میں داخل ہونے کے بعد چاہتا ہے کہ وہ اثاثے کی خریداری پر اُٹھنے والی لاگت بمع منافع وصول کر لے تو وہ یہ اثاثہ کُلی یا جزوی طور پر ایک شخص یا کئی افراد کو بیچ سکتا ہے۔

---

(۱) بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع اس وقت تک مؤثر نہیں ہوگی جب تک کہ اجارے کی مدت پوری نہ ہو جائے، تاہم امام ابو یوسف اور بعض دیگر فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ بیع درست ہے اور خریدار بائع کی جگہ پر ہوگا اور اجارہ جاری رہ سکتا ہے۔ (دیکھئے ردالمحتار لابن عابدین، ج۴، ص۵۷)

دوسری صورت میں (کئی افراد کو بیچنے کی صورت میں) ہر فرد نے اثاثے کا جتنا حصہ خریدا ہے اس کے ثبوت کے طور پر ایک سرٹیفکیٹ جاری کیا جاسکتا ہے جسے ''اجارہ سرٹیفکیٹ'' کہا جاسکتا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ لیز شدہ اثاثے میں حامل کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرے گا اور حامل اتنے حصے کی حد تک مالک / موجر کے حقوق اور ذمہ داریاں اُٹھائے گا۔ اثاثہ چونکہ پہلے متاجر کو اجارے پر دیا جاچکا ہے اس لئے یہ اجارہ نئے مالکان کے ساتھ جاری رہے گا۔ سرٹیفکیٹ ہولڈرز میں سے ہر شخص کو اثاثے کی ملکیت میں اس کے متناسب حصے کے مطابق کرایہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اسی طرح اس ملکیت کی حد تک اس پر موجر کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوں گی۔ یہ سرٹیفکیٹ چونکہ ایک مادی اور حسی اثاثے میں ملکیت کا ثبوت ہیں اس لئے مارکیٹ میں ان کی تجارت اور تبادلہ آزادانہ طور پر کیا جاسکتا ہے، اور یہ سرٹیفکیٹ ایسی دستاویز کا کام دے سکتے ہیں جنھیں بآسانی نقد رقم میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اس سے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کی سیولیت (Liquidity) کی مشکلات حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

یہ ذہن میں رہے کہ یہ لازمی ہے کہ سرٹیفکیٹ اثاثے میں مشاع (غیر منقسم) حصے کی ملکیت کی اس کے تمام حقوق و فرائض کے ساتھ نمائندگی کرتے ہوں۔ اس بنیادی تصور کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض حلقوں کی طرف سے ایسے سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی کوشش کی گئی جن میں اثاثے میں کسی قسم کی ملکیت تفویض کیے بغیر حامل کے صرف کرائے کی مخصوص رقم حاصل کرنے کے حق کی نمائندگی کی گئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سرٹیفکیٹ کے حامل کا لیز شدہ اثاثے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا حق صرف اتنا ہے کہ وہ متاجر سے حاصل ہونے والے کرائے میں حصہ دار بنے۔ دستاویز جاری کرنے کا یہ طریقہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ اسی باب میں پہلے بیان کیا گیا کہ کرایہ واجب الادا ہونے کے بعد ایک دین (Debt) ہے جسے متاجر ادا کرے گا۔ دین یا دین کی نمائندگی کرنے والی دستاویز شرعاً قابلِ مبادلہ دستاویز نہیں ہے، اس لئے کہ اس طرح کی دستاویز کی خرید و فروخت زر یا مالیاتی ذمہ داری کی خرید و فروخت کے مترادف ہے جو کہ برابری کا اصول مدِنظر رکھے بغیر شرعاً جائز نہیں ہے، اور اگر خرید و فروخت کرتے وقت قیمت میں برابری کو مدِنظر رکھا جائے تو دستاویز جاری کرنے کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا ہے، اس لئے اس طرح ''اجارہ سرٹیفکیٹ'' ثانوی بازار وجود میں لانے کا مقصد پورا نہیں کرسکتے۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اجارہ سرٹیفکیٹ کو اس انداز سے ڈیزائن کیا جائے کہ وہ لیز شدہ اثاثے میں حقیقی ملکیت کی نمائندگی کریں، صرف کرایہ حاصل کرنے کے حق کی نمائندگی نہ کریں۔

ہیڈ لیز (Head-Lease)

لیزنگ کے جدید کاروبار میں ایک اور تصور وجود میں آیا ہے اور وہ ہے ''ہیڈ لیز'' کا تصور۔ اس میں متاجر اثاثہ کئی ثانوی متاجرین کو اجارے پر دے دیتا ہے، پھر وہ دوسرے لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے کاروبار میں شریک ہوں، اس طرح سے کہ وہ متاجرین سے حاصل ہونے والے کرایوں میں انہیں حصہ دار بنا لیتا ہے، اور اس پر وہ ان شرکاء سے متعین رقم وصول کرتا ہے۔ یہ انتظام شریعت کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ وجہ واضح ہے کہ متاجر اس اثاثے کا مالک تو ہے نہیں، وہ صرف اس کے حق استعمال (Usufruct) سے فائدہ اُٹھانے کا حق دار ہے۔ یہ حق استعمال اس نے ثانوی اجارہ (Sub-Lease) کر کے ان متاجرین (Lessees) کو منتقل کر دیا ہے۔ اب یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے، نہ خود اثاثے کا اور نہ ہی حق استعمال کا۔ یہ اب صرف کرایہ وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، اس لئے اب یہ اپنے اس حق کا کچھ حصہ دوسرے افراد کو تفویض کر رہا ہے۔ یہ بات پہلے تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے کہ اس حق کی تجارت نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ یہ قابلِ وصول دین کو کم قیمت پر فروخت کرنے کے مترادف ہے جو کہ رِبا کی ایک شکل ہے جس سے قرآن وسنت میں منع کیا گیا ہے۔

یہ تمویلی اجارہ (Financial Lease) کی چند ایسی بنیادی خصوصیات ہیں جو شرعی احکام کے مطابق نہیں ہیں۔ لیز کو بطور اسلامی طریقۂ تمویل استعمال کرتے وقت ان غلطیوں سے بچنا ضروری ہے۔

لیز کے معاہدے میں واقع ہونے والی ممکنہ غلطیوں کی فہرست انہی باتوں تک محدود نہیں ہے جو اوپر بیان کی گی ہیں، بلکہ اس باب میں صرف ان بنیادی غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو لیز کے معاہدوں میں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اسلامی لیز کے بنیادی اصول اور مختصراً بیان کر دیئے گئے ہیں، اسلامی لیز کے معاہدے میں ان سب کی رعایت ہونی چاہئے۔
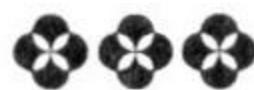
سلم اور استصناع

سلم اور استصناع

شرعاً کسی بیع کے صحیح ہونے کے لئے بنیادی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جس چیز کی بیع کا ارادہ ہے وہ بیچنے والے کے حسی یا معنوی قبضے میں ہو، اس شرط میں تین باتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) وہ چیز موجود ہو، لہٰذا ایسی چیز جو ابھی وجود میں نہیں آئی وہ بیچی نہیں جاسکتی۔

(۲) بیچی جانے والی چیز پر بائع کی ملکیت آچکی ہو، لہٰذا وہ چیز موجود تو ہے لیکن بائع اس کا مالک نہیں ہے تو وہ اس کی بیع نہیں کرسکتا۔

(۳) صرف ملکیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بائع کے قبضے میں ہونی چاہئے۔ خواہ یہ قبضہ حسی ہو یا معنوی۔ اگر بائع اس چیز کا مالک تو ہے لیکن وہ خود یا اپنے کسی وکیل کے ذریعے اسے قبضے میں نہیں لایا تو وہ اسے بیچ نہیں سکتا۔

شریعت کے اس عمومی اصول سے صرف دو صورتیں مستثنیٰ ہیں، ایک سلم اور دوسری استصناع۔ دونوں مخصوص نوعیت کی بیع ہیں۔ اس باب میں یہ بتایا جائے گا کہ ان کا تصور کیا ہے اور انہیں کس حد تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سلم کا معنی

''سلم'' ایک ایسی بیع ہے جس کے ذریعے بائع یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ وہ مستقبل کی کسی تاریخ میں متعین چیز خریدار کو فراہم کرے گا اور اس کے بدلے میں مکمل قیمت بیع کے وقت ہی پیشگی لے لیتا ہے۔

یہاں قیمت نقد ہے لیکن مبیع (بیچے جانے والی چیز) کی ادائیگی مؤجل اور مؤخر ہے۔ خریدار کو ''رب السلم'' اور بائع کو ''مسلم الیہ'' اور خریدی ہوئی چیز کو ''مسلم فیہ'' کہا جاتا ہے۔

سلم کی حضور اقدس ﷺ نے مخصوص شرائط کے ساتھ اجازت دی تھی۔ اس بیع کا بنیادی مقصد چھوٹے کاشتکاروں کی ضرورت کو پورا کرنا تھا جنہیں اپنی فصل اُگانے کے لئے اور فصل کی کٹائی تک اپنے بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ ربا کی حرمت کے بعد وہ سودی قرضہ نہیں لے سکتے تھے، اس لئے انہیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنی زرعی پیداوار پیشگی

قیمت پر فروخت کردیں۔

اسی طرح عرب تاجر دوسرے علاقوں کی طرف کچھ اشیاء برآمد کرتے تھے اور وہاں سے اپنے علاقے میں کچھ چیزیں درآمد کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہیں رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ ربا کی حرمت کے بعد یہ لوگ سودی قرضہ نہیں لے سکتے تھے، اس لئے انہیں اجازت دی گئی کہ وہ پیشگی قیمت پر یہ اشیاء فروخت کردیں۔ نقد قیمت وصول کر کے یہ لوگ اپنا مذکورہ بالا کاروبار بآسانی جاری رکھ سکتے تھے۔

سلم سے بائع کو بھی فائدہ پہنچتا تھا اس لئے کہ قیمت پیشگی مل جاتی تھی اور خریدار کو بھی فائدہ پہنچتا تھا اس لئے کہ سلم میں قیمت عموماً نقد سودے کی نسبت کم ہوتی تھی۔

سلم کی اجازت اس عام قاعدے سے ایک استثناء ہے جس کے مطابق مستقبل کی طرف منسوب بیع جائز نہیں ہے۔ سلم کی یہ اجازت چند کڑی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، ان شرائط کو ذیل میں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

سلم کی شرائط

۱۔ سلم کے جائز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدار پوری کی پوری قیمت عقد کے وقت ادا کردے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر عقد کے وقت خریدار قیمت کی مکمل ادائیگی نہ کرے تو یہ دین کے بدلے میں دین کی بیع کے مترادف ہوگا، جس سے رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً منع فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں سلم کے جواز کی بنیادی حکمت بائع کی فوری ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ اگر قیمت اسے مکمل طور پر ادا نہیں کی جاتی تو عقد کا بنیادی مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس لئے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ سلم میں قیمت کی مکمل ادائیگی ضروری ہے، البتہ امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ بائع خریدار کو دو یا تین دن کی رعایت دے سکتا ہے، یہ رعایت عقد کا باقاعدہ حصہ نہیں ہونی چاہئے۔ (۱)

۲۔ سلم صرف انہی اشیاء میں ہوسکتی ہے جن کی کوالٹی اور مقدار کا پیشگی پورے طور پر تعین ہوسکتا ہو۔ ایسی اشیاء جن کی کوالٹی یا مقدار کا تعین نہ کیا جا سکتا ہو انہیں "سلم" کے ذریعے نہیں بیچا جا سکتا۔ مثال کے طور پر قیمتی پتھروں کی سلم کی بنیاد پر بیع نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ ان کا ہر ٹکڑا اور فرد عموماً دوسرے سے معیار، سائز یا وزن میں مختلف ہوتا ہے اور ان کی بیان کے ذریعے تعین عموماً ممکن نہیں ہوتی۔

۳۔ کسی متعین چیز یا متعین کھیت یا فارم کی پیداوار کی بیع سلم نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اگر بائع یہ ذمہ داری

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی، ج۴، ص۳۲۸۔

قبول کرتا ہے کہ وہ متعین کھیت کی گندم یا متعین درخت کا پھل مہیا کرے گا تو سلم صحیح نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ ادائیگی سے پہلے ہی اس کھیت کی پیداوار یا اس درخت کا پھل ہلاک ہو۔ اس امکان کی وجہ سے بیچی ہوئی چیز کی ادائیگی غیر یقینی رہے گی۔ یہ قاعدہ ہر اس چیز پر لاگو ہوگا جس کی فراہمی یقینی نہ ہو جائے۔ (۱)

۴۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی سلم کرنا مقصود ہے اس کی نوعیت اور معیار واضح طور پر متعین کر لیا جائے، جس میں کوئی ایسا ابہام باقی نہ رہے جو بعد میں تنازع کا باعث بن سکتا ہو، اس سلسلے میں تمام ممکنہ تفصیلات واضح طور پر ذکر کر لینی چاہئیں۔

۵۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بیچی جانے والی چیز کی مقدار بغیر کسی ابہام کے متعین کر لی جائے۔ اگر چیز کی مقدار تاجروں کے عرف میں وزن کے ذریعے متعین کی جاتی ہے (یعنی وہ چیز تول کر بکتی ہے) تو اس کا وزن متعین ہونا ضروری ہے، اور اگر اس کی مقدار کا تعین پیائش کے ذریعے ہوتا ہے تو اس کی متعین پیائش معلوم ہونی چاہئے۔ جو چیز عموماً تولی جاتی ہے اس کی مقدار کا تعین (سلم کی صورت میں) پیائش کے ذریعے سے نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح پیائش کی جانے والی چیز کی مقدار وزن میں متعین نہیں ہونی چاہئے۔

۶۔ بیچی گئی چیز کی سپردگی کی تاریخ اور جگہ کا تعین بھی عقد کے اندر ہونا چاہئے۔

۷۔ بیع سلم ایسی اشیاء کی نہیں ہوسکتی جن کی فوری ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر سونے کی بیع چاندی کے بدلے میں ہورہی ہے تو شرعاً ضروری ہے کہ دونوں چیزوں کی ادائیگی ایک ہی وقت میں ہو۔ یہاں بیع سلم کارگر نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر گندم کی بیع جو کے بدلے میں ہورہی ہو تو بیع کے صحیح ہونے کے لئے دونوں چیزوں پر ایک ہی وقت میں قبضہ ہونا ضروری ہے، اس لئے اس صورت میں سلم کا معاہدہ جائز نہیں ہے۔

تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ سلم اس وقت تک صحیح نہیں ہوتی جب تک ان شرائط کو مکمل طور پر پورا نہیں کرلیا جاتا، اس لئے کہ یہ شرائط ایک صریح حدیث پر مبنی ہیں، اس سلسلے میں ایک معروف حدیث یہ ہے:

> من اسلف فی شیء فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم۔
> جو شخص سلم کرنا چاہتا ہے اسے سلم کرنی چاہئے متعین پیائش اور متعین وزن میں ایک طے شدہ مدت تک۔ (۲)

---

(۱) ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی، ج۴، ص ۳۲۵، ریاض، ۱۹۸۱۔ (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں:

البتہ ان شرائط کے علاوہ کچھ اور شرطیں بھی ہیں جن کے بارے میں مختلف فقہی مکاتبِ فکر کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں، ان شرائط پر ذیل میں بحث کی جارہی ہے:

(۱) فقہ حنفی کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی بیع سلم ہورہی ہے وہ معاہدہ طے پانے کے دن سے قبضہ کے دن تک مارکیٹ میں دستیاب ہو، لہٰذا اگر عقد سلم کے وقت وہ چیز بازار میں دستیاب نہیں ہے تو اس کی بیع سلم نہیں ہوسکتی، اگرچہ اس بات کی توقع ہو کہ قبضے کے وقت وہ چیز بازار میں دستیاب ہوگی۔ (۱)

لیکن فقہ شافعی، مالکی اور حنبلی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ معاہدے کے وقت اس چیز کا دستیاب ہونا سلم کے صحیح ہونے کے لئے شرط نہیں ہے۔ ان کے ہاں جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ چیز قبضے کے وقت دستیاب ہو۔ (۲) موجودہ حالات میں اس نقطۂ نظر پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ (۳)

(۲) فقہ حنفی اور فقہ حنبلی کی رو سے یہ ضروری ہے کہ قبضے کی مدت عقد کے وقت سے کم از کم ایک ماہ ہو۔ اگر قبضے کا وقت ایک مہینے سے پہلے کا مقرر کرلیا گیا تو سلمؑ صحیح نہیں ہوگی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سلم کی اجازت چھوٹے کاشتکاروں اور تاجروں کی ضرورت کے لئے دی گئی ہے لہٰذا انہیں وہ چیز مہیا کرنے کے لئے مناسب وقت ملنا چاہئے۔ ایک مہینے سے پہلے وہ یہ سامان مہیا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے، علاوہ ازیں سلم میں قیمت نقد سودے کی نسبت کم ہوتی ہے، قیمت میں یہ رعایت تب ہی قرینِ انصاف ہوگی جبکہ یہ سامان ایسی مدت کے بعد سپرد کیا جائے جس کا قیمتوں پر معقول اثر پڑسکتا ہو۔ ایک مہینے سے کم مدت عموماً قیمتوں پر اثر انداز نہیں ہوتی، لہٰذا ادائیگی کا کم از کم وقت ایک مہینے سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ (۴)

امام مالکؒ اس بات سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ سلم کے معاہدے کے لئے کم سے کم مدت ہونی چاہئے، لیکن ان کا موقف یہ ہے کہ یہ مدت پندرہ دن سے کم نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ مارکیٹ کے ریٹ دو ہفتوں کے اندر اندر تبدیل ہوسکتے ہیں۔ (۵)

اس نقطۂ نظر سے (کہ کم از کم مدت شرعاً متعین ہے) دوسرے فقہاء مثلاً امام شافعیؒ اور بعض حنفی فقہاء نے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے سلم کے صحیح ہونے کے لئے کم از کم

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) یہ حدیث صحاح ستہ میں روایت کی گئی ہے (دیکھئے: ابن الہمام، فتح القدیر، ج ۶، ص ۲۰۵)

(۱) الکاسانی، بدائع الصنائع، ج ۵، ص ۲۱۱۔ (۲) ابن قدامہ، المغنی، ج ۴، ص ۳۲۶۔

(۳) تھانوی، اشرف علی، امداد الفتاویٰ، ج ۳، ص ۲۷ (۴) ابن قدامہ، المغنی، ج ۴، ص ۳۲۳۔

(۵) دردیر، الشرح الصغیر، ج ۳، ص ۲۷۵، اور الخرشی، ج ۳، ص ۳۰۔

مدت کا تعین نہیں فرمایا، حدیث کے مطابق شرط صرف یہ ہے کہ قبضے کا وقت واضح طور پر متعین ہونا چاہئے، لہٰذا کوئی کم از کم مدت بیان نہیں کی جاسکتی، فریقین باہمی رضامندی سے قبضے کی کوئی بھی تاریخ متعین کر سکتے ہیں۔

موجودہ حالات میں یہ نقطۂ نظر قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ نے کوئی کم از کم مدت متعین نہیں کی۔ فقہاء نے مختلف مدتیں ذکر کی ہیں جو ایک دن سے لے کر ایک مہینے تک ہیں۔ ظاہر ہے کہ فقہاء نے یہ مدتیں غریب بائع کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے تقاضائے مصلحت سمجھ کر مقرر کی ہیں، لیکن مصلحت، وقت اور جگہ کے بدلنے سے بدل سکتی ہے۔ بعض اوقات زیادہ قریب کی تاریخ مقرر کرنا بائع کے زیادہ مفاد میں ہوسکتا ہے۔ جہاں تک قیمت کا تعلق ہے تو یہ سلم کا لازمی عنصر نہیں ہے کہ سلم میں قیمت ہمیشہ اس دن کی بازاری قیمت سے کم ہی ہو، بائع اپنے مفاد کا خود بہتر فیصلہ کرسکتا ہے۔ اگر وہ اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے کی کوئی تاریخ قبضہ کرانے کے لئے مقرر کر لیتا ہے تو اس کی کوئی وجہ نہیں کہ اسے ایسا کرنے سے روکا جائے۔ بعض معاصر فقہاء نے اس نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے، اس لئے کہ یہ جدید معاہدوں کے لئے زیادہ موزوں ہے۔[1]

سلم بطور طریقۂ تمویل

پیچھے مذکور بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شریعت نے سلم کی اجازت کاشتکاروں اور تاجروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے دی ہے۔ اس لئے یہ بنیادی طور پر چھوٹے تاجروں اور کاشتکاروں کے لئے ایک طریقۂ تمویل ہے۔ یہ طریقۂ تمویل جدید بینکوں اور مالیاتی اداروں میں بھی استعمال ہوسکتا ہے خاص طور پر زرعی شعبے کی تمویل کے لئے۔ یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ سلم میں قیمت ان چیزوں کی نسبت کم ہوسکتی ہے جنہیں ادا کیا جانا ہو، اس طرح سے ان دو قیمتوں کے درمیان جو فرق ہوگا وہ بینکوں اور مالیاتی اداروں کا جائز منافع ہوگا۔ یہ بات یقینی بنانے کے لئے کہ بائع مطلوبہ چیز طے شدہ وقت پر مہیا کردے گا اس سے سیکورٹی کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے جو ضمانت یا رہن وغیرہ کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ نادہندگی کی صورت میں ضامن سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ وہی چیز مہیا کرے اور رہن کی صورت میں خریدار / تمویل کار مرہون چیز بیچ کر اس کی قیمت سے مطلوبہ چیز بازار سے خرید سکتا ہے یا پیشگی دی ہوئی قیمت وصول کرسکتا ہے۔

واحد مشکل جو جدید مالیاتی اداروں اور بینکوں کو پیش آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے کلائنٹس

---

(۱) اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ، ج ۳۔

سے نقد رقم کی بجائے اشیاء وصول کریں گے۔ چونکہ یہ بینک صرف رقوم کا معاملہ کرنے میں ماہر ہوتے ہیں اس لئے یہ بظاہر ان پر بوجھ محسوس ہوگا کہ وہ مختلف کلائنٹس سے مختلف اشیاء وصول کر کے انہیں بازار میں فروخت کریں۔ وہ یہ اشیاء ان پر عملاً قبضہ کرنے سے پہلے نہیں بیچ سکتے اس لئے کہ یہ شریعت میں ممنوع ہے۔

لیکن جب ہم اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی بات کرتے ہیں تو ایک بنیادی نکتہ نظر انداز نہیں ہونا چاہئے، وہ یہ کہ ایسے مالیاتی اداروں کا تصور جو صرف زر (Money) کا لین دین کریں اسلامی شریعت کے لئے اجنبی ہے۔ اگر یہ ادارے حلال نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کسی نہ کسی طرح اشیاء کا لین دین کرنا پڑے گا، اس لئے کہ شریعت میں محض قرض دے کر نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اسلامی معیشت قائم کرنے کے لئے مالیاتی اداروں کے زاویۂ نگاہ اور سوچ میں تبدیلی لانا ہوگی۔ یہ ادارے اشیاء کے معاملات کرنے کے لئے خصوصی سیل قائم کر سکتے ہیں۔ اگر ایسے سیل قائم کر دیئے جائیں تو سلم کے ذریعے اشیاء خریدنا اور انہیں نقد بازار میں بیچنا مشکل نہیں ہوگا۔

تاہم سلم کے معاہدے سے فائدہ اُٹھانے کے دو طریقے اور بھی ہیں۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ کوئی چیز سلم کے طور پر خرید کر مالیاتی ادارہ اسے ایک متوازی عقد سلم کے ذریعے بیچ سکتا ہے۔ جس کی تاریخ ادائیگی بھی پہلی سلم والی ہی ہو۔ دوسری (متوازی) سلم میں چونکہ مدت کم ہوگی اس لئے اس میں قیمت پہلے معاہدے کی نسبت ذرا زیادہ ہوگی، اور ان دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوگا وہ مالیاتی ادارے کو حاصل ہونے والا نفع ہوگا۔ دوسری سلم کی مدت جتنی کم ہوگی قیمت اتنی ہی زیادہ ہوگی اور نفع بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس طریقے سے یہ ادارے اپنے مختصر مدت کی تمویل کے شعبے کو چلا سکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے متوازی سلم کا معاہدہ قابلِ عمل نہیں ہے تو یہ مالیاتی ادارے کسی تیسرے فریق سے خریداری کا وعدہ لے سکتے ہیں۔ یہ وعدہ متوقع خریدار کی طرف سے یک طرفہ ہونا چاہئے۔ چونکہ یہ محض وعدہ ہے عملاً بیع نہیں ہے اس لئے خریدار پیشگی ادائیگی کا پابند نہیں ہے، اس لئے اس میں زیادہ قیمت مقرر کی جا سکتی ہے، اور چونکہ متعلقہ چیز ادارے کو وصول ہوگی وہ وعدے کے مطابق تیسرے فریق کو پہلے سے طے شدہ قیمت پر بیچ دے گا۔

بعض اوقات ایک تیسرا طریقہ بھی تجویز کیا جاتا ہے وہ یہ کہ قبضے کی تاریخ آنے پر وہ چیز بائع ہی کو زیادہ قیمت پر بیچ دی جاتی ہے۔ لیکن یہ تجویز شرعی احکام کے مطابق نہیں ہے۔ شرعاً یہ جائز نہیں ہے کہ خریدار قبضہ کرنے سے پہلے وہ چیز بائع کو بیچ دے، اور اگر یہ سودا زیادہ قیمت پر ہوا ہے تو ربا کے

مترادف ہوگا جو کہ بالکلیہ ممنوع ہے۔ اگر یہ دوسری بیع خریدار کے قبضہ کر لینے کے بعد بھی ہو تب بھی اصل بیع کے وقت اس دوسری بیع کا بندوبست نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہ تجویز قطعاً قابلِ عمل نہیں ہے۔

متوازی سلم کے چند قواعد

چونکہ جدید اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے متوازی سلم کا طریقہ استعمال کر رہے ہیں اس لئے اس طریقِ کار کے صحیح ہونے کے لئے چند شرائط کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

۱۔ متوازی سلم میں بینک دو مختلف معاہدوں میں داخل ہوتا ہے۔ ایک میں بینک خریدار ہے اور دوسرے میں بائع۔ ان میں سے ہر معاہدہ دوسرے سے الگ اور مستقل ہونا چاہئے۔ ان کو اس انداز سے باہم منسلک نہیں کرنا چاہئے کہ ان میں سے ایک کے حقوق اور ذمہ داریاں دوسرے عقد کے حقوق اور ذمہ داریوں پر موقوف ہوں۔ ہر عقد کی اپنی طاقت ہونی چاہئے اور وہ دوسرے پر موقوف اور منحصر نہیں ہونا چاہئے۔

مثال کے طور پر ''الف'' ''ب'' سے گندم کی سو بوریاں بطور سلم خریدتا ہے جس پر قبضہ ۳۱ دسمبر کو کرایا جائے گا۔ ''الف'' ''ج'' سے متوازی سلم کا معاہدہ کر سکتا ہے کہ وہ اسے ۳۱ دسمبر کو گندم کی سو بوریاں فراہم کرے گا، لیکن ''ج'' کے ساتھ متوازی سلم کا معاہدہ کرتے وقت اسے گندم کی فراہمی ''ب'' سے گندم کی وصولی کے ساتھ مشروط نہیں ہونی چاہئے۔ اگر ''ب'' نے ۳۱ دسمبر کو گندم فراہم نہ کی تب بھی ''الف'' کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سو بوری گندم ''ج'' کو مہیا کرے۔ وہ ''ب'' کے خلاف جو ذرائع چاہے استعمال کر سکتا ہے لیکن وہ ''ج'' کو گندم فراہم کرنے کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح اگر ''ب'' نے ''الف'' کو خراب چیز مہیا کی جو طے شدہ اوصاف کے مطابق نہیں ہے تب بھی ''الف'' کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ''ج'' کو اس کے ساتھ طے شدہ معیار کے مطابق چیز مہیا کرے۔

۲۔ متوازی سلم (Parallel Salam) صرف تیسرے فریق کے ساتھ جائز ہے، پہلے معاملے میں جو شخص بائع ہے اسے دوسرے متوازی معاملے میں خریدار نہیں بنایا جا سکتا، اس لئے کہ یہ بائی بیک (Buy Back) معاملہ ہو جائے گا جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر دوسرے معاہدے میں خریدار اپنا مستقل قانونی وجود رکھتا ہے لیکن وہ مکمل طور پر اس شخص کی ملکیت میں ہے جو پہلے معاملے میں بائع تھا تب بھی یہ (دوسرا معاہدہ) جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ عملاً یہ بائی بیک ہی کے مترادف ہوگا۔ مثال کے طور پر A نے B سے گندم کی ہزار بوریاں بطور سلم کے خریدیں۔ B ایک جوائنٹ سٹاک کمپنی ہے،

B کی ایک ذیلی کمپنی C ہے جس کا اپنا ایک الگ قانونی وجود ہے، لیکن مکمل طور پر B کی ملکیت ہے، تو اس صورت میں A، C کے ساتھ متوازی سلم کا معاہدہ نہیں کرسکتا، البتہ اگر C مکمل طور پر B کی ملکیت میں نہیں ہے تو A، C کے ساتھ یہ معاہدہ کرسکتا ہے، اگرچہ بعض شیئر ہولڈرز دونوں (C اور B) میں مشترک ہوں۔

استصناع

استصناع بیع کی دوسری قسم ہے جس میں سودا چیز کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ استصناع کا معنی ہے کسی تیارکنندہ (مینوفیکچرر) کو یہ آرڈر دینا کہ وہ خریدار کے لئے متعین چیز بنا دے۔ اگر تیارکنندہ (Manufacturer) اپنے پاس سے خام مال لگا کر خریدار کے لئے چیز تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے تو استصناع کا عقد وجود میں آ جائے گا، لیکن استصناع کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قیمت فریقین کی رضامندی سے طے کر لی جائے اور مطلوبہ چیز (جس کی تیاری مقصود ہے) کے ضروری اوصاف بھی متعین کر لیے جائیں۔

استصناع کے معاہدے کی وجہ سے تیارکنندہ پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اس چیز کو تیار کرے، لیکن تیارکنندہ کے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے کو نوٹس دے کر معاہدہ منسوخ کرسکتا ہے۔[1] البتہ تیارکنندہ کے کام شروع کر دینے کے بعد معاہدہ یک طرفہ طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

استصناع اور سلم میں فرق

استصناع کی یہ نوعیت مدِنظر رکھتے ہوئے استصناع اور سلم میں کئی فرق ہیں جو یہاں مختصراً بیان کیے جارہے ہیں:

(۱) استصناع ہمیشہ ایسی چیز پر ہوتا ہے جسے تیار کرنے کی ضرورت ہو، جبکہ سلم ہر چیز کی ہوسکتی ہے خواہ اسے تیار کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

(۲) سلم میں یہ ضروری ہے کہ قیمت مکمل طور پر پیشگی ادا کی جائے جبکہ استصناع میں یہ ضروری نہیں ہے۔

(۳) سلم کا عقد جب یہ ایک مرتبہ ہو جائے تو اسے یک طرفہ طور پر منسوخ نہیں کیا جاسکتا جبکہ عقد

---

(۱) ابن عابدین، ردالمحتار، ج۵، ص۲۲۳۔

استصناع کو سامان کی تیاری شروع ہونے سے پہلے منسوخ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) سپردگی کا وقت سلم میں بیع کا ضروری حصہ ہے جبکہ استصناع میں سپردگی کا وقت مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔ (۱)

استصناع اور اجارہ میں فرق

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ استصناع میں تیار کنندہ خود اپنے خام مال سے چیز تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، لہٰذا یہ معاہدہ اس بات کو بھی شامل ہوتا ہے کہ اگر خام مواد تیار کنندہ کے پاس موجود نہیں ہے تو وہ اسے مہیا کرے اور اس بات کو بھی کہ مطلوبہ چیز کی تیاری کے لئے کام کرے۔ اگر خام مواد گاہک کی طرف سے مہیا کیا گیا ہے اور تیار کنندہ سے صرف اس کی محنت اور مہارت مطلوب ہے تو یہ معاہدہ استصناع نہیں ہوگا، اس صورت میں یہ اجارے کا عقد ہوگا، جس کے ذریعے کسی شخص کی خدمات ایک متعین معاوضے کے بدلے میں حاصل کی جاتی ہیں۔

جب مطلوبہ چیز کو بائع تیار کرلے تو اسے خریدار کے سامنے پیش کرے۔ فقہاء کے اس بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں کہ اس مرحلے پر خریدار یہ چیز مسترد کر سکتا ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ خریدار وہ چیز دیکھنے پر اپنا خیار رؤیت استعمال کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ استصناع ایک بیع ہے اور جب کوئی شخص کوئی ایسی چیز خریدتا ہے جو اس نے دیکھی نہیں ہے تو دیکھنے کے بعد اسے سودا منسوخ کرنے کا اختیار رہتا ہے، استصناع پر بھی یہی اصول لاگو ہوگا۔

لیکن امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اگر وہ (فراہم کردہ) فریقین کے درمیان عقد کے وقت طے شدہ اوصاف کے مطابق ہے تو خریدار اسے قبول کرنے کا پابند ہوگا اور وہ خیار رؤیت استعمال نہیں کر سکے گا۔ خلافتِ عثمانیہ میں فقہاء نے اسی نقطۂ نظر کو ترجیح دی تھی اور حنفی قانون اسی کے مطابق مدون کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ جدید صنعت و تجارت میں یہ بڑی نقصان کی بات ہوگی کہ تیار کنندہ نے اپنے تمام وسائل مطلوبہ چیز کی تیاری پر لگا دیئے اس کے بعد خریدار کوئی وجہ بتائے بغیر سودا منسوخ کر دے، اگرچہ فراہم کردہ چیز مطلوبہ اوصاف کے مکمل طور پر مطابق ہو۔ (۲)

فراہمی کا وقت

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے استصناع میں یہ ضروری نہیں ہے کہ سامان کی فراہمی کا وقت

(۱) ابن عابدین، ردالمحتار۔ (۲) دیکھئے: مجلۃ دفعہ نمبر ۳۹۲ اور مقدمہ۔

متعین کیا جائے، تاہم خریدار سامان کی فراہمی کے لئے زیادہ سے زیادہ مدت مقرر کرسکتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تیار کنندہ فراہمی میں متعین وقت سے تاخیر کردے تو خریدار اسے قبول کرنے اور قیمت ادا کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ (۱)

یہ بات یقینی بنانے کے لئے کہ سامان مطلوبہ مدت میں فراہم کردیا جائے گا اس طرح کے بعض جدید معاہدے ایک تعزیری شق پر مشتمل ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں اگر تیار کنندہ فراہمی میں متعین وقت سے تاخیر کردے تو اس پر جرمانہ عائد ہوگا جس کا حساب یومیہ بنیاد پر کیا جائے گا، کیا شرعاً بھی اس طرح کی کوئی تعزیری شق شامل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ فقہاء استصناع پر بحث کے دوران اس سوال پر خاموش نظر آتے ہیں لیکن انہوں نے اس طرح کی شرط کو اجارے میں جائز قرار دیا ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے کپڑوں کی سلائی کے لئے کسی خیاط کی خدمات حاصل کرتا ہے تو فراہمی کے حساب سے اجرت مختلف ہوسکتی ہے۔ مستاجر (جو کپڑے سلوانا چاہتا ہے) یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر خیاط ایک دن میں یہ کپڑے تیار کردے تو وہ سو روپے اجرت دے گا اور اگر وہ دو دن میں تیار کرتا ہے تو وہ اسی (۸۰) روپے دے گا۔ (۲)

اسی طرح سے استصناع میں قیمت کو فراہمی کے وقت کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے، اگر فریقین اس بات پر متفق ہوجائیں کہ فراہمی میں تاخیر کی صورت میں فی یوم متعین مقدار میں قیمت کم ہو جائے گی تو یہ شرعاً جائز ہوگا۔

استصناع بطور طریقۂ تمویل

استصناع کو مخصوص معاہدوں میں تمویل کی سہولت فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر ہاؤس بلڈنگ فائنانس کے شعبے میں۔

اگر کلائنٹ کے پاس اپنی زمین ہے اور وہ گھر کی تعمیر کے لئے تمویل چاہتا ہے تو تمویل کار اس کھلی زمین پر استصناع کی بنیاد پر گھر تعمیر کردینے کی ذمہ داری قبول کرسکتا ہے اور اگر کلائنٹ کے پاس اپنی زمین نہیں ہے اور وہ زمین بھی خریدنا چاہتا ہے تو بھی تمویل کار یہ ذمہ داری قبول کرسکتا ہے کہ وہ اسے زمین کے ایسے قطعے پر تعمیر شدہ گھر مہیا کرے گا جس کی تفصیلات پہلے سے طے کرلی گئی ہوں۔

چونکہ استصناع میں یہ ضروری نہیں کہ قیمت پیشگی ادا کی جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مبیع پر

(۱) ابن عابدین، ردالمحتار، ج۵، ص۲۲۵، وان للاستعجال کان تفرغه غدا کان صحیحا.

(۲) دیکھئے: ابن عابدین، ردالمحتار، ج۵، ص۳۱۱۔

قبضے کے وقت ادا کی جائے (بلکہ قیمت فریقین کے طے شدہ معاہدے کے مطابق کسی بھی وقت تک مؤجل ہوسکتی ہے[1]) اس لئے فریقین جس طرح چاہیں قیمت کی ادائیگی کا وقت اس کے مطابق طے کیا جاسکتا ہے۔قیمتوں کی ادائیگی قسطوں میں بھی ہوسکتی ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ تمویل کار گھر کی خود تعمیر کرے، بلکہ وہ کسی تیسرے فریق کے ساتھ متوازی استصناع کے معاہدے میں بھی داخل ہوسکتا ہے یا وہ کسی ٹھیکے دار کی خدمات بھی حاصل کرسکتا ہے (جو کلائنٹ کے علاوہ ہو)، دونوں صورتوں میں وہ لاگت کا حساب لگا کر استصناع کی قیمت کا تعین اس انداز سے کرسکتا ہے کہ اس سے اسے لاگت پر معقول منافع حاصل ہو جائے۔اس صورت میں کلائنٹ کی طرف سے قسطوں کی ادائیگی عین اس وقت سے بھی شروع ہوسکتی ہے جب فریقین نے معاہدے پر دستخط کیے ہیں اور تعمیر کے دوران اور مکان کلائنٹ کے حوالے کیے جانے کے بعد بھی جاری رہ سکتی ہیں۔قسطوں کی ادائیگی محفوظ بنانے کے لئے زمین یا مکان یا کسی اور جائیداد کا ملکیت نامہ آخری قسط کی ادائیگی تک تمویل کار کے پاس بطور توثیق کے رکھا جاسکتا ہے۔

تمویل کار کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ معاہدے میں طے شدہ بیانات کے بالکل مطابق مکان تعمیر کرے۔کسی بھی فرق کی صورت میں ہر ایسا خرچہ جو اسے معاہدے کی شرائط کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہو، تمویل کار کو برداشت کرنا پڑے گا۔

استصناع کے ذریعے کو منصوبوں کی تمویل (Project Financing) کے لئے بھی انہی خطوط پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔اگر کوئی کلائنٹ اپنی فیکٹری میں ایئر کنڈیشن پلانٹ لگوانا چاہتا ہے اور پلانٹ تیار کرنے کی ضرورت ہے تو تمویل کار استصناع کے معاہدے کے ذریعے پہلے بیان کردہ طریقِ کار کے مطابق پلانٹ مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول کرسکتا ہے، اسی طرح استصناع کے معاہدے کو کسی پل یا شاہراہ کی تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

جدید BOT معاہدات (خریدو، چلاؤ اور منتقل کرو[2]) کو بھی استصناع کی بنیادوں پر تشکیل دیا جاسکتا ہے۔اگر کوئی حکومت ایک ہائی وے تعمیر کرنا چاہتی ہے تو وہ سڑک بنانے والی کمپنی کے ساتھ استصناع کا عقد کرسکتی ہے، اور قیمت کے طور پر اسے مخصوص مدت تک شاہراہ کو چلانے اور ٹول (toll) حاصل کرنے کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔

(۱) اتاسی، شرح المجلۃ، ج ۲، ص ۴۰۶۔

(2) Buy, Operate and Transfer.

اسلامی سرمایہ کاری فنڈ

اسلامی سرمایہ کاری فنڈ

اسلامی سرمایہ کاری فنڈ کے متعلق شرعی اصول

اس باب میں ''اسلامی سرمایہ کاری فنڈ'' (Islamic Investment Funds) کی اصطلاح سے مراد ایسا مشترکہ حوض ہے جس میں سرمایہ کار اپنی ضرورت سے زائد بچی ہوئی رقم شامل کرتے ہیں تاکہ ان رقوم سے حلال منافع حاصل کرنے کے لئے اسلامی شریعت کے بالکل مطابق سرمایہ کاری کی جائے۔ رقم لگانے والوں کو کوئی ایسی دستاویز بھی دی جاسکتی ہے جو ان کی شامل کردہ رقم کی تصدیق کرے اور انہیں فنڈ کو عملاً حاصل ہونے والے منافع میں ان کے حصے کے تناسب سے نفع کا حق دار ٹھہرائے۔ اس دستاویز کو سرٹیفکیٹ، یونٹ، شیئر یا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے، لیکن ان کا شرعی جواز دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ ان (سرٹیفکیٹس) کی لکھی ہوئی قیمت (Face Value) کے حوالے سے ایک خاص نفع متعین کرنے کی بجائے یہ لازمی ہے کہ فنڈ کو حاصل ہونے والے حقیقی منافع کا ایک متناسب حصہ ان کو حاصل ہو، لہٰذا نہ تو اصل رقم کی اور نہ ہی اصل رقم کے ساتھ منسلک کسی متعین نفع کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ فنڈ میں رقم شامل کرنے والوں کو اس واضح تصور کے ساتھ شامل ہونا چاہئے کہ انہیں حاصل ہونے والا فائدہ فنڈ کو حقیقتاً حاصل ہونے والے نفع یا نقصان کے ساتھ منسلک ہے۔ اگر فنڈ کو زیادہ نفع حاصل ہوگا تو ان کا نفع بھی اسی نسبت سے بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر فنڈ کو نقصان ہو جائے تو انہیں اس نقصان میں بھی شریک ہونا ہوگا اِلا یہ کہ نقصان فنڈ کی انتظامیہ کی کسی غفلت یا بدنظمی کی وجہ سے ہوا ہو۔ اس صورت میں فنڈ نہیں بلکہ فنڈ کی انتظامیہ نقصان پورا کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جو رقم اکٹھی کی گئی ہے وہ شرعاً قابلِ قبول کاروبار میں لگائی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف سرمایہ کاری کا شعبہ ہی نہیں بلکہ جن شرطوں پر معاہدہ ہوا ہے ان کا بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

ان بنیادی تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسلامی سرمایہ کاری فنڈ سرمایہ کاری کے مختلف ذرائع کو اختیار کر سکتے ہیں، جن پر ذیل میں مختصر گفتگو کی جاتی ہے۔

ایکویٹی فنڈ (Equity Fund)

ایکویٹی فنڈ میں رقم جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے شیئرز میں لگائی جاتی ہے۔منافع بنیادی طور پر کیپٹل گین (Capital Gain) کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، یعنی شیئرز خرید کر اور ان کی قیمتیں بڑھ جانے پر انہیں بیچ کر۔ متعلقہ کمپنیوں کی طرف سے تقسیم کیے جانے والے منافع منقسمہ (Dividends) کے ذریعے بھی نفع حاصل کیا جاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار شرعاً ناجائز ہے تو اسلامی فنڈ کے لئے اس کے حصص خریدنا، اپنے پاس رکھنا یا انہیں بیچنا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کا منطقی نتیجہ شیئر ہولڈر کا ناجائز کاروبار میں براہِ راست تلوث ہوگا۔

اسی طرح معاصر علماء اس بات پر بھی تقریباً متفق ہیں کہ اگر کسی کمپنی کے تمام معاملات شریعت کے مکمل طور پر مطابق ہیں جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ کمپنی نہ تو سودی قرضہ لیتی ہے اور نہ ہی اپنی زائد رقوم سودی کھاتوں میں رکھواتی ہے تو اس کے شیئرز خریدنا، اپنے پاس رکھنا اور انہیں بیچنا بغیر کسی شرعی رکاوٹ کے جائز ہے، لیکن بظاہر اس طرح کی کمپنیاں موجودہ بازار ہائے حصص میں بہت نادر ہیں۔تقریباً تمام کمپنیاں کسی نہ کسی طرح کسی ایسی سرگرمی میں ملوث ہوتی ہیں جو شرعی احکام کے خلاف ہوتی ہے، اگر چہ ان کا بنیادی کاروبار حلال ہو، تب بھی وہ سودی قرضے لیتی ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی زائد رقوم سودی کھاتوں میں رکھواتی ہیں یا ان سے سودی بانڈز یا تمسکات خریدتی ہیں۔

موجودہ صدی میں اس طرح کی کمپنیوں کا مسئلہ ماہرینِ شریعت کے درمیان زیرِ بحث رہا ہے۔علماء کی ایک جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس طرح کی کمپنیوں کے حصص کا لین دین کرنا جائز نہیں ہے، اگر چہ اس کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہو۔ان کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ ایک کمپنی کا شیئر ہولڈر اس کمپنی کا شریک ہے، اور اسلامی فقہ کی رو سے ہر شریک اس کاروبار کے بارے میں دوسرے شرکاء کا وکیل ہوتا ہے لہٰذا محض کسی کمپنی کے شیئر کا خریدنا ہی شیئر ہولڈر کی طرف سے کمپنی کو یہ اختیار دینا ہے کہ جس طرح کمپنی کی انتظامیہ مناسب سمجھے اپنا کاروبار جاری رکھے۔اگر شیئر ہولڈر کو یہ معلوم ہے کہ کمپنی کسی غیر اسلامی معاملے میں ملوث ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ اس کمپنی کے شیئرز اپنے پاس رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اس کمپنی کو اس غیر اسلامی معاملے کو جاری رکھنے کا اختیار دے دیا ہے۔اس صورت میں نہ صرف یہ کہ اسے غیر اسلامی معاملے پر رضامندی ظاہر کرنے کا گناہ ہوگا بلکہ وہ معاملہ بھی بجا طور پر اس کی طرف منسوب ہوگا، اس لئے کہ کمپنی عملاً اس کے دیئے

ہوئے اختیار کے تحت ہی کام کر رہی ہے۔

مزید برآں یہ کہ جب کسی کمپنی کی تمویل سودی بنیادوں پر کی جاتی ہے تو اس کے کاروبار میں لگائے گئے فنڈز خالص نہیں رہتے، اسی طرح کمپنی اپنے بینک میں جمع کرائے ہوئے پیسوں پر سود وصول کرتی ہے تو لازماً اس کی آمدن میں ناجائز عنصر شامل ہو جاتا ہے جو کہ منافع منقسمہ (Dividends) کے ذریعے شیئر ہولڈرز میں تقسیم ہوگا۔

لیکن موجودہ دور کے علماء کی بڑی تعداد اس نقطۂ نظر کی حمایت نہیں کرتی۔ان کی دلیل یہ ہے کہ ایک جوائنٹ سٹاک کمپنی بنیادی طور پر سادہ شراکت (Partnership) سے مختلف ہے۔ عام شراکت میں پالیسی فیصلے تمام شرکاء کی رضامندی سے کیے جاتے ہیں، اور ہر شریک کو کاروبار کی پالیسی کے بارے میں ویٹو پاور حاصل ہوتی ہے، اس لئے شراکت کے سارے کام بجا طور پر تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اس کے برعکس جوائنٹ سٹاک کمپنی میں فیصلے اکثریت کے ذریعے ہوتے ہیں۔ کمپنی چونکہ شیئر ہولڈرز کی بہت بڑی تعداد پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے وہ ہر شیئر ہولڈر کو ویٹو پاور نہیں دے سکتی۔ شیئر ہولڈرز کی انفرادی آراء اکثریتی فیصلے کے ذریعے مسترد ہو سکتی ہیں، اس لئے کمپنی کا ہر ہر کام ہر شیئر ہولڈر کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شیئر ہولڈر سالانہ اجلاس عمومی (A.G.M.) میں کسی خاص معاملے پر اپنا اعتراض اٹھاتا ہے لیکن اس کے اعتراض کو اکثریت مسترد کر دیتی ہے تو یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا کہ اس نے اپنی انفرادی حیثیت سے اس معاملے کی اجازت دے دی ہے۔ خاص طور پر جبکہ وہ اس معاملے سے حاصل ہونے والی آمدن سے بچنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔

لہٰذا کوئی کمپنی حلال کاروبار کر رہی ہے لیکن اپنی زائد از ضرورت رقوم سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے جہاں سے تھوڑی سی ضمنی آمدن سود کی بھی حاصل ہو جاتی ہے تو اس سے کمپنی کا سارا کاروبار ناجائز نہیں ہو جائے گا۔ اب اگر کوئی شخص اس کمپنی کے حصص اس واضح نیت کے ساتھ حاصل کرتا ہے کہ وہ اس ضمنی معاہدے کی بھی مخالفت کرے گا اور نفع (Dividend) کے اتنے حصے کو وہ اپنے استعمال میں نہیں لائے گا تو یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے سودی معاملے کی اجازت دی ہے اور اس معاملے کو اس کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح کی کمپنی کے معاملات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ کمپنی بعض اوقات مالیاتی اداروں سے قرض لیتی ہے، اور قرضے عموماً سودی ہوتے ہیں۔ یہاں پر بھی وہی اصول لاگو ہوگا۔ اگر کوئی شیئر ہولڈر ذاتی طور پر اس طرح قرضہ لینے سے متفق نہیں ہے، لیکن اکثریت کی وجہ سے اس کی بات کو مسترد کر دیا

گیا ہے تو یہ قرض لینا اس کی طرف منسوب نہیں ہوگا۔

علاوہ ازیں اسلامی اصولوں کے مطابق اگر چہ سودی قرضہ لینا بڑا خطرناک گناہ کا کام ہے جس کا وہ آخرت میں جواب دہ ہوگا، لیکن اس گناہ کے کام کی وجہ سے قرض لینے والے کا سارا کاروبار حرام اور ناجائز نہیں ہو جائے گا۔ بطور قرض لی ہوئی رقم چونکہ قرض لینے والے کی مملوک سمجھی جاتی ہے اس لئے اس رقم سے جو چیز خریدی جائے گی وہ حرام نہیں ہوگی، اس لئے سودی قرضہ لینے کی ذمہ داری اسی شخص پر عائد ہوگی جو قصداً سودی معاملے میں ملوث ہوا ہے، لیکن اس سے کمپنی کا سارا کاروبار ناجائز نہیں ہوگا۔

شیئرز میں سرمایہ کاری کے لئے شرائط

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں کمپنیوں کے حصص کا کاروبار مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ شرعاً قابلِ قبول ہے:

۱۔ کمپنی کا مرکزی کاروبار شریعت کے خلاف نہیں ہے، اس لئے ایسی کمپنیوں کے حصص حاصل کرنا جائز نہیں ہے جو سود کی بنیاد پر تمویلی خدمات فراہم کرتی ہیں، جیسے بینک، انشورنس کمپنیوں کے حصص، یا ایسی کمپنیوں کے حصص جو کسی اور ناجائز کاروبار میں ملوث ہیں، جیسے وہ کمپنیاں جو شراب، خنزیر، حرام گوشت تیار کرتی یا بیچتی ہیں، یا وہ جوا، نائٹ کلب کی سرگرمیوں اور فحاشی وغیرہ میں ملوث ہیں۔

۲۔ اگر کمپنی کا مرکزی کاروبار حلال ہے مثلاً آٹو موبائل، ٹیکسٹائل وغیرہ کا کاروبار، لیکن وہ کمپنی اپنا زائد از ضرورت سرمایہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے یا سودی قرضے لیتی ہے تو شیئر ہولڈر پر لازم ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دے، جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس عام میں اس طرح کی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائے۔

۳۔ اگر کمپنی کی آمدن میں سودی کھاتوں سے حاصل ہونے والی کچھ آمدن بھی شامل ہے تو شیئر ہولڈر کو ادا کیے گئے منافع میں سے اس تناسب سے نفع کا حصہ خیرات کر دیا جائے اور شیئر ہولڈر خود اس کا فائدہ نہ اٹھائے، مثلاً اگر کمپنی کے کُل منافع میں سے پانچ فیصد اسے سودی کھاتوں سے حاصل ہوا ہے تو نفع کا پانچ فیصد خیرات کر دیا جائے۔

۴۔ کسی کمپنی کے شیئرز اسی صورت میں قابلِ تبادلہ ہیں جبکہ وہ کمپنی کچھ غیر نقد اثاثہ جات کی بھی

مالک ہو۔ اگر کمپنی کے سارے اثاثہ جات سیال شکل میں ہیں یعنی زر (Money) کی شکل میں ہیں تو اس کے شیئرز لکھی ہوئی قیمت پر ہی بیچے اور خریدے جا سکتے ہیں، اس لئے کہ اس صورت میں شیئر صرف نقد (Money) کی نمائندگی کرتا ہے، اور زر کا تبادلہ صرف برابر برابر ہی کیا جاتا ہے۔

کسی کمپنی کے شیئرز کے تبادلے کے جواز کے لئے جامد اثاثہ جات کا کتنا تناسب ہونا ضروری ہے اس سوال کے بارے میں معاصر علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جامد اثاثہ جات کی نسبت کم از کم ۵۱٪ ضروری ہونی چاہئے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر جامد اثاثہ جات ۵۱٪ سے کم ہوئے تو اکثر اثاثے سیال شکل میں ہوں گے، اس لئے تمام اثاثہ جات پر سیال والا حکم ہی جاری ہوگا، اس لئے کہ فقہ کا قاعدہ ہے:

للاکثر حکم الکل۔

اکثر کے ساتھ کل والا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔

بعض دوسرے علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کسی کمپنی کے جامد اثاثے ۳۳٪ بھی ہیں تب بھی ان کا لین دین ہوسکتا ہے۔

تیسرا نقطۂ نظر فقہ حنفی پر مبنی ہے۔ فقہ حنفی کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی اثاثہ نقد اور غیر نقد پر مشتمل ہو تو اس کے نقد حصے کی نسبت سے قطع نظر اس کی خرید وفروخت کی جاسکتی ہے، لیکن اس اصول کی دو شرطیں ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ اس مجموعے میں جامد اثاثے کا حصہ بالکل ہی معمولی نہ ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ جامد اثاثہ معتد بہ اور قابل ذکر نسبت میں ہونا چاہئے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مجموعے کی قیمت اس میں شامل سیال اثاثے سے زیادہ ہونی چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر ۱۰۰ ڈالر کا شیئر ۷۵ ڈالر اور کچھ جامد اثاثوں کی نمائندگی کرتا ہے تو شیئر کی قیمت ۷۵ ڈالر سے زائد ہونی چاہئے۔ اس صورت میں اگر شیئر کی قیمت ۱۰۵ ڈالر مقرر کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا ۷۵ ڈال تو ۷۵ ڈالر کے بدلے میں آگئے اور باقی ۳۰ ڈالر جامد اثاثوں کے بدلے میں ہیں۔ اس کے برخلاف اس شیئر کی قیمت اگر ۷۰ ڈالر مقرر کی جاتی ہے تو یہ جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں شیئر کے ۷۵ ڈالر ایک رقم کے بدلے میں ہوں گے جو ۷۵ ڈالر سے کم ہے۔ تبادلے کی یہ قسم ربا کی تعریف میں داخل ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مذکورہ مثال میں اگر شیئر کی قیمت ۷۵ ڈالر مقرر کی جاتی ہے تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ اگر ہم یہ فرض کریں کہ ۷۵ ڈالر شیئر کے ۷۵

ڈالر کے بدلے میں ہیں تو شیئر کی پشت پر پائے جانے والے جامد اثاثہ جات کی طرف قیمت کا کوئی حصہ منسوب نہیں ہوگا، اس لئے قیمت (۵۷ ڈالر) کا کچھ نہ کچھ لازماً شیئر کے جامد اثاثوں کے بدلے میں متصور ہوگا، اس لئے یہ عقد صحیح نہیں ہوگا، لیکن عملی طور پر یہ محض نظریاتی احتمال ہی ہے، اس لئے کہ ایسی صورتِ حال کا تصور مشکل ہے جس میں شیئر کی قیمت سیال اثاثوں سے بھی کم ہو جائے۔

ان شرائط کے ساتھ شیئرز کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے۔ اس بنیاد پر اسلامک ایکویٹی فنڈ قائم کیا جا سکتا ہے۔ فنڈ میں پیسے ڈالنے والے شرعی طور پر باہم شریک متصور ہوں گے۔ شامل کی گئی تمام رقوم سے ایک مشترکہ حوض بن جائے گا اور اسے مختلف کمپنیوں کے شیئرز کی خریداری کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ نفع متعلقہ کمپنیوں کی طرف سے تقسیم کیے گئے منافع منقسمہ (Dividends) سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور حصص کی قیمتوں میں اضافے کے ذریعے بھی۔ پہلی صورت میں یعنی جب نفع کمپنیوں کے تقسیم شدہ منافع کے ذریعے حاصل کیا جائے منافع کا وہ خاص تناسب خیرات کرنا ضروری ہوگا جو کمپنی کو سود کے ذریعے حاصل ہونے والے نفع کے بدلے میں ہے۔ معاصر اسلامک فنڈز نے اس طریقِ کار کے لئے Purification (خالص کرنا، پاک کرنا) کی اصطلاح وضع کی ہے۔ (اُردو ترجمے میں ''تطہیر'' کی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔)

معاصر علماء کا اس صورت میں تطہیر کے ضروری ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے، جبکہ نفع Capital Gain کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہو (یعنی سستی قیمت پر شیئرز خرید کر اور انہیں مہنگی قیمت پر بیچ کر)۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ اگر نفع حصص کی خرید و فروخت (Capital Gain) کے ذریعے حاصل کیا گیا تب بھی تطہیر کا عمل ضروری ہے، اس لئے کہ شیئرز کی بازاری قیمت میں سود کا عنصر بھی منعکس ہو سکتا ہے جو کمپنی کے اثاثہ جات میں شامل ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر شیئر بیچ دیا گیا ہے تو اب کسی تطہیر کی ضرورت نہیں ہے اگرچہ بیچنے کے نتیجے میں نفع بھی حاصل ہوا ہو۔ دلیل یہ ہے کہ شیئر کی قیمت کے کسی متعین حصے کو اس سود کے ساتھ خاص قرار نہیں دیا جا سکتا جو کمپنی کو حاصل ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر حلال شیئرز کی تمام شرطوں کا خیال رکھا گیا ہے تو کمپنی کے اکثر اثاثہ جات حلال ہیں، اس کے اثاثوں کا ایک بہت معمولی حصہ ایسا ہوگا جو سودی آمدن کی وجہ سے حاصل ہوا ہو، یہ معمولی سا تناسب صرف اتنا نہیں کہ غیر معلوم ہے بلکہ کمپنی کے باقی اکثر اثاثوں کے مقابلے میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، اس لئے شیئر کی قیمت درحقیقت کمپنی کے ان اکثر اثاثوں کے مقابلے میں ہے نہ کہ اس معمولی تناسب کے مقابلے میں، اس لئے شیئر کی پوری کی پوری قیمت کو صرف حلال اثاثوں کی قیمت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر چہ دوسرا نقطۂ نظر بھی بے وزن نہیں ہے لیکن پہلا نقطۂ نظر زیادہ محتاط اور شک وشبہ سے زیادہ دور ہے۔ یہ نقطۂ نظر اوپن اینڈ فنڈ (Open Ended Fund) (جس فنڈ کی طرف سے یونٹ ہولڈرز سے یونٹ دوبارہ خریدنے کا وعدہ ہو) میں زیادہ منصفانہ ہے، اس لئے کہ اگر شیئرز کی قیمت میں اضافے والے نفع میں تطہیر نہیں کی جاتی اور کوئی شخص اپنا فنڈ کا یونٹ ایسے وقت میں واپس (Redeem) کرتا ہے جبکہ فنڈ نے اپنے پاس موجود شیئرز میں سے کسی پر سالانہ نفع (Dividend) حاصل نہیں کیا تو اس یونٹ کی واپسی کے وقت (یونٹ ہولڈر کو اس کے پیسے ادا کرتے وقت) اس کی قیمت میں سے تطہیر کی بنیاد پر کوئی کمی نہیں کی جائے گی اگر چہ یہ ہوسکتا ہے کہ فنڈ کے پاس موجود حصص کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے یونٹ کی قیمت میں بھی اضافہ ہوگیا ہو۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنا یونٹ اس وقت واپس کرتا ہے جبکہ فنڈ کچھ سالانہ منافع (Dividend) حاصل کر چکا ہے اور اس میں سے تطہیر کی رقم نکالی جا چکی ہے، جس کی وجہ سے ہر یونٹ کے بالمقابل آنے والے اثاثہ جات میں کمی ہوگئی ہے تو اس شخص کو بنسبت پہلے شخص کے یونٹ کی کم قیمت وصول ہوئی ہے۔

اس کے برخلاف اگر تطہیر ڈیویڈنڈ کی بھی ہو اور قیمت بڑھنے سے حاصل ہونے والے نفع پر بھی، تو تطہیر (Purification) کی رقم کی منہائی کے حوالے سے تمام یونٹ ہولڈرز کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا، اس لئے کیپٹل گین پر بھی تطہیر کرنا صرف یہ نہیں کہ شک وشبہ سے خالی ہے بلکہ تمام یونٹ ہولڈرز کے لئے زیادہ مساویانہ ہے۔ یہ تطہیر کمپنی کو سالانہ حاصل ہونے والے سود کی اوسط کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ (یعنی یہ دیکھا جائے کہ کمپنی کو اوسطاً کتنا سود حاصل ہوتا ہے)۔

فنڈ کی انتظامیہ کا معاوضہ

فنڈ کا نظم ونسق دو مختلف طریقوں سے چلایا جاسکتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ انتظامیہ رقم لگانے والوں (یونٹ ہولڈرز) کے لئے بطور مضارب کام کرے۔ اس صورت میں فنڈ کو حاصل ہونے والے سالانہ منافع میں سے متعین فیصد تناسب انتظامیہ کے معاوضے کے طور پر مقرر کیا جاسکتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ انتظامیہ کو اس کا حصہ اسی صورت میں ملے گا جبکہ فنڈ کو کوئی نفع حاصل ہوگا۔ اگر فنڈ کو کوئی نفع حاصل نہیں ہوا تو انتظامیہ بھی کسی چیز کی حق دار نہیں ہوگی۔ نفع کے بڑھنے سے انتظامیہ کا حصہ بھی بڑھ جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ انتظامیہ شرکاء کے وکیل کے طور پر کام کرے۔ اس صورت میں انتظامیہ کو اس کی خدمات کے عوض پہلے سے طے شدہ فیس دی جاسکتی ہے۔ یہ فیس یکمشت بھی ہوسکتی

ہے اور ماہانہ یا سالانہ ادائیگی کی صورت میں بھی۔ موجودہ دور کے علماءِ شریعت کے مطابق یہ فیس، فنڈ کے اثاثہ جات کی صافی مالیت کی کسی خاص نسبت پر بھی مبنی ہو سکتی ہے، مثلاً یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ انتظامیہ فنڈ کے اثاثہ جات کی کل قیمت کا ۲٪ یا ۳٪ مالی سال کے آخر میں لے گی۔ (۱)

تاہم فنڈ کا آغاز کرنے سے پہلے مذکورہ طریقوں میں سے کسی کا طے ہو جانا شرعاً ضروری ہے۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ فنڈ کی پراسپکٹس میں یہ واضح کر دیا جائے کہ انتظامیہ کا معاوضہ کس بنیاد پر ادا کیا جائے گا۔ عموماً یہی تصور کیا جاتا ہے کہ جو شخص بھی فنڈ میں اپنا حصہ ڈالتا ہے وہ پراسپکٹس میں مذکورہ شرائط سے متفق ہوتا ہے، اس لئے (پراسپکٹس میں معاوضہ کا طریقہ درج ہونے کی صورت میں) اس طریقے کے بارے میں بھی یہی سمجھا جائے گا کہ اس سے تمام شرکاء نے اتفاق کر لیا ہے۔

اجارہ فنڈ

اسلامی فنڈ کی ایک اور صورت اجارہ فنڈ بھی ہو سکتی ہے۔ 'اجارہ' کا معنی ہے کرائے پر دینا۔ اس کے قواعد پر اسی کتاب کے تیسرے باب میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس فنڈ میں لوگوں کی جمع شدہ رقوم کو جائیداد، موٹر گاڑیاں اور دوسرا ساز و سامان خریدنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تا کہ انہیں استعمال کو کرائے پر دیا جائے۔ ان اثاثوں کا مالک فنڈ ہی رہتا ہے اور استعمال کنندگان سے کرایہ لیا جاتا ہے، اور یہ کرایہ فنڈ کے لئے آمدن کا ذریعہ ہوتا ہے، جو کہ رقم لگانے والوں (Subscribers) میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہر حصہ دار (Subscriber) کو ایک سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے جو کہ کرائے پر دیئے گئے اثاثوں میں اس کی متناسب ملکیت کا ثبوت ہے اور اسے آمدن میں حصہ رسی کے حق دار ہونے کو یقینی بناتا ہے۔ ان سرٹیفکیٹس کو "صک" کہا جا سکتا ہے جو کہ قدیم اسلامی فقہ میں ایک متعارف اصطلاح ہے۔ چونکہ یہ صکوک (صک کی جمع) ان کے حاملین کی حسی اور مادی اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ سیال اثاثوں یا دیون کی، اس لئے مکمل طور پر قابل تبادلہ ہیں اور ثانوی بازار میں ان کی خرید و فروخت کی جا سکتی ہے۔ جو شخص اس صک کو خریدتا ہے وہ متعلقہ اثاثوں کی متناسب ملکیت میں بیچنے والے کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور اصل حصہ ڈالنے والے کے حقوق و ذمہ داریاں اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ ان صکوک کی قیمت بازار کی قوتوں

---

(۱) اس کو سمسار (دلال) کے مشابہ ہونے کی وجہ سے درست قرار دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اس کی (دلال کی) اجرت فیصد تناسب پر مبنی ہو تب بھی جائز ہے۔

(طلب ورسد) کی بنیاد پر متعین ہوتی ہیں اور عام طور پر ان کی نفع بخشی پر مبنی ہوتی ہیں۔

تاہم یہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ اجارے (Lease) کے تمام معاہدوں کا شرعی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے جو کہ عملاً روایتی تمویلی اجارے (Financial lease) سے مختلف ہیں۔ دونوں میں فرق کے نکات اس کتاب کے تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں، تاہم چند بنیادی اصول یہاں مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔ لیز (اجارے) پر دیا گیا اثاثہ حق استعمال رکھتا ہو، اور کرایہ اس وقت سے وصول کیا جائے جب یہ حق استعمال مستاجر (Lessee) کو دے دیا گیا ہو۔

۲۔ اجارے پر دیا گیا اثاثہ اس نوعیت کا ہو کہ اس کا حلال اور جائز استعمال ممکن ہو۔

۳۔ ملکیت کی وجہ سے عائد ہونے والی تمام ذمہ داریوں کو موجر (Lessor) قبول کرے۔

۴۔ عین عقد کے آغاز ہی میں کرایہ متعین اور فریقین کو معلوم ہونا چاہئے۔ فنڈ کی اس قسم میں انتظامیہ حصہ داروں (Subscribers) کے وکیل کے طور پر کام کرے گی اور اسے اس کی خدمات کے عوض فیس (اجرت) ادا کی جائے گی۔ انتظامیہ کی فیس ایک متعین مقدار بھی ہو سکتی ہے اور وصول شدہ کرائے کا متناسب حصہ بھی۔ اکثر فقہاء کے مذہب کے مطابق اس طرح کا فنڈ ''مضاربہ'' کی بنیاد پر تشکیل نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ ان کے مذہب کے مطابق مضاربہ اشیاء کی خرید وفروخت تک محدود ہوتا ہے اور اسے خدمات (Services) یا اجارے کے کاروبار تک وسعت نہیں دی جا سکتی، لیکن فقہ حنبلی کے مطابق مضاربہ اجارے اور خدمات پر بھی ہو سکتا ہے۔ بہت سے معاصر علماء نے اسی نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے۔

اشیاء کا فنڈ

اسلامی فنڈ کی ایک اور صورت ''اشیاء کا فنڈ'' ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے فنڈ میں جمع شدہ رقوم کو مختلف اشیاء کی خریداری کے لئے استعمال کیا جائے گا تاکہ انہیں آگے بیچا جا سکے۔ اس طرح بیچنے سے جو نفع حاصل ہوگا وہ فنڈ کی آمدن ہوگی جو کہ پیسے شامل کرنے والوں (Subscribers) میں حصہ رسدی تقسیم ہو جائے گی۔

اس فنڈ کو شرعاً قابلِ قبول بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بیع کے بارے میں شرعی احکام کی پوری رعایت رکھی جائے، مثلاً:

۱۔ مبیع (بیچی جانے والی چیز) بیع کے وقت بیچنے والے کی ملکیت میں ہو، اس لئے شارٹ سیل

جس میں کوئی شخص کوئی چیز اپنی ملکیت میں آنے سے پہلے ہی بیچ دیتا ہے، شرعاً جائز نہیں ہے۔

۲۔ مستقبل کی طرف منسوب بیع (Forward Sale) سوائے سلم اور استصناع کے جائز نہیں ہے (سلم اور استصناع کی تفصیل کے لئے پچھلا باب ملاحظہ ہو)۔

۳۔ جن اشیاء کا کاروبار ہو رہا ہے وہ حلال ہوں، اس لئے شراب، خنزیر اور دوسری حرام اشیاء کا کاروبار بھی ناجائز ہے۔

۴۔ بیچنے والا جس چیز کو بیچنا چاہتا ہے اس پر اس کا حسی یا معنوی قبضہ ہونا چاہئے (معنوی قبضے میں ہر ایسا عمل داخل ہے جس کے ذریعے اس چیز کا ضمان (Risk) دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے)۔

۵۔ اس چیز کی قیمت متعین اور فریقین کو معلوم ہونی چاہئے، ایسی قیمت جو غیر متعین ہو یا کسی غیر یقینی واقعے کے ساتھ منسلک ہو اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے۔

ان شرائط اور اس طرح کی دوسری شرائط جو اس کتاب کے دوسرے باب میں زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہیں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ اشیاء کی مارکیٹ بالخصوص مستقبل کی خرید و فروخت کی مارکیٹ (Financial Market) میں جو سودے مروج ہیں وہ ان شرائط کے مطابق نہیں ہیں، اس لئے اشیاء کا اسلامی فنڈ (Islamic Commodity Fund) اس طرح کے معاہدوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ تاہم اگر اشیاء کے حقیقی سودے ہوں جن میں مذکورہ بالا شرطوں سمیت تمام شرعی تقاضوں کی رعایت رکھی گئی ہو تو ''اشیاء کا فنڈ'' (Commodity Fund) قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے فنڈ کے یونٹ کی خرید و فروخت بھی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ہر وقت فنڈ کی ملکیت میں کچھ اشیاء ہوں۔

مرابحہ فنڈ

مرابحہ بیع کی ایک خاص قسم ہے جس میں اشیاء اصل لاگت پر زائد منافع شامل کر کے بیچی جاتی ہیں۔ بیع کی اس قسم کو اس دور کے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں نے بطور طریقۂ تمویل (Mode of Finance) اختیار کیا ہے۔ یہ بینک اپنے کلائنٹ کے لئے کوئی چیز خریدتے ہیں اور اس کلائنٹ کے ہاتھ پر لاگت پر طے شدہ نسبت سے نفع کا اضافہ کر کے ادھار بیچ دیتے ہیں۔ اگر کوئی فنڈ اس طرح کی بیع کرنے کے لئے وجود میں آیا ہو تو اس کے یونٹ ثانوی بازار میں قابلِ خرید و

فروخت نہیں ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ مرابحہ کی صورت میں عام طور پر مالیاتی اداروں میں جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء خریدتے ہی فوراً کلائنٹ کو بیچ دی جاتی ہیں اور ادھار ادائیگی کی بنیاد پر جو قیمت ہوتی ہے وہ کلائنٹ کے ذمہ واجب الادا دین ہو جاتی ہے، اس لئے مرابحہ کا یہ مشترکہ فنڈ کسی حسی اور مادی اثاثے کا مالک نہیں ہے۔ یہ مشترکہ فنڈ یا تو نقد رقم پر مشتمل ہے یا قابلِ وصول دیون (Debts) پر، اس لئے اس فنڈ کے یونٹ زر (Money) یا قابلِ وصول دیون کی نمائندگی کرتے ہیں، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا یہ دونوں چیزیں قابلِ تبادلہ نہیں ہیں۔ اگر ان کا رقم کے بدلے میں تبادلہ ہو تو وہ برابر قیمت پر ہونا ضروری ہے۔

بیع الدین

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کی بیع شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہے جو اس سے قابلِ وصول ہے اور وہ اس دین کو ڈسکاؤنٹ (کم قیمت) پر بیچنا چاہتا ہے، جیسا کہ عموماً ہنڈی (Bill of Exchange) میں ہوتا ہے، اسے شرعی اصطلاح میں بیع الدین کہتے ہیں۔ قدیم فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ دین کی بیع ڈسکاؤنٹ (کم قیمت پر) جائز نہیں ہے۔ معاصر علماء کی بہت بڑی اکثریت کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے، البتہ ملائیشیا کے بعض علماء اس طرح کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ عموماً فقہ شافعی کے ایک قاعدے کا حوالہ دیتے ہیں جس میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ بیع الدین جائز ہے، لیکن ان حضرات نے اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں دی کہ شافعی فقہاء نے بیع الدین کی اجازت صرف اس صورت میں دی ہے جبکہ اسے برابر سرابر بیچا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ بیع الدین کی ممانعت ربا کی حرمت کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ ایسا دین جو رقم (Money) کی شکل میں قابلِ وصول ہو اس کا حکم بھی زر (Money) والا ہوتا ہے، اور جب زر کے بدلے میں اسی نوعیت کے زر کی بیع ہو رہی ہو تو قیمت کا برابر سرابر ہونا ضروری ہے، کسی بھی طرف سے کمی بیشی ربا کے مترادف ہوگی اور شریعت میں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاسکتی۔

بعض علماء یہ استدلال کرتے ہیں کہ بیع الدین کی اجازت اس صورت تک منحصر ہے جبکہ دین کسی چیز کے بیچنے کی وجہ سے وجود میں آیا ہو۔ اس صورت میں، ان کے کہنے کے مطابق دین بیچی ہوئی چیز کی نمائندگی کرتا ہے اور اس دین کی بیع کو اس چیز کی بیع ہی تصور کرنا چاہئے، لیکن یہ دلیل بالکل بے وزن ہے، اس لئے کہ ایک مرتبہ جب چیز کی بیع ہوگئی تو اس کی ملکیت خریدار کی طرف منتقل ہوگئی اور اب وہ بیچنے والے کی ملکیت میں نہیں رہی، بیچنے والا جس چیز کا مالک ہے وہ صرف رقم (Money)

ہے، اس لئے اگر وہ دین کو بیچتا ہے تو وہ رقم (Money) ہی کی بیع ہے اور اسے کسی بھی اعتبار سے چیز کی بیع تصور نہیں کیا جاسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس نقطۂ نظر کو معاصر علماء کی بہت بڑی اکثریت نے قبول نہیں کیا۔ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ جو کہ ماہرینِ شریعت کی سب سے بڑی نمائندہ تنظیم ہے جس میں ملائیشیا سمیت تمام مسلمان ملکوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں اس نے بھی بیع الدین کی حرمت کو متفقہ طور پر بغیر کسی مخالفت کے قبول کیا ہے۔

مخلوط اسلامی فنڈ

اسلامی فنڈ کی ایک صورت اور ہوسکتی ہے جس میں لوگوں کی لگائی رقوم سرمایہ کاری کی مختلف اقسام جیسے ایکویٹی، لیزنگ (اجارہ) اشیاء کا کاروبار وغیرہ میں لگائی جائیں۔ اسے ''مخلوط اسلامی فنڈ'' (Mixed Islamic Fund) کہا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں اگر فنڈ کے حسی اور مادی اثاثے ۵۱٪ سے زائد اور سیال اثاثے اور دیون ۵۰٪ سے کم ہوں تو فنڈ کے یونٹ قابلِ خرید وفروخت ہوں گے، تاہم اگر سیال اثاثے اور دیون ۵۰٪ سے زائد ہیں تو اکثر معاصر علماء کی رائے کے مطابق ان کی تجارت نہیں ہوسکے گی، اس صورت میں ضروری ہے کہ یہ کلوز اینڈ فنڈ (Close Ended Fund) ہو۔ (یعنی ایسا فنڈ جس کے یونٹ دوبارہ خریدنے کو فنڈ کی طرف سے وعدہ نہ ہو۔)

محدود ذمہ داری کا تصور

محدود ذمہ داری کا تصور

محدود ذمہ داری (Limited Liability) کا تصور مسلمان ملکوں سمیت پوری جدید دنیا میں بڑے پیمانے کے تجارتی اور صنعتی اداروں کا ایک لاینفک عنصر بن چکا ہے۔ اس باب کا مقصد اس تصور کی وضاحت کرنا اور اس کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ہے کہ کیا یہ تصور خالص اسلامی معیشت میں قابلِ قبول ہے یا نہیں۔

''محدود ذمہ داری'' جدید قانونی اور معاشی اصطلاح کے مطابق ایک ایسی صورتِ حال ہے جس میں کسی کاروبار کا شریک یا شیئر ہولڈر خود کو اس رقم سے زائد ذمہ داری اٹھانے سے محفوظ بناتا ہے جو رقم اس نے محدود ذمہ داری والی کمپنی یا شراکت (Partnership) میں لگائی ہے۔ اگر کاروبار کو خسارہ ہو جاتا ہے تو ایک شیئر ہولڈر زیادہ سے زیادہ جو نقصان اٹھائے گا وہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا اصل راس المال کھو بیٹھے گا، لیکن یہ خسارہ اس کے ذاتی اثاثوں تک نہیں پھیلے گا، اور اگر کمپنی کے اثاثے اس کی (قرضوں وغیرہ کی) ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے کافی نہیں ہیں تو قرض خواہ شیئر ہولڈرز کے ذاتی اثاثوں سے اپنے قابلِ وصول بقایاجات وصول کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

اگرچہ محدود ذمہ داری کے تصور کا اطلاق بعض ملکوں میں سادہ شراکت (Partnership) پر بھی کیا گیا تھا لیکن زیادہ تر اس کا اطلاق کمپنیوں اور کارپوریٹ ہیئتوں (یعنی جنہیں شخص قانونی تسلیم کیا گیا ہو) پر ہوتا ہے، بلکہ شاید یہ کہنا درست ہو کہ محدود ذمہ داری کا تصور اصل میں ظاہر ہی کارپوریٹ باڈیز اور جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے ظہور سے ہوا ہے۔ اس تصور کے متعارف کرائے جانے کا بنیادی تصور ہی یہ تھا کہ بڑے پیمانے کی مشترکہ کاروباری مہموں کی طرف زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو راغب کیا جائے اور انہیں یہ یقین دلایا جائے کہ اگر وہ اپنی بچتوں سے ان کاروباری اداروں میں سرمایہ کاری کریں گے تو ان کی ذاتی دولت خطرے میں نہیں ہوگی۔ عملی طور پر جدید کاروبار میں اس تصور نے خود کو وسیع پیمانے پر سرمایہ کاروں کے بڑے سرمائے کو متحرک کرنے میں اہم طاقت ہونا ثابت کیا ہے۔

یقیناً محدود ذمہ داری کا تصور شیئر ہولڈرز کے فائدے میں ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قرض خواہوں (Creditors) کے لئے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایک لمیٹڈ کمپنی کی ذمہ داریاں

اس کے اثاثوں سے بڑھ جاتی ہیں، کمپنی دیوالیہ ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی تنضیض (Liquidation) ہو جاتی ہے تو قرض خواہوں کو اپنے مطالبوں میں معتد بہ نقصان ہوسکتا ہے۔اس لئے کہ وہ کمپنی کے اثاثوں کی سیال شدہ قیمت ہی وصول کر سکتے ہیں، اور ان کے پاس باقی ماندہ مطالبات کمپنی کے شیئر ہولڈرز سے وصول کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔حتی کہ کمپنی کے ڈائریکٹران جو اس بُری صورتِ حال کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں انہیں بھی قرض خواہوں کے مطالبات پورا کرنے کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔محدود ذمہ داری کے تصور کا یہ پہلو ایسا ہے جو شرعی نقطۂ نگاہ سے غور وفکر اور تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔

اگر چہ جدید تجارتی عمل میں محدود ذمہ داری کا تصور نیا ہے اور اسلامی فقہ کے اصل مراجع میں اس کا صریح تذکرہ نہیں ملتا لیکن کتاب وسنت اور اسلامی فقہ میں طے کردہ قواعد واصول کی روشنی میں اس کے متعلق شرعی نقطۂ نظر معلوم کیا جا سکتا ہے۔اس مقصد کے لئے ضرورت ہے کہ جو اجتہاد کی اہلیت رکھتے ہیں وہ کسی قدر اجتہاد سے کام لیں۔بہتر یہ ہے کہ ماہرینِ شریعت یہ اجتہاد اجتماعی سطح پر کریں، لیکن اوّلین تقاضے کے طور پر کچھ انفرادی کوششیں بھی ہونی چاہئیں جو کہ اجتماعی عمل کے لئے بنیاد کا کام دیں گی۔

راقم الحروف ،شریعت کا معمولی طالب علم ہونے کی حیثیت سے طویل عرصے سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا ہے، اور اس مضمون میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اسے اس موضوع پر آخری فیصلہ نہیں سمجھنا چاہئے، یہ تو موضوع پر ابتدائی سوچ ہے، اس مضمون کا مقصد مزید تحقیق کے لئے بنیاد فراہم کرنا ہے۔

محدود ذمہ داری کے سوال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ جدید کارپوریٹ باڈی کی قانونی شخصیت کے تصور کے ساتھ منسلک ہے۔اس تصور کے مطابق ایک جوائنٹ سٹاک کمپنی بذاتِ خود ایک مستقل وجود اور شخص کا درجہ رکھتی ہے جو اس کے شیئر ہولڈرز کے انفرادی وجود اور تشخص سے الگ ہے۔یہ الگ وجود بطور فرضی شخص کے ایک قانونی شخصیت رکھتا ہے جو مدعی اور مدعیٰ علیہ بن سکتا ہے، معاہدے کرسکتا ہے، اپنے نام پر جائیداد رکھ سکتا ہے اور تمام معاہدات میں یہ عام شخص والا قانونی درجہ رکھتا ہے۔

یہ باور کیا جاتا ہے کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا شرعاً ''شخص قانونی'' کا تصور قابلِ قبول ہے یا نہیں؟ اگر ایک دفعہ ''شخص قانونی'' کا تصور قبول کرلیا جائے اور یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ''شخص قانونی'' کی فرضی نوعیت کے باوجود اس کے نام پر ہونے والے معاہدات کے قانونی اثرات کے بارے میں اس کے ساتھ قدرتی شخص والا معاملہ کیا جائے، اس بات کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو ہمیں محدود ذمہ داری

کا تصور بھی تسلیم کرنا ہوگا جو کہ پہلے تصور کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ وجہ واضح ہے، اگر حقیقی شخص یعنی ایک انسان دیوالیہ ہو کر مر جائے تو اس کے قرض خواہ اس کے چھوڑے ہوئے اثاثوں کے علاوہ کسی چیز پر دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر اس کی ذمہ داریاں اس کے اثاثوں سے بڑھ جاتی ہیں تو یقینی بات ہے کہ قرض خواہوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا اور مقروض شخص کے مرنے کے بعد ان کے لئے چارہ جوئی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اب اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کمپنی ایک شخص قانونی کی حیثیت سے وہی حقوق اور ذمہ داریاں رکھتی ہے جو ایک قدرتی شخص کے ہوتے ہیں تو دیوالیہ کمپنی پر بھی یہی اصول لاگو ہوگا۔ کمپنی جب دیوالیہ ہو جاتی ہے تو اس کی تنصیض (Liquidation) کی جاتی ہے اور کسی کمپنی کی تنصیض (اس کے اثاثے بیچ کر نقد شکل میں تبدیل کرنا) ایک شخص کی موت کی طرح ہے، اس لئے کہ تنصیض کے بعد کمپنی مزید عرصے تک موجود نہیں رہ سکتی۔ جب ایک حقیقی شخص دیوالیہ ہو کر مر جاتا ہے تو اس کے قرض خواہ نقصان اٹھاتے ہیں تو شخص قانونی کے قرض خواہوں کا بھی نقصان ہو سکتا ہے جبکہ اس کی تنصیض کے ذریعے اس کی قانونی عمر پوری ہو جائے۔

لہٰذا بنیادی سوال یہی ہے کہ ''شخص قانونی'' کا تصور شرعاً قابلِ قبول ہے یا نہیں۔

''شخص قانونی''، جس کا تصور جدید معاشی اور قانونی نظام میں پایا جاتا ہے اس پر اگرچہ اسلامی فقہ کی کتابوں میں بحث نہیں کی گئی لیکن چند ایسی نظائر موجود ہیں جن سے استنباط کر کے شخص قانونی کا تصور نکالا جا سکتا ہے۔

ا۔ وقف

پہلی نظیر وقف کی ہے۔ وقف ایک دینی اور قانونی ادارہ ہے جس میں کوئی شخص اپنی جائیداد کا کچھ حصہ کسی دینی یا خیراتی مقصد کے ساتھ خاص کر دیتا ہے۔ جائیداد کو جب وقف قرار دے دیا جائے تو وہ اب وقف کرنے والے کی ملکیت نہیں رہتی۔ جن پر جائیداد وقف کی گئی ہے وہ اس کے حق استعمال یا آمدن سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن وہ اس جائیداد کے مالک نہیں ہیں۔ اس کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے وقف کے ساتھ مستقل قانونی وجود والا برتاؤ کیا ہے اور اس کی طرف بعض ایسی خصوصیات منسوب کی ہیں جو قدرتی شخص کی ہوتی ہیں۔ یہ بات مسلم فقہاء کی طرف سے وقف کے متعلق ذکر کیے گئے دو مسئلوں سے واضح ہو جائے گی۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وقف کی آمدن سے کوئی جائیداد خریدی جائے تو وہ خود بخود وقف کا حصہ

نہیں بن جائے گی، بلکہ فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ خریدی ہوئی جائیداد وقف کی مملوک تصور ہوگی۔(۱) اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ایک حقیقی شخص کی طرح وقف بھی کسی جائیداد کا مالک بن سکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فقہاء نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ جو رقم مسجد کو بطور عطیہ دی جائے تو وہ وقف کا جز نہیں ہے بلکہ یہ مسجد کی ملکیت میں داخل ہوگی۔(۲)

یہاں پر بھی مسجد کو رقم کا مالک تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ اصول بعض مالکی فقہاء نے بھی صراحتاً بیان کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ مسجد کسی چیز کا مالک بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ مسجد کی یہ اہلیت معنوی (Constructive) ہے جبکہ ایک انسان کی اہلیت حسی (Physical) ہے۔(۳)

ایک اور مالکی فقیہہ احمد الدردیر نے کسی مسجد کے نام کی گئی وصیت کو درست قرار دیا ہے اور دلیل میں یہی بات کہی ہے کہ مسجد جائیداد کی مالک بن سکتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس اصول کو پھیلا کر مسافر خانے اور پل پر بھی لاگو کیا ہے بشرطیکہ وہ وقف ہوں۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہاء نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وقف جائیداد کا مالک ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وقف کوئی انسان نہیں ہے پھر بھی مالک ہونے کے معاملے میں اس پر انسان والا حکم ہی لگایا ہے۔ جب ایک مرتبہ اس کی ملکیت قائم ہوگئی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسے بیچ سکے گا، خرید سکے گا، وہ دائن (قرض خواہ) اور مدیون (مقروض) بھی ہوسکتا ہے، مدعی اور مدعی علیہ بھی بن سکتا ہے، اس طرح سے شخص قانونی کی تمام خصوصیات اس کی طرف منسوب ہوں گی۔

۲۔ بیت المال

قدیم فقہی ذخیرے میں ''شخص قانونی'' کی جو دوسری مثال ملتی ہے وہ بیت المال ہے۔ چونکہ یہ عوامی اثاثہ ہے اس لئے اسلامی ریاست کے تمام شہری کسی نہ کسی طرح بیت المال سے استفادے کا حق رکھتے ہیں، لیکن کوئی شخص اس کا مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ تاہم بیت المال کے بھی کچھ حقوق اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ معروف حنفی فقیہہ امام سرخسی ''المبسوط'' میں فرماتے ہیں:

> ''بیت المال پر ایسی ذمہ داریاں اور اس کے لئے ایسے حقوق بھی ثابت ہوسکتے ہیں جو مجہول ہوں۔''(۴)

---

(۱) الفتاوی الہندیۃ، کتاب الوقف، ج ۲، ص ۴۱۷۔

(۲) حوالہ بالا، ج ۳، ص ۲۴۰۔ نیز ملاحظہ ہو: اعلاء السنن، ج ۱۳، ص ۱۹۸۔

(۳) دیکھئے: الخرشی علی الخلیل، ج ۷، ص ۸۰۔ (۴) المبسوط للسرخی، ج ۱۴، ص ۳۳۔

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

''اگر اسلامی مملکت کے سربراہ کو فوجیوں کی تنخواہیں دینے کے لئے رقم کی ضرورت ہے، لیکن بیت المال کے خراج والے شعبے میں اسے رقم نہیں ملتی تو وہ تنخواہیں زکوٰۃ والے شعبے سے دے سکتا ہے، لیکن زکوٰۃ کے شعبے سے جو رقم لی گئی ہے وہ خراج کے شعبے کے ذمے قرض تصور ہوگی۔''(۱)

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ بیت المال بلکہ اس کے اندرونی شعبے بھی ایک دوسرے سے قرض لے اور دے سکتے ہیں، ان قرضوں کی ذمہ داری سربراہِ مملکت پر عائد نہیں ہوگی بلکہ بیت المال کے متعلقہ شعبے پر عائد ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیت المال کا ہر شعبہ اپنا مستقل تشخص اور وجود رکھتا ہے اور اس حیثیت میں وہ رقم بطور قرض لے اور دے سکتا ہے، اس پر دائن اور مدیون والے احکام بھی جاری ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ''شخص قانونی'' مدعی اور مدعی علیہ بن سکتا ہے اسی طرح بیت المال کا یہ شعبہ بھی مدعی یا مدعی علیہ بن سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فقہاءِ اسلام نے بیت المال کے بارے میں ''شخص قانونی'' کا تصور قبول کر لیا ہے۔

۳۔ خلطت (شراکت)

جوائنٹ سٹاک کمپنی میں ''شخص قانونی'' کے تصور کے قریب تر ایک اور مثال فقہ شافعی میں ملتی ہے۔ فقہ شافعی کے ایک طے شدہ اصول کے مطابق اگر ایک سے زائد اشخاص مل کر اپنا مشترکہ کاروبار چلاتے ہیں جس میں دونوں کے مملوکہ اثاثے ملے جلے ہیں، زکوٰۃ ان کے مشترکہ اثاثوں پر بحیثیت مجموعی واجب ہوگی اگرچہ ان میں سے کوئی شخص انفرادی طور پر بقدرِ نصاب مالیت کا مالک نہ ہو، لیکن مجموعی اثاثوں کی کُل مالیت نصاب سے زائد ہو تو بھی زکوٰۃ پورے مشترکہ مال پر واجب ہوگی جس میں اول الذکر شخص کا حصہ بھی شامل ہوگا، اس لئے جس شخص کا حصہ نصاب سے کم ہے وہ مجموعی اثاثوں میں اپنی ملکیت کے تناسب سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں شریک ہوگا جبکہ اگر ہر ایک کی ذاتی اور انفرادی حیثیت پر زکوٰۃ کا حساب کیا جاتا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوتی۔

یہی اصول جسے ''خلطۃ الشیوع'' کہا جاتا ہے جانوروں کی زکوٰۃ پر زیادہ قوت کے ساتھ لاگو ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں بعض اوقات کسی شخص کو اس سے زیادہ زکوٰۃ ادا کرنا پڑتی ہے اگر اس سے انفرادی حیثیت میں زکوٰۃ لی جاتی، اور کبھی اس سے کم زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

(۱) حوالہ سابقہ، ج۳، ص۱۸۔

اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

لا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع مخافة الصدقة.[1]

الگ الگ اثاثوں کو باہم ملاؤ نہیں اور جو مشترک ہیں انہیں الگ الگ نہ کرو تا کہ زکوٰۃ کی مقدار کم کرو۔"

خلطۃ الشیوع کا یہ اصول فقہ مالکی اور فقہ حنبلی میں بھی تفصیلات کے کچھ فرق کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔اس اصول کی تہہ میں شخص قانونی کا بنیادی تصور موجود ہے۔اس اصول کے مطابق زکوٰۃ فرد پر واجب نہیں ہوتی بلکہ مشترکہ اثاثہ ہی ہے جس پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ "مشترکہ سٹاک" کے ساتھ مستقل شخص والا معاملہ کیا گیا ہے اور زکوٰۃ کی ذمہ داری اسی وجود کی طرف منتقل کر دی گئی ہے۔یہ اگر چہ بالکلیہ "شخص قانونی" کا تصور نہیں ہے لیکن اس کے کافی قریب ضرور ہے۔

۴۔ترکہ مستغرقہ فی الدین

چوتھی مثال وہ جائیداد ہے جو ایسی میت کا ترکہ ہو جس کی ذمہ داریاں اس کی ترکے میں چھوڑی ہوئی جائیداد سے متجاوز ہوں۔اختصار کے لئے ہم اس کا حوالہ "مقروض ترکہ" کہہ کر دے سکتے ہیں۔

فقہاء کے بیان کے مطابق یہ جائیداد میت کی ملکیت بھی نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اب زندہ نہیں ہے، نہ ہی یہ وارثوں کی مِلک ہے، اس لئے کہ ترکے پر قرض خواہوں کو وارثوں پر ترجیحی حق حاصل ہوتا ہے۔یہ قرض خواہوں کی بھی ملکیت نہیں ہے، اس لئے کہ ابھی تک قرضوں کی ادائیگی نہیں ہوئی۔ورثاء اس ترکے پر مطالبے کا حق تو رکھتے ہیں لیکن جب تک عملاً ان کے درمیان یہ تقسیم نہیں ہو جاتا ان کی ملکیت نہیں ہے۔چونکہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ہے اس لئے اس کا اپنا مستقل وجود ہے۔اسے مستقل قانونی شخصیت بھی کہا جا سکتا ہے۔میت کے ورثاء یا اس کے نامزد منتظمین (اوصیاء) بطور منتظم ان اثاثوں کی دیکھ بھال کریں گے لیکن وہ اس کے مالک نہیں ہیں۔تقسیم کر کے قرضوں کے تصفیہ پر کچھ اخراجات بھی ہوتے ہیں، یہ اخراجات بھی اسی ترکے سے پورے کیے جائیں گے۔

اس زاویۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو یہ "مستغرق فی الدین ترکہ" اپنا مستقل وجود رکھتا ہے جو

(۱) رواہ البخاری کتاب الزکوٰۃ باب لا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع، ۱/۱۹۵۔ والترمذی کتاب الزکوٰۃ باب ما جاء فی زکوٰۃ الابل والغنم، ۱/۱۳۶۔

بیچ بھی سکتا ہے، خرید بھی سکتا ہے، دائن اور مدیون بھی ہوسکتا ہے، اور ''شخص قانونی'' والی خصوصیات بیشتر اس میں پائی جاتی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اس ''شخص قانونی'' کی ذمہ داریاں اس کے موجودہ اثاثوں تک ہی محدود ہیں۔ اگر یہ اثاثے قرضوں کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں تو قرض خواہ باقی قرضوں کے لئے ورثہ سمیت کسی سے رجوع نہیں کر سکتے اور ان کے لئے چارہ جوئی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن میں فقہاء نے قانونی شخصیت کا ذکر کیا ہے جو ''شخص قانونی'' کے مشابہ ہے۔ ان مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''شخص قانونی'' کا تصور اسلامی فقہ کے لئے بالکل اجنبی نہیں ہے، اور اگر ان نظائر کی بنیاد پر کمپنی کی قانونی شخصیت کو تسلیم کرلیا جائے تو غالباً اس پر کوئی بڑا اعتراض نہیں ہوسکتا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، کسی کمپنی کی محدود ذمہ داری کا سوال ''شخص قانونی'' کے تصور سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اگر شخص قانونی کے ساتھ اس کی ذمہ داریوں اور حقوق میں قدرتی شخص والا برتاؤ کیا جائے تو ہر شخص اپنے مملوکہ اثاثوں کی حد تک ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص دیوالیہ ہوکر مر جائے تو اس کی باقی ماندہ ذمہ داریوں کا بوجھ کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا، چاہے اس کا اس کے ساتھ کتنا ہی قریبی تعلق کیوں نہ ہو۔ اسی کے ساتھ مشابہت کی بنیاد پر کمپنی کی محدود ذمہ داری کو بھی درست قرار دیا جاسکتا ہے۔

غلام کے مالک کی محدود ذمہ داری

میں یہاں پر ایک اور مثال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کہ جوائنٹ سٹاک کمپنی کی قریب ترین مثال ہے۔ اس مثال کا تعلق ہمارے ماضی کے اس دور سے ہے جبکہ غلامی رائج تھی اور غلاموں کو ان کے مالکوں کی ملکیت سمجھا جاتا اور ان کی آزادانہ تجارت کی جاتی تھی۔ اگرچہ ہمارے دور کے لحاظ سے غلامی کا ادارہ ایک ماضی کا قصہ ہے لیکن غلاموں کی تجارت سے متعلق مختلف مسائل پر بحث کرتے ہوئے ہمارے فقہاء نے جو قانونی اصول بیان کیے ہیں وہ اب بھی اسلامی فقہ کے کسی طالب علم کے لئے مفید ہو سکتے ہیں، اور ہم اپنے جدید مسائل کے حل کے لئے ان قواعد کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نظیر مذکورہ سوال سے انتہائی متعلق ہے۔

اس زمانے میں غلام دو طرح کے ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے غلام وہ ہوتے تھے جنہیں ان کے مالکوں کی طرف سے کوئی تجارتی معاملہ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس طرح کے غلام کو ''قن'' کہا

جاتا تھا۔ ان کے علاوہ غلاموں کی ایک قسم اور تھی جنہیں ان کے مالکوں کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی تھی، اس طرح کے غلام کو ''العبد المأذون'' کہا جاتا تھا۔ اس طرح کے غلام کو ابتدائی سرمایہ اس کے مالک کی طرف سے فراہم کیا جاتا تھا، لیکن یہ غلام ہر طرح کے تجارتی معاہدے کرنے میں آزاد ہوتا تھا۔ اس کے کاروبار میں لگا ہوا سرمایہ مکمل طور پر اس کے مالک کا ہوتا تھا، آمدن بھی اسی کی ہوتی تھی اور غلام جو کچھ بھی کماتا تھا وہ اس کے آقا کو اس کی انفرادی اور خصوصی ملکیت کے طور پر ملتا تھا۔ اگر تجارت کے دوران یہ غلام مقروض ہو جائے تو یہ قرضے اس رقم اور سامان سے ادا کیے جاتے تھے جو غلام کے پاس ہیں۔ اگر غلام کے پاس موجود نقد اور اشیاء قرضے ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں تو قرض خواہ اس غلام کو بیچ کر اس کی قیمت سے اپنے مطالبات پورے کرنے کا حق رکھتے تھے، لیکن اگر غلام کو بیچ کر بھی وہ قرضے پورے نہ ہوں اور وہ غلام مقروض ہونے کی حالت میں ہی مر جائے تو قرض خواہ اپنے باقی ماندہ مطالبات کے لئے اس کے مالک کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔

یہاں آقا حقیقتاً سارے کاروبار کا مالک ہے، غلام تو محض کاروباری معاہدے کرنے کے لئے ایک درمیانی واسطہ اور ذریعہ ہے، غلام کاروبار میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہے، پھر بھی آقا کی ذمہ داری اس کے لگائے ہوئے سرمائے اور غلام کی قیمت تک محدود ہے۔ غلام کی موت کے بعد قرض خواہ آقا کے ذاتی اثاثوں پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔

یہ اسلامی فقہ میں پائی جانے والی قریب ترین مثال ہے جو کہ کمپنی کے شیئر ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کے بہت مشابہ ہے۔

ان پانچ نظائر کی بنیاد پر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''شخص قانونی'' اور محدود ذمہ داری کا تصور اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو اہمیت دی جانی چاہئے کہ محدود ذمہ داری کا تصور لوگوں کو دھوکا دینے اور نفع بخش کاروبار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فطری ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کا ذریعہ نہ بنے، لہٰذا اس تصور کو پبلک کمپنی تک محدود کیا جا سکتا ہے جو کہ اپنے شیئرز عوام الناس کے لئے جاری کرتی ہے اور اس کے شیئر ہولڈرز کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ انہیں کاروبار کے روزمرہ کے امور اور اثاثوں سے زائد قرضوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

جہاں تک پرائیویٹ کمپنیوں اور شراکتوں (Partnership) کا تعلق ہے تو محدود ذمہ داری کے تصور کا ان پر اطلاق نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ عملی طور پر ہر شیئر ہولڈر اور شریک کاروبار کے روزمرہ کے امور کے بارے میں بآسانی معلومات حاصل کر سکتا ہے اور اس کاروبار کی تمام ذمہ داریاں اس پر بھی عائد ہونی چاہئیں۔ البتہ غیر عامل شریک (Sleeping Partner) یا پرائیویٹ

کمپنی کے ایسے شیئر ہولڈرز کا استثناء کیا جا سکتا ہے جو کاروبار میں عملاً حصہ نہیں لیتے، اور شرکاء کے درمیان معاہدے کے مطابق ان کی ذمہ داریوں کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

اگر معاہدے کے تحت غیر عامل شریک (Sleeping Partner) کی ذمہ داری محدود ہے تو اسلامی فقہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے کام کرنے والے شرکاء (Working Partners) کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ایسے قرضے حاصل کریں جو کاروبار کے اثاثوں سے زائد ہوں۔ اس صورت میں اگر کاروبار پر قرضے ایک متعین حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو ان کی ذمہ داری کام کرنے والے شرکاء پر عائد ہوگی جنہوں نے اس حد سے تجاوز کیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے محدود ذمہ داری کے تصور کو پبلک جوائنٹ سٹاک کمپنیوں اور ایسی کارپوریٹ باڈیز کے لئے درست قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے شیئرز عام لوگوں کے لئے جاری کرتے ہیں، اس تصور کا اطلاق کسی فرم کے غیر عامل شرکاء (Sleeping partners) اور پرائیویٹ کمپنی کے ان شرکاء پر ہوسکتا ہے جو کاروبار کے انتظام و انصرام میں عملی حصہ نہیں لیتے، لیکن کسی شراکت کے کام کرنے والے شرکاء اور پرائیویٹ کمپنی کے کام میں حصہ لینے والے شرکاء کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہئے۔

آخر میں ہم وہ بات دوبارہ دہراتے ہیں جس کی ہم نے شروع میں نشاندہی کی تھی کہ محدود ذمہ داری کا مسئلہ چونکہ ایک نیا مسئلہ ہے جس کے شرعی حل کے لئے مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے اس لئے مذکورہ بالا بحث کو اس موضوع پر آخری فیصلہ تصور نہیں کرنا چاہئے۔ یہ محض ابتدائی سوچ کا نتیجہ ہے جس میں مزید بحث و تحقیق کی گنجائش ہے۔
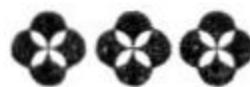
اسلامی بینکوں کی کارکردگی

ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

اسلامی بینکوں کی کارکردگی

ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

اسلامی بینکاری آج کل ایک ناقابلِ انکار حقیقت بن چکی ہے، اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے، بڑی مقدار میں سرمائے کے ساتھ نئے اسلامی بینک قائم ہو رہے ہیں، روایتی بینک بھی اسلامی شعبے (Islamic Windows) یا ذیلی اسلامی ادارے قائم کر رہے ہیں، حتیٰ کہ غیر مسلم بینک اور مالیاتی ادارے بھی اس میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ اگلی دہائی میں اسلامی بینکاری کا حجم کم از کم دگنا ہو جائے گا اور توقع ہے کہ اسلامی بینکوں کے معاملات دنیا کے مالیاتی معاہدوں کے ایک بڑے حصے پر محیط ہوں گے۔ لیکن قبل اس کے کہ اسلامی مالیاتی ادارے اپنے کاروبار کو وسعت دیں انہیں اپنی گزشتہ دو عشروں کی کارکردگی کا جائزہ لے لینا چاہئے، اس لئے کہ ہر نئے نظام کو گزشتہ تجربات سے سبق حاصل کرنا، اپنی سرگرمیوں پر نظرِ ثانی کرنا اور اپنی خامیوں کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک ہم اپنی کوتاہیوں اور خوبیوں کا جائزہ نہ لیں اس وقت تک ہم مکمل کامیابی کی طرف بڑھنے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اس تناظر میں ہمیں چاہئے کہ ہم شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں اسلامی بینکوں اور اسلامی مالیاتی اداروں کے آپریشنز کا تجزیہ کریں اور یہ واضح کریں کہ انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔

ایک مرتبہ ملائیشیا میں ایک پریس کانفرنس کے دوران راقم الحروف سے اسلامی معیشت کی طرف پیش رفت میں اسلامی بینکوں کے حصے کے متعلق سوال کیا گیا۔ میرا جواب بظاہر تضاد کا حامل تھا۔ میں نے کہا کہ ان کا اسلامی معیشت کی طرف پیش رفت میں بہت بڑا حصہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس باب میں اسی جواب پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جب یہ کہا گیا کہ ان کا بہت بڑا کردار اور حصہ ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کی یہ نمایاں کامیابی ہے کہ انہوں نے ایسے مالیاتی ادارے بنا کر جن کا مقصد شریعت کی پیروی ہے ایک بہت بڑا راستہ نکالا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک سہانا خواب تھا کہ غیر سودی معیشت قائم ہو، لیکن اسلامی

بینکنگ محض تصور ہی تھا جس پر تحقیقی مقالہ جات میں بحث کی جاتی تھی اور اس کا کوئی عملی نمونہ موجود نہیں تھا۔ یہ اسلامی بینک اور اسلامی مالیاتی ادارے ہی تھے جنہوں نے اس نظریے اور تصور کو عملی جامہ پہنایا اور اس نظریاتی تصور کی زندہ اور عملی مثال قائم کی، اور انہوں نے یہ کام ایک ایسے ماحول میں کیا جہاں یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ کوئی بھی مالیاتی ادارہ سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام بینکوں کا یہ بڑا جرأت مندانہ قدم تھا کہ وہ یہ پختہ عزم لے کر آگے بڑھے کہ ان کے تمام معاہدات شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوں گے اور ان کی تمام سرگرمیاں سود میں ملوث ہونے سے پاک ہوں گی۔

ان اسلامی بینکوں کا ایک بہت بڑا حصہ یہ ہے کہ چونکہ یہ بینک شرعی نگرانی کے بورڈز کے ماتحت تھے اس لئے انہوں نے ماہرینِ شریعت کے سامنے جدید کاروبار سے متعلق متنوع سوالات پیش کیے، جس سے انہیں نہ صرف یہ کہ موجودہ تجارت اور کاروبار کو سمجھنے کا موقع ملا بلکہ شریعت کی روشنی میں ان کا جائزہ لے کر ان کے شرعاً قابلِ قبول متبادل پیش کرنے کا بھی موقع ملا۔

یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہئے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ہر ایسے مسئلے کا تسلی بخش حل پیش کرتا ہے جو آنے والے کسی بھی وقت میں کسی بھی صورتِ حال میں پیش آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قرآن کریم، سنتِ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان علماء کے استنباط کردہ احکامات میں ہماری سماجی و معاشی زندگی کی ہر ہر تفصیل بیان کر دی گئی ہے، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم اور سنتِ رسول اللہ ﷺ نے وسیع اور عمومی ضابطے مقرر فرما دیئے ہیں جن کی روشنی میں ہر دور کے علماء اپنے زمانے کی نئی صورتِ حال کے احکام نکال لیتے ہیں۔ اس نئی صورتِ حال کے متعلق خاص حکم شرعی تک پہنچنے کے لئے ماہرینِ شریعت کو بڑا اہم کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں ہر سوال پر قرآن و سنت میں طے کردہ اصولوں اور اسلامی فقہ کی کتابوں میں بیان کردہ قواعد کی روشنی میں غور کرنا پڑتا ہے۔ اس عمل کو ''استنباط'' اور ''اجتہاد'' کہا جاتا ہے۔ اجتہاد و استنباط کے اس عمل نے اسلامی فقہ کو علم و حکمت کی ایسی دولت عطا فرمائی ہے جس کے ہم پلہ کوئی اور مذہب نظر نہیں آتا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں شریعت اپنے پورے اثر و نفوذ کے ساتھ نافذ العمل ہو وہاں اجتہاد و استنباط کا مسلسل جاری عمل اسلامی فقہی ورثے میں نئے قواعد و ضوابط اور تصورات شامل کرتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ تقریباً ہر صورتِ حال کا واضح حکم اسلامی فقہ کی کتابوں میں تلاش کیا جائے۔ لیکن گزشتہ چند صدیوں کے دوران مسلمانوں کے سیاسی انحطاط نے اس عمل کو کافی حد تک روکے رکھا۔ بہت سے اسلامی ممالک براہِ راست غیر مسلم حکمرانوں کے تسلط میں تھے جنہوں نے طاقت کے زور پر لادین نظامِ

حکومت نافذ کیا اور مسلمانوں کی سماجی، معاشی زندگی کو شرعی ہدایات سے محروم رکھا، اور اسلامی احکامات، عبادات، دینی تعلیم اور بعض ملکوں میں نکاح وطلاق اور وراثت کے مسائل تک محدود ہو کر رہ گئے۔ جہاں تک سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو ان میں شریعت کی حاکمیت کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔

جس طرح کسی بھی قانونی نظام کے ارتقاء کا انحصار اس کے عملی اطلاق و نفاذ پر ہوتا ہے، اسی طرح کاروبار و تجارت کے بارے میں اسلامی قانون کے ارتقاء کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بازار میں جتنے بھی کاروباری معاہدات سیکولر تصورات پر مبنی ہوتے رہے انہیں بہت کم ماہرینِ شریعت کے سامنے ان کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لینے کے لئے پیش کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ اس عرصے میں بھی بعض باعمل مسلمانوں نے بعض عملی سوالات علماءِ شریعت کے سامنے پیش کیے جن کا حکم علماء نے فتویٰ کی صورت میں بیان کیا، جس کا ایک ٹھوس مجموعہ اب بھی دستیاب ہے، لیکن ان فتاوی کا تعلق عموماً انفرادی مسائل سے تھا اور ان سے ان لوگوں کی انفرادی ضرورتیں ہی پوری ہوئیں۔

اسلامی بینکوں کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے کہ ان کے کاروبار کے وسیع میدان میں آنے کی وجہ سے اسلامی قانونی نظام کے ارتقاء کا پہیہ دوبارہ چالو ہوا ہے۔ اکثر اسلامی بینک شریعہ نگرانی بورڈز کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ یہ بینک اپنی روزمرہ کی مشکلات و مسائل ماہرینِ شریعت کے سامنے پیش کرتے ہیں جو کہ اسلامی اصول وقواعد کی روشنی میں ان کے بارے میں خاص احکام جاری کرتے ہیں۔ اس طریقِ کار سے صرف اتنا ہی نہیں کہ ماہرینِ شریعت نئی کاروباری صورتِ حال سے زیادہ واقف ہوتے ہیں بلکہ یہ علماء اپنے استنباطی عمل کے ذریعے اسلامی فقہ کے ارتقاء کا بھی ذریعہ بنتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی عمل کو ماہرینِ شریعت غیر اسلامی قرار دیتے ہیں تو علماءِ شریعت اور اسلامی بینکوں کی انتظامیہ کی مشترکہ کوششوں کے ذریعے ان کے مناسب متبادل بھی تلاش کیے جاتے ہیں۔ شریعہ بورڈز کی قراردادوں سے اب تک دسیوں جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔ اسلامی بینکوں کا معیشت کو اسلامی بنانے میں یہ ایک ایسا حصہ ہے جس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

ان اسلامی بینکوں کا ایک اور بڑا کردار یہ ہے کہ انہوں نے خود کو انٹرنیشنل مارکیٹ میں شامل کر لیا ہے، اور اسلامی بینکاری روایتی بینکاری سے ممتاز ہونے کی حیثیت سے پوری دنیا میں تدریجاً متعارف ہو رہی ہے۔ یہ تشریح ہے میرے اس تبصرے کی کہ اسلامی بینکوں کا اس کام میں بڑا حصہ ہے۔

دوسری طرف ان بینکوں کی کارکردگی میں بہت سی کوتاہیاں بھی ہیں جن کا سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ ہونا چاہئے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلامی بینکنگ کا تصور ایک معاشی فلسفے پر مبنی ہے جو شریعت کے اصول و احکام کی تہہ میں موجود ہے۔ غیر سودی بینکاری کے تناظر میں اس فلسفے کا ہدف ہر قسم کے استحصال سے پاک تقسیم دولت میں عدل کا قیام ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے مختلف مضامین میں بیان کیا ہے کہ سود میں مستقل رُخ امیر کی حمایت میں اور عام آدمی کے مفادات کے خلاف ہوتا ہے۔ امیر صنعتکار بینکوں سے بڑی مقدار میں قرضے لے کر عام کھاتہ داروں کی رقوم کو اپنے بڑے نفع آور منصوبوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بہت بڑا نفع حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ عام کھاتہ داروں کو معمولی سی شرح سود کے علاوہ اپنے نفع میں شریک نہیں ہونے دیتے، اور یہ معمولی سی مقدار بھی اپنی مصنوعات کی لاگت میں شامل کر کے (اور ان کی اتنی قیمت بڑھا کر) واپس لے لی جاتی ہے، اس لئے اگر کلی سطح (Macro Level) پر دیکھا جائے تو یہ عام کھاتہ دارں کو کچھ بھی نہیں دیتے، جبکہ اگر بہت زیادہ خسارہ ہو جائے جس کی وجہ سے یہ دیوالیہ ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں خود بینک بھی دیوالیہ ہو جائے تو سارا خسارہ کھاتہ داروں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اس طریقے سے سود، دولت کی تقسیم میں بے انصافی اور عدم توازن پیدا کرتا ہے۔

اسلامی تمویل میں صورتِ حال اس سے مختلف ہے، شریعت کی رو سے تمویل (Financing) کا مثالی طریقہ مشارکہ ہے جہاں نفع اور نقصان دونوں میں دونوں فریق متناسب طور پر شریک ہوتے ہیں۔ مشارکہ کھاتہ داروں کو کاروبار سے حقیقتاً حاصل ہونے والے منافع میں حصہ دار ہونے کے زیادہ بہتر مواقع فراہم کرتا ہے، اور یہ نفع عام حالات میں شرح سود سے کافی زیادہ ہوسکتا ہے۔ چونکہ نفع کا اس وقت تک تعین نہیں ہوسکتا جب تک کہ متعلقہ اشیاء مکمل طور پر بیچ نہ دی جائیں اس لئے کھاتہ داروں (Depositors) کو اداشدہ نفع مصنوعات کی لاگت میں شامل نہیں کیا جاسکتا، اس لئے سودی نظام کے برعکس کھاتہ داروں کو اداشدہ نفع قیمت میں اضافہ کر کے واپس وصول نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی بینکاری کے اس فلسفے کو اس وقت تک عملی حقیقت نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ اسلامی بینک مشارکہ کے استعمال کو وسعت نہ دیں۔ یہ صحیح ہے کہ مشارکہ کے استعمال میں کچھ عملی مشکلات ہیں خصوصاً موجودہ ماحول میں جہاں اسلامی بینک تنہائی میں اور عموماً متعلقہ حکومتوں کے تعاون کے بغیر کام کر رہے ہیں، لیکن پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اسلامی بینکوں کو تدریجی مراحل میں مشارکہ کی طرف بڑھنا اور انہیں تمویل مشارکہ کا حجم بڑھانا چاہئے۔ بدقسمتی سے اسلامی بینکوں نے اسلامی بینکاری کے اس بنیادی تقاضے کو نظر انداز کیا ہوا ہے اور مشارکہ کے استعمال کی طرف پیش رفت کی قابل ذکر

کوششیں موجود نہیں ہیں، حتیٰ کہ تدریجی طریقے سے اور منتخب بنیادوں پر بھی نہیں ہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ چند ناموافق عناصر کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پہلے نمبر پر تو یہ کہ اسلامی بینکاری کا بنیادی فلسفہ نظرانداز شدہ نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مشارکہ کے استعمال کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے اسلامی بینک مرابحہ اور اجارہ کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، اور یہ استعمال بھی روایتی معیارات مثلاً LIBOR وغیرہ کے فریم ورک میں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آخری نتیجہ مادی طور پر سودی معاملے سے مختلف نہیں ہوتا۔ میں ان لوگوں کی تائید نہیں کررہا جو روایتی بینکوں کے معاملات اور مرابحہ واجارہ میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے یا جو مرابحہ اور اجارہ کے بارے میں وہی کاروبار مختلف نام سے جاری رکھنے کا اعتراض کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر اجارہ اور مرابحہ کو ضروری شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ان میں فرق کی بہت سی وجوہ ہیں جو انہیں سودی معاملے سے ممتاز کرتی ہیں، لیکن اس بات کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ دو ذریعے اصلاً شریعت میں طریقہ ہائے تمویل نہیں ہیں۔ علماءِ شریعت نے انہیں تمویل کے لئے استعمال کرنے کی اجازت صرف ان صورتوں میں دی ہے جہاں مشارکہ قابلِ عمل نہ ہو، اور یہ اجازت بھی خاص شرائط کے ساتھ دی ہے، اس اجازت کو دائمی ضابطے کے طور پر نہیں لینا چاہئے، اور ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ بینک کے تمام معاملات مرابحہ واجارہ کے گرد گھومتے رہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب عوام کو یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ اسلامی بینکوں میں ہونے والے معاملات سے حاصل ہونے والی آمدن روایتی بینکوں ہی کی طرح ہے تو وہ اسلامی بینکوں کے عمل کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہوں گے۔

چوتھی بات یہ کہ اگر اسلامی بینکوں کے تمام معاملات مذکورہ بالا ذریعوں (مرابحہ، اجارہ) پر مبنی ہوں تو عوام کے سامنے ان بینکوں کے حق میں دلائل دینا مشکل ہو جائے گا، خاص طور پر غیر مسلموں کے سامنے جو یہ محسوس کریں گے کہ یہ دستاویزات کے توڑ مروڑ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

بہت سے اسلامی بینکوں میں یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ ان میں مرابحہ واجارہ کو بھی ان کے شرعاً مطلوب طریقِ کار کے مطابق اختیار نہیں کیا جاتا۔ مرابحہ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ کوئی چیز خرید کر اسے گاہک کو مؤجل ادائیگی پر نفع کے خاص تناسب کے ساتھ بیچ دیا جائے۔ شرعاً یہ ضروری ہے کہ اس چیز کے آگے بیچنے سے پہلے وہ چیز بینک کی ملکیت اور کم از کم اس کے معنوی قبضے میں آجائے، جس عرصے میں وہ چیز بینک کے قبضے اور ملکیت میں ہے اتنی دیر وہ اس کے ضمان (Risk) میں ہو۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ بہت سے اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے اس معاملے کے بارے میں بہت سی

غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

بعض مالیاتی اداروں نے یہ مفروضہ قائم کر رکھا ہے کہ مرابحہ تمام عملی مقاصد کے لئے سود کا قائم مقام ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ بعض اوقات ایسی صورت میں بھی مرابحہ کا عقد کر لیتے ہیں جبکہ کلائنٹ کو فوری اخراجات (Overhead Expenses) کے لئے فنڈز درکار ہوتے ہیں۔ جیسے تنخواہوں کی ادائیگی، ایسی اشیاء وخدمات کے بلوں کی ادائیگی جنہیں پہلے استعمال کیا جاچکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی مرابحہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ بینک کوئی چیز خرید ہی نہیں رہا۔

بعض صورتوں میں کلائنٹ اپنے طور پر کسی بینک کے ساتھ معاہدے سے پہلے چیز خرید لیتا ہے اور مرابحہ بائی بیک (Buy Back) کے طور پر کرلیا جاتا ہے۔ یہ بھی اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، اس لئے کہ بائی بیک کو متفقہ طور پر شرعاً ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

بعض صورتوں میں خود کلائنٹ ہی کو بینک کی طرف سے اس بات کا وکیل بنا دیا جاتا ہے کہ وہ متعلقہ چیز خریدے اور اسے حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ ہی کو بیچ دے۔ یہ طریقہ مرابحہ کے جواز کی بنیادی شرائط کے مطابق نہیں ہے۔ اگر کلائنٹ ہی کو چیز کی خریداری کے لئے وکیل بنانا ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس کی وکیل ہونے کی حیثیت اور خریدار ہونے کی حیثیت الگ الگ ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ضروری ہے کہ کلائنٹ وہ چیز بینک کی طرف سے خریدنے کے بعد بینک کو مطلع کرے کہ اس نے اس کی طرف سے وہ چیز خرید لی ہے، اس کے بعد بینک باقاعدہ ایجاب وقبول کے ساتھ وہ چیز اسے بیچے، اور ایجاب وقبول فیکس یا ٹیلیکس وغیرہ کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے مرابحہ بیع کی ایک قسم ہے اور شریعت کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ قیمت بیع کے وقت متعین ہوجانی چاہئے۔ جب فریقین نے قیمت متعین کر لی تو بعد میں یک طرفہ طور پر اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض مالیاتی ادارے ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے مرابحہ کی قیمت میں اضافہ کر لیتے ہیں جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ بعض مالیاتی ادارے نادہندگی کی صورت میں مرابحہ کے اندر رول اور (Roll-Over) کر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ عمل بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جب ایک چیز ایک گاہک کو ایک مرتبہ بیچ دی گئی تو اسی گاہک کو وہ چیز دوبارہ نہیں بیچی جاسکتی۔

اجارہ کے معاملہ میں بھی شریعت کے بعض تقاضوں کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اجارہ کے صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ موجر (Lessor) اجارہ شدہ اثاثہ کی ملکیت سے تعلق رکھنے والا رسک قبول کرے اور یہ کہ وہ مستاجر (Lessee) کو اس چیز کے استعمال کا حق فراہم کرے جس کے

بدلے میں وہ کرایہ (Rent) ادا کرے گا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اجارہ کے بہت سے معاہدات میں ان قواعد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ اجارہ پر دیئے گئے اثاثے کے آفتِ سماویہ کی وجہ سے تباہ ہو جانے کی صورت میں مستاجر سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کرایہ ادا کرتا رہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ موجر ملکیت کا ضمان (Risk) بھی قبول نہیں کرتا ہے اور مستاجر کو حق استعمال بھی مہیا نہیں کرتا۔ اس نوعیت کا اجارہ شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

اسلامی بینکاری ان اصولوں پر مبنی ہے جو روایتی بینکاری نظام کے اصولوں سے مختلف ہیں، اس لئے یہ بات منطقی ہے کہ نفع آوری میں ان دونوں کے نتائج بھی لازمی طور پر ایک جیسے نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں اسلامی بینک زیادہ کمالے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں تھوڑا کمائے۔ اگر ہمارا ہدف یہ ہو کہ ہم نے نفع کے معاملے میں روایتی بینکوں کے ساتھ برابری کرنی ہے تو ہمارے لئے خالص اسلامی اصولوں پر مبنی اپنا نظام قائم کرنا مشکل ہوگا۔ جب تک اسلامی بینکوں میں سرمایہ لگانے والے، ان کی انتظامیہ اور ان کے گاہک اس حقیقت کو نہیں اپناتے اور مختلف نتائج (جن کا ناپسندیدہ ہونا لازمی نہیں) کو قبول نہیں کرتے اس وقت تک یہ اسلامی بینک مصنوعی طریقوں کو استعمال کرتے رہیں گے اور خالص اسلامی سسٹم وجود میں نہیں آئے گا۔

اسلامی اصولوں کے مطابق کاروباری معاملات کو معاشرے کے اخلاقی مقاصد سے الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اسلامی بینکوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ نئی مالیاتی پالیسیاں اپنائیں گے اور سرمایہ کاری کے نئے ذرائع تلاش کریں گے جس سے ترقی کی حوصلہ افزائی اور چھوٹی سطح کے تاجروں کو اپنی معاشی سطح بلند کرنے میں مدد ملے گی۔ بہت کم اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ روایتی مالیاتی اداروں کے برعکس جن کا مقصد ہی محض زیادہ سے زیادہ نفع کمانا ہے اسلامی بینکوں کو چاہئے کہ وہ معاشرے کی ضرورتوں کی تکمیل کو بھی اپنے مقاصد میں سے ایک مقصد بنائیں اور ان طریقوں کو ترجیح دیں جو عام شخص کو اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں مدد دے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ہاؤس فنانسنگ، گاڑیوں کی تمویل اور آبادکاری کی تمویل کی نئی سکیمیں چھوٹے تاجروں کے لئے ایجاد کریں، یہ میدان ابھی تک اسلامی بینکوں کی توجہ کا منتظر ہے۔

اسلامی بینکاری کے کیس کو اس وقت تک آگے نہیں بڑھایا جا سکتا جب تک کہ بینکوں کے باہمی معاملات کا ایسا نظام نہ قائم کرلیا جائے جو اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔ اس طرح کے کسی نظام کے فقدان کی وجہ سے اسلامی بینک اپنی قلیل مدتی سیولیت (Liquidity) کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے روایتی بینکوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ بینک ایسی سہولت واضح یا چھپے

ہوئے سود کے بغیر فراہم نہیں کرتے۔ اسلامی اصولوں پر مبنی بینکوں کے باہمی تعلقات کا قیام اب کوئی مشکل کام معلوم نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اسلامی مالیاتی اداروں کی تعداد آج کل دوسو کے لگ بھگ ہے، یہ بینک مرابحہ اور اجارہ کو ملا کر ایک فنڈ قائم کر سکتے ہیں جس کے یونٹس فوری ضرورت کے معاہدات کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں، اگر یہ بینک اس طرح کا فنڈ قائم کرلیں تو اس سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

آخری بات یہ کہ اسلامی بینکوں کو اپنا ایک الگ کلچر تشکیل دینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اسلام بینکاری کے معاہدات تک محدود نہیں ہے، یہ تو اصول وضوابط کا ایسا مجموعہ ہے جو پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے، اس لئے ''اسلامی'' بننے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اسلامی اصولوں پر مبنی معاہدات ڈیزائن کر لیے جائیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ادارے کے عمومی رویے اور اس کے عملے سے اسلامی تشخص کے آثار نمایاں ہوں جس کی وجہ سے وہ روایتی اداروں سے ممتاز نظر آئے۔ اس کے لئے ادارے اور اس کی انتظامیہ کے عمومی رجحان میں تبدیلی ضروری ہے۔

عبادات کے متعلق اسلامی فرائض اور اخلاقی روایات ایسے ادارے کے ماحول میں نمایاں ہوں جو خود کو اسلامی کہلاتا ہے۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں شرق اوسط کے بعض اسلامی اداروں نے پیش رفت کی ہے، لیکن یہ پوری دنیا کے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کا امتیازی وصف ہونا چاہئے۔ اس میدان میں بھی شریعہ بورڈز کی راہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔

جیسا کہ شروع میں واضح کر دیا گیا تھا، اس بحث کا مقصد اسلامی بینکوں کی حوصلہ شکنی کرنا یا ان کی خامیاں تلاش کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی کارکردگی کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں اور اپنے طریقہ ہائے کار کی تشکیل اور پالیسیوں کے تعین میں حقیقت پسندانہ سوچ اپنائیں۔

فرہنگ

Glossary

الف

آبادکاری کی تمویل: زوال پذیر کاروبار کو بہتر بنانے یا بے گھر لوگوں کو آباد کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا۔

آپریشنز: معاملات کارکردگی

آجر: وہ شخص جو کسی عملِ پیدائش (پروڈکشن) کا ارادہ کر کے دیگر عاملینِ پیدائش (زمین، محنت اور سرمایہ) کو اس کام کے لئے اکٹھا کرتا، انہیں کام میں لگاتا اور اس کاروبار میں نفع نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ یہ ایک شخص بھی ہوسکتا ہے اور ایک جماعت بھی۔ اصطلاح میں اسے ''تنظیم'' بھی کہتے ہیں۔

آفتِ سماویہ: آسمانی آفت، ایسا عارض جو انسان کے اختیار سے باہر ہو۔

اصیل: وہ شخص جو اپنے لئے معاملات کر رہا ہو، کسی دوسرے کی طرف سے وکیل نہ ہو۔

افراطِ زر: معاشیات کی اصطلاح میں ''افراطِ زر'' سے مراد ایسی صورتِ حال ہوتی ہے جس میں زر کا پھیلاؤ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اشیاء و خدمات کی مجموعی طلب ان کی رسد کے مقابلے میں بڑھ جائے اور قیمتوں کا رجحان بلندی کی طرف ہو جائے۔ لیکن عرفِ عام میں ''افراطِ زر'' سے اشیاء و خدمات کی قیمتوں میں اضافہ مراد لیا جاتا ہے۔

اکاؤنٹ ہولڈر: بینک کے کھاتہ دار، وہ لوگ جو بینک میں اپنے اکاؤنٹ کھلواتے ہیں۔

ایجاب: کسی عقد مثلاً کوئی چیز خریدنے یا فروخت کرنے کی پیشکش۔

ایل سی: وہ ضمانت نامہ جو درآمد کنندہ، برآمد کنندہ کو اس بات کا اعتماد دِلانے کے لئے کہ وہ مال وصول ہونے پر قیمت کی ادائیگی بروقت کر دے گا، بینک سے حاصل کرتا ہے، اس میں بینک برآمد کنندہ کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ

اگر درآمد کنندہ (مشتری) کو یہ چیز فروخت کر دی جائے تو ذمہ دار میں ہوں گا۔ بینک سے ایسا ضمانت نامہ حاصل کرنے کو اُردو میں ''ایل سی کھلوانا'' کہتے ہیں۔

اوپن اینڈ فنڈ: ایسا سرمایہ کاری کا فنڈ جس کے یونٹ دوبارہ خریدنے کا فنڈ کی طرف سے وعدہ ہو۔

ب

بائی بیک (Buy Back): کوئی چیز ایک شخص سے خرید کر اسی کو واپس بیچ دینا۔ مرابحہ میں اس سے مراد یہ ہے کہ کلائنٹ (خریدار) اور بینک کے درمیان جس چیز پر بیع مرابحہ ہو رہی ہے وہ پہلے سے خریدار کے پاس موجود ہے، بینک اس سے یہ چیز نقد کم قیمت پر خرید کر فوراً ہی نفع پر اسی کو دوبارہ اُدھار بیچ دیتا ہے۔ اس طرح بینک اپنا نفع کما لیتا ہے۔ بائی بیک کی یہ صورت ظاہر ہے ناجائز ہے کیونکہ سودی قرض ہی کی ایک شکل ہے۔

بل آف ایکسچینج: جب کوئی شخص کسی تاجر سے کوئی مال خریدتا ہے اور خریدار اس مال کی قیمت نقد ادا نہیں کرتا بلکہ ادائیگی آئندہ کسی تاریخ میں طے ہوتی ہے تو تاجر اپنے خریدار کے نام بل بناتا ہے۔ اس بل کو دستاویزی شکل دینے کے لئے خریدار اسے منظور کر کے اس پر اپنے دستخط کر دیتا ہے۔ یہ دستاویز ''بل آف ایکسچینج'' کہلاتی ہے، اُردو میں اسے ''ہنڈی'' بھی کہا جاتا ہے۔

پ

پرامیسری نوٹ: قرض خواہ اور مقروض کے درمیان لکھی جانے والی وہ دستاویز جس میں مقروض اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ ایک متعین تاریخ پر قرض کی رقم ادا کر دے گا۔ یہ دستاویز اپنی ایک قانونی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس کی بنیاد پر مقروض کو مقررہ تاریخ میں ادائیگی پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

ت

تمسکات: نفع بخش دستاویزات جو اپنے حامل کی کسی کاروبار میں سرمایہ کاری یا کسی قرض کی نمائندگی کرتی ہوں۔ عموماً ان دستاویزات کی ثانوی بازار میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔

تمویل: (Finance)، تجارتی اور پیداواری مقاصد کے لئے افراد یا کمپنیوں کو رقوم مہیا کرنا۔

تمویلی خدمات: پیداواری مقاصد کے لئے رقوم فراہم کرنے کے لئے انجام دیئے جانے والے امور۔

تمویل کار: پیداواری مقاصد کے لئے رقوم فراہم کرنے والا فرد یا ادارہ (Financier)۔

تنضیض: دیکھئے ''لیکویڈیشن''

تنظیم: دیکھئے ''آجر''

تطہیر: (Purification)، کسی فنڈ کی مجموعی آمدن تو حلال ہو، لیکن بعض کمپنیوں کے منافع منقسمہ میں سود کا کچھ عنصر شامل ہونے کی وجہ سے نفع کا کچھ حصہ ناجائز اور حرام ہو، فنڈ کے شرکاء کو نفع تقسیم کرنے سے پہلے اس حرام حصے کو الگ کر کے صدقے کے ثواب کی نیت کے بغیر خیراتی کام پر خرچ کر دینا۔

ج

جننگ فیکٹری: کپاس بیلنے کا کارخانہ۔

جوائنٹ اسٹاک کمپنی: ایسی کاروباری مہم جس میں لگائے جانے والے سرمائے کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں (مثلاً دس، دس روپے) میں تقسیم کر کے لوگوں کو کاروبار میں سرمایہ کاری کی دعوت دی جاتی ہے۔ لوگ کمپنی کو سرمایہ فراہم کر کے ہر اکائی کے بدلے ایک سرٹیفکیٹ (شیئر) حاصل کرتے ہیں اور کاروبار کا سالانہ منافع ان شیئر ہولڈرز میں ان کی سرمایہ کاری کے تناسب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت''۔

ح

حاضر سودا: نقد سودا، ایسا سودا جس میں فروخت شدہ چیز پر خریدار کا فوراً قبضہ کرا دیا جائے۔

حق احتباس: نقد سودے میں فروخت شدہ چیز کی قیمت وصول کرنے کے لئے وہ چیز خریدار کے حوالے نہ کرنا۔

خ

خدمات: انسان کی وہ ذہنی یا جسمانی کاوشیں جن کے صلے میں اسے مالی معاوضہ حاصل ہو، مثلاً ملازمت، وکالت وغیرہ۔

ڈ

ڈیویڈنڈ: کمپنی کا وہ سالانہ منافع جو حاملینِ حصص (شیئر ہولڈرز) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ذ

ذاتی منافع کا محرک: تجارتی اور معاشی سرگرمیوں میں اپنی ذات کے لئے منافع حاصل کرنے کا جذبہ۔

ر

رسد: معاشیات کی اصطلاح میں کسی بھی چیز کی وہ مجموعی مقدار جو بازار میں فروخت کرنے کے لئے لائی گئی ہو۔

رسک: نقصان کا خطرہ، کسی چیز کے ضائع ہو جانے کی صورت میں جو شخص اس کا نقصان برداشت کرے گا اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اس کے رسک میں ہے۔

رہن: دین (قرض) کے بدلے میں کوئی چیز گروی رکھنا۔

رأس المال: مشارکہ و مضاربہ میں اس سے مراد وہ اصل سرمایہ ہے جو کاروبار میں فریقین یا رب المال کی طرف سے لگایا گیا ہو اور بیع سلم میں اس سے مراد خریدی ہوئی چیز کی قیمت (ثمن) لی جاتی ہے۔

ری شیڈول کرنا: دین یا قرض کے مقررہ تاریخ پر ادا نہ ہو سکنے کی صورت میں سود کی شرح میں اضافہ کر کے ادائیگی کی نئی تاریخ مقرر کر دینا۔

رول اور (Roll Over): بینک سے قرض حاصل کرنے والا اگر مقررہ وقت پر بینک کو قرض واپس نہ کر سکے تو وہ بینک سے درخواست کرتا ہے کہ قرض کی مدت میں توسیع کر دی جائے۔ بینک نئی شرائط اور نئی شرح سود کے ساتھ یہ درخواست منظور کر لیتا ہے۔ گویا یہ نئی شرائط پر ایک نیا قرض ہوتا ہے۔

ز

زر: نقدی، اصطلاح میں ''زر'' سے مراد ایسی چیز ہوتی ہے جسے ذخیرہ کیا جا سکتا ہو، وہ آلۂ مبادلہ کے طور پر عام لوگوں میں گردش کرے، لوگ اسے قرضوں کی وصولی میں بلا روک ٹوک قبول کرتے ہوں اور اس سے دوسری اشیاء کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ لگایا جا سکے، جیسے کسی بھی ملک کی کرنسی۔

س

سرمایہ کاری: کسی کاروبار، تجارت وغیرہ میں سرمایہ لگانا۔

سرمایہ کاری اکاؤنٹ: بینک کا ایسا کھاتہ جس میں کھاتہ داروں کی جمع شدہ رقوم کو مختلف نفع بخش کاموں میں لگایا جاتا ہو۔

سیکٹرز: شعبے۔

سیولیت: نقدی اور نقد پذیر مالی دستاویزات مثلاً بانڈ، شیئرز وغیرہ۔

ش

شیئرز: وہ سرٹیفکیٹ جو کسی کمپنی کی طرف سے ان لوگوں کے لئے جاری کیے جاتے ہیں جو کمپنی میں اپنا سرمایہ لگا کر باقاعدہ اس میں حصہ دار بنتے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ اس بات کی سند ہوتے ہیں کہ کمپنی میں سرمایہ لگانے والے شخص کا کمپنی میں اتنا حصہ ہے۔

شیئر کیپٹل: کسی کاروبار میں لگائے گئے کُل سرمائے میں کسی شخص کا حصہ اس کا شیئر کیپٹل کہلاتا ہے۔

ص

صافی مالیت: کمپنی کا مالی استحکام معلوم کرنے کے لئے کمپنی کی ذمہ داریوں اور اثاثوں پر مشتمل سالانہ یا ایک متعین عرصے کے بعد ایک رپورٹ (بیلنس شیٹ) تیار کی جاتی ہے، جس میں ایک طرف کمپنی کی ذمہ داریوں کو درج کیا جاتا ہے، جبکہ دوسری طرف کمپنی کے اثاثے درج ہوتے ہیں۔ ان اثاثوں میں سے ذمہ داریوں کو منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچتا ہے اسے صافی مالیت (Net Worth) کہتے ہیں۔

ض

ضمان: دیکھئے ''رسک''

ط

طلب: معاشیات کی اصطلاح میں اشیاء و خدمات کو قیمتاً حاصل کرنے کی ایسی خواہش کو ''طلب'' کہا جاتا ہے جسے پورا کرنے کی قوت یعنی مطلوبہ رقم بھی موجود ہو۔ اگر کسی چیز کو مفت حاصل کرنے کی خواہش ہے یا اسے حاصل کرنے کے لئے مطلوبہ رقم میسر نہیں تو ایسی خواہش اصطلاح میں ''طلب'' نہیں کہلائے گی۔

ع

عاملِ پیدائش: مختلف اشیاء کی پیدائش (تیاری) میں جو چیز حصہ لیتی ہے اسے ''عاملِ پیدائش'' کہا جاتا ہے۔ جیسے کسی بھی چیز کی تیاری میں ''محنت'' کا دخل لازماً ہوتا ہے لہٰذا محنت ایک ''عاملِ پیدائش'' ہے۔

علی الحساب ادائیگی: مشترکہ کاروبار میں شرکاء کو اندازے کے ساتھ اس شرط پر نفع کی ادائیگی کرنا کہ کاروبار کے اختتام پر یا معینہ عرصہ کے بعد حقیقی حساب کیا جائے گا، جس میں اس ادائیگی کا بھی حساب ہوگا اور اس حساب کی بنیاد پر تمام شرکاء کے منافع کا تعین ہوگا۔

عمیل: بینک یا کسی مالیاتی ادارے کا کلائنٹ، وہ شخص جو بینک یا کسی مالیاتی ادارے سے کسی پیداواری مقصد کے لئے تمویل حاصل کرے۔

غ

غیر مصرفی تمویلی ادارے: وہ مالیاتی ادارے جو بینک تو نہیں، لیکن بینکوں کی طرح عام لوگوں سے رقوم جمع کرکے ان کے ذریعے تمویل کرتے ہیں۔

ف

فائنانسنگ: دیکھئے ''تمویل''

فائنانشر: دیکھئے ''تمویل کار''

فیس ویلیو: دیکھئے ''قیمتِ اسمیہ''

ق

قبول: کسی معاملے مثلاً خرید وفروخت کے لئے ہونے والی پیشکش کو قبول کرنا۔

قیمتِ اسمیہ: کسی سرٹیفکیٹ یا بانڈ وغیرہ پر لکھی ہوئی قیمت۔

ک

کارپوریٹ باڈی: ایسی ہیئت جسے قانوناً ایک ’’شخص قانونی‘‘ سمجھا جاتا ہے۔

کسٹم ڈیوٹی: کسی دوسرے ملک سے درآمد کیے جانے والے مال پر حکومت کی طرف سے لگایا گیا ٹیکس۔

کلائنٹ: گاہک، جو شخص کسی بینک یا مالیاتی ادارے سے قرض یا سرمایہ لینے آتا ہے وہ اس بینک یا مالیاتی ادارے کا کلائنٹ کہلاتا ہے۔

کلوز اینڈ فنڈ: ایسا فنڈ جس کے یونٹ دوبارہ خریدنے کا وعدہ نہ ہو۔

ل

لیکویڈیشن: غیر نقد اثاثوں کو بیچ کر نقد میں تبدیل کرنا۔

لبر: (LIBOR) کچھ بینکوں کے پاس زائد از ضرورت نقد رقم ہوتی ہے جبکہ کچھ کے پاس قرضے دینے کے لئے رقم کم ہوتی ہے، ایسے بینک اول الذکر سے قرض لیتے رہتے ہیں، اس طرح بینکوں کی ایک باہمی مارکیٹ وجود میں آ جاتی ہے، اس مارکیٹ میں کسی مخصوص مدت کے لئے شرح سود LIBOR کہلاتی ہے جو مخفف ہے London Inter-Bank Market Offered Rate کا۔ مزید تفصیل کتاب کے ص۹۳ کے حاشیے میں ملاحظہ ہو۔

م

مارک اپ: بیع مرابحہ میں اصل لاگت پر حاصل کیا جانے والا منافع۔

مارکیٹ اکانومی: بازاری معیشت، یہ سرمایہ دارانہ نظام کا دوسرا نام ہے جس میں معاشی مسائل کے حل کے لئے بازار کی طاقتوں (طلب اور رسد) سے کام لیا جاتا ہے۔

مالیاتی ادارے: وہ ادارے جو عام لوگوں سے رقمیں جمع کر کے انہیں مختلف افراد اور کمپنیوں کو تجارتی اور کاروباری مقاصد کے لئے فراہم کرتے ہیں۔

مینجمنٹ: انتظام و انصرام، منتظمہ۔

مستاجر: کوئی چیز کرایہ پر لینے والا۔

موجر: کوئی چیز کرایہ پر دینے والا۔

ہ

ہنڈی: دیکھئے ''بل آف ایکسچینج''

و

ورکنگ کیپٹل: کاروبار کے رواں اخراجات مثلاً سامانِ تجارت اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے لیا جانے والا قرضہ یا سرمایہ۔

ویٹو پاور: کسی فیصلے کو مسترد کرنے کا اختیار۔

بینک ڈپازٹس کے شرعی احکام

یہ مقالہ "احکام الودائع المصرفیة" کا اُردو ترجمہ ہے جو "بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے "اسلامی فقہ اکیڈمی" کے نویں اجلاس منعقدہ ابوظہبی، ذیقعدہ ۱۴۱۶ھ میں پیش کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بینک ڈیپازٹس کے بارے میں شرعی احکام

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی الہ واصحاب اجمعین و علی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

موجودہ دور میں بینک ڈیپازٹس بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ اور ہر شہر اور ہر ملک کا انسان اپنے کاروباری معاملات میں اس کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ان ڈیپازٹس سے متعلق بہت سے شرعی احکام بھی ہیں جن کا یقینی طور پر جاننا اور ان کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ مسائل موجودہ جدید دور کے پیدا کردہ ہیں لیکن قرآن وسنت کے بیان کردہ اصولوں سے اور فقہاءِ اُمت نے کتبِ فقہ میں جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان سے ان مسائل کا استخراج ممکن ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں ''بینک ڈیپازٹس'' سے متعلق شرعی احکام کو وضاحت اور تفصیل سے بیان کرنا پیشِ نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق اس کام کو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بینک ڈیپازٹس کیا ہیں؟

''بینک ڈیپازٹس'' (Bank Deposite) جس کو عربی میں ''الودائع المصرفیۃ'' کہا جاتا ہے، اس سے مراد وہ رقم ہے جو کوئی شخص کسی مالیاتی ادارے میں بطور امانت رکھوائے۔ چاہے وہ کسی متعین وقت کے لئے رکھوائے یا آپس میں یہ معاہدہ ہو جائے کہ مالک اپنی کُل قم یا بعض رقم جب چاہے گا بینک سے نکلوا لے گا۔

موجودہ بینکوں میں طریقہ کار یہ ہے کہ جو شخص بھی بینک میں رقم رکھواتا ہے وہ بعینہٖ اسی حالت میں بینک میں باقی نہیں رہتی بلکہ تمام رقموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے اور پھر بینک وہ رقم سرمایہ کاری کے لئے اپنے کلائنٹ کے حوالے کرتا ہے، اور اس پر ان سے سود یا منافع کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ رقم بینک کے ضمان یعنی رسک میں ہوتی ہے، اور آپس میں طے شدہ شرائط کے مطابق بینک کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ یہ رقم ہر حال میں مالک کو واپس کر دے۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس رقم کے لئے عام طور پر جو ''ودیعت'' یا ''امانت'' کا لفظ

استعمال کیا جاتا ہے، اس سے وہ معنیٰ مراد نہیں ہیں جو فقہ میں بولے جاتے ہیں، اس لئے کہ فقہ میں ''ودیعت'' اور امانت'' اس کو کہا جاتا ہے جو بعینہ اپنی اصل شکل میں امانت رکھنے والے کے پاس موجود رہے اور کسی تعدی اور زیادتی کے بغیر ہلاک ہونے کی صورت میں اس امانت کا ضمان یعنی تاوان بھی اس پر نہیں آتا۔ البتہ بینکوں میں رکھی گئی رقم کے لئے ''ودیعت'' کا لفظ لغوی معنی کے لحاظ سے استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی میں لفظ "ودیعة" ودع یدع سے "فعیلہ" کے وزن پر ہے۔ یعنی وہ چیز جس کو ''مودع'' یعنی ودیعت رکھنے والے کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ لہٰذا بینک ڈیپازٹس پر ''ودیعت'' کا اطلاق اس لغوی معنی کے لحاظ سے درست ہے۔ یعنی بینک مودع ہے، قطع نظر اس کے کہ اس میں موجود رقم امانت ہے یا مضمون ہے یعنی قابلِ تاوان ہے یا نہیں۔ (لیکن شریعت کی اصطلاح میں ودیعت کا جو مفہوم ہے اس کا بینک ڈیپازٹس پر اطلاق کرنا درست نہیں)۔

بینک ڈیپازٹس کی اقسام

موجودہ بینکوں کے عرف میں بینک ڈیپازٹس کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ کرنٹ اکاؤنٹ (Current Account) جاری کھاتہ

اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے والے شخص کی یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ جب چاہے گا اپنی رقم بینک سے نکلوا لے گا۔ چنانچہ کھاتہ دار (اکاؤنٹ ہولڈر) کو مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اور جتنی چاہے اپنی رقم بینک سے نکلوا لے۔ اور بینک اس کا پابند ہوتا ہے کہ وہ اس کے مطالبہ کرنے پر فی الفور رقم واپس کر دے۔ اور اکاؤنٹ ہولڈر اس بات کا پابند نہیں ہوتا کہ بینک سے رقم نکلوانے سے پہلے بینک کو پیشگی اطلاع دے۔ اس قسم کے اکاؤنٹ ہولڈر کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا۔ بلکہ بعض ممالک میں تو یہ طریقہ رائج ہے کہ بینک الٹا اکاؤنٹ ہولڈر سے اپنی خدمات کے بدلے میں فیس کا مطالبہ کرتا ہے۔ البتہ اس اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقم کو علیحدہ نہیں رکھا جاتا، بلکہ دوسری رقموں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ اور بینک کو یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ اس اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقم کو اپنی ضروریات میں خرچ کرے، اگرچہ بینکوں کا معمول یہ ہے کہ اس اکاؤنٹ میں رکھوائی گئی رقم کا ایک متناسب حصہ اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں تاکہ اکاؤنٹ ہولڈر جب بھی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے تو اس کو ادا کی جا سکے۔

۲۔ فکس ڈیپازٹ (Fixed Deposite)

یہ وہ رقم ہوتی ہے جو کسی معینہ مدت تک کے لئے بینک میں رکھوائی جاتی ہے۔ اور رقم رکھوانے والے شخص کو اس معینہ مدت سے پہلے رقم نکلوانے کا اختیار نہیں ہوتا، اور عام حالات میں یہ مدت پندرہ دن سے ایک سال تک کے درمیان ہوتی ہے۔ بینک یہ رقوم سرمایہ کاری کے اندر استعمال کرتا ہے۔ اور بینک رقوم رکھوانے والے حضرات کو مارکیٹ کے حالات کے مطابق مختلف ٹرم کے اعتبار سے مختلف تناسب سے سود ادا کرتا ہے۔

۳۔ سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) بچت کھاتہ

اس اکاؤنٹ میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے، اس کی کوئی مدت مقرر نہیں ہوتی، لیکن اکاؤنٹ ہولڈر قواعد اور ضوابط کے تحت ہی رقم نکلوا سکتا ہے، چنانچہ ایک ہی مرتبہ میں وہ تمام رقم نکلوانے کا اختیار نہیں رکھتا، بلکہ بینک اس کے لئے ایک مقدار مقرر کرتا ہے کہ ایک دن میں بس اس مقدار تک رقم نکلوانے کا اختیار ہے، اور بعض اوقات بڑی رقم نکلوانے کے لئے بینک کو پیشگی اطلاع دینی ضروری ہوتی ہے۔ اس اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقم ایک طرح سے کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم کی طرح ہوتی ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کسی معینہ مدت کے انتظار کے بغیر جب چاہے رقم نکلوا لے۔ اور ایک طرح سے فکس ڈیپازٹ کی طرح ہوتی ہے کہ تمام رقم ایک مرتبہ میں نہیں نکالی جا سکتی۔ اور بینک اس اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقم پر کچھ منافع بھی دیتا ہے، البتہ فکس ڈیپازٹ کے مقابلے میں اس کا نفع کم ہوتا ہے۔

۴۔ لاکرز (Lockers)

اس کو عربی زبان میں "خزانات المقفولة" (بند تجوری) کہا جاتا ہے۔ ایک شخص بینک کے اندر کسی مخصوص تجوری کو کرایہ پر لیتا ہے اور اس تجوری میں وہ خود اپنی رقم رکھتا ہے۔ اس رقم سے بینک کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ بینک کے ملازمین کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس نے تجوری کے اندر کیا رکھا ہے۔ عام طور پر لوگ اس تجوری میں سونا، چاندی، قیمتی پتھر اور قیمتی دستاویزات رکھتے ہیں۔ البتہ نقد رقم بھی اس تجوری میں رکھی جا سکتی ہے۔

بینکوں میں رکھی گئی رقوم کی فقہی حیثیت

مندرجہ بالا چار قسموں کی رقومات کے بارے میں شرعی احکام جاننے سے پہلے ان کی فقہی حیثیت جاننا ضروری ہے، کیونکہ ان کے بارے میں تمام شرعی احکام ان کی فقہی حیثیت متعین ہونے پر موقوف ہیں۔

جہاں تک چوتھی قسم یعنی ''لاکرز'' کا تعلق ہے، اس کے اندر کوئی شبہ نہیں کہ وہ شخص ''لاکرز'' کو بینک سے کرایہ پر حاصل کرتا ہے، اور دونوں کے درمیان کرایہ داری کا معاملہ طے ہوتا ہے۔ اور کرایہ داری کے معاہدے کے بعد وہ ''لاکرز'' بینک کے پاس ہی بطور امانت کے موجود رہتا ہے۔ لہٰذا اس پر ''امانت'' کے احکام نافذ ہوں گے۔

جہاں تک پہلی تین قسموں کا تعلق ہے تو چونکہ عام روایتی بینکوں میں ان کی جو حیثیت ہے اسلامی بینکوں میں ان کی حیثیت اس سے مختلف ہے، اس لئے دونوں قسم کے بینکوں کے بارے میں علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مناسب ہے۔

عام بینکوں میں رکھی جانے والی رقوم

جہاں تک عام بینکوں میں رکھی جانے والی رقوم کا تعلق ہے تو موجودہ دور کے علماء کی بہت بڑی تعداد کا یہ کہنا ہے کہ اس رقم کی حیثیت ''قرض'' کی ہے جو اکاؤنٹ ہولڈر بینک کو دیتا ہے۔ اگر اس رقم کو آپ ''امانت'' کا نام دیں تب بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ ''عقود'' کے اندر معانی کا اعتبار ہوتا ہے ''الفاظ'' کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اور رقم کی یہ حیثیت تینوں قسم کے اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقموں کو شامل ہے۔ یعنی ''کرنٹ اکاؤنٹ، سیونگ اکاؤنٹ، اور فکس ڈیپازٹ'' اس لئے کہ ان تینوں میں جو رقم رکھی جاتی ہے وہ بینک کے ذمہ ''مضمون'' ہوتی ہے۔ (بینک اس کا ذمہ دار ہوتا ہے یعنی وہ بینک کے رسک پر ہوتی ہے) ''مضمون'' ہونے کی وجہ سے وہ رقم ''امانت'' ہونے کی حیثیت سے نکل جاتی ہے۔ اس لئے کہ امانت کا حکم یہ ہے کہ وہ امانت رکھنے والے کے ہاتھ میں ''مضمون'' یعنی قابل تاوان نہیں ہوتی (اگر بلا تعدی ہلاک ہو جائے وہ ضامن نہیں ہوگا)

البتہ موجودہ دور کے بعض علماء نے ''فکس ڈیپازٹ'' میں رکھی جانے والی رقم اور ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی جانے والی رقم کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''فکس ڈیپازٹ'' میں رکھی جانے والی رقم فقہی اعتبار سے ''قرض'' ہے، اس لئے کہ اس میں اکاؤنٹ ہولڈر کو اس بات کا

اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے اپنی رقم بینک سے نکلوا لے۔ یہی پابندی اس رقم کو ''امانت'' کے زمرے سے نکال کر ''قرض'' کے زمرے میں داخل کر دیتی ہے۔ اسی طرح ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں رکھوائی جانے والی رقم بھی ''امانت'' نہیں ہوتی، بلکہ وہ ''قرض'' ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اکاؤنٹ ہولڈر ایک ہی وقت میں پوری رقم نکلوانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ لیکن کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقم ان حضرات علماء کے نزدیک مندرجہ بالا دونوں اکاؤنٹوں میں رکھی جانے والی رقموں سے مختلف ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کی رقم ''مضمون'' ہونے کے باوجود ''امانت'' ہوتی ہے، اس لئے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے بینک سے اپنی پوری رقم نکلوا لے، اور وہ کسی شرط کا پابند بھی نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے والے کی کبھی بھی یہ نیت نہیں ہوتی کہ ''بینک'' کو سرمایہ کاری کے نتیجے میں جو منافع یا سود ہوگا، میں اس کے اندر شریک ہو رہا ہوں، بلکہ وہ صرف حفاظت کی نیت سے بینک میں رقم رکھواتا ہے۔ لہٰذا جب اس کا مقصد بینک کو قرض دینا نہیں ہے تو اس رقم کو ''قرض'' کا نام دینا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ یہ ''تفسیر القول بما لا یرضی به قائله'' (یعنی کسی قائل کی بات کا ایسا معنی و مطلب بیان کرنا جس سے قائل متفق نہ ہو) کے تحت داخل ہو جائے گا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بینک ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی جانے والی رقم کو بھی دوسری رقومات کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے، اور اس رقم کو اپنی ضروریات میں بھی استعمال کر لیتا ہے، تو صرف اتنی بات اس رقم کو ''امانت'' ہونے سے خارج نہیں کرتی۔ اس لئے کہ عرفاً بینک کا یہ تصرف مالک کی اجازت سے ہوتا ہے۔ (اور مالک کی اجازت سے امانت میں تصرف کرنا جائز ہے) اور اس تصرف کے نتیجے میں وہ رقم ''امانت'' ہونے سے نہیں نکلے گی۔

لیکن ہمارے نزدیک بینک کی رقوم کی حیثیت کے بارے میں بعض علماء کی بیان کردہ مندرجہ بالا تفصیل درست نہیں، اس لئے کہ بینکوں میں رقم رکھوانے والے عوام امانت، قرض، اور دین کی اصطلاحات کے فرق سے واقف نہیں ہوتے، اور نہ ہی ان کو ان اصطلاحات سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ عوام کو تو صرف اس رقم سے حاصل ہونے والے نتائج سے دلچسپی ہوتی ہے۔ چنانچہ عام حالات میں بینک کے اندر رقم رکھوانے والا صرف اسی صورت میں رقم رکھوانے پر رضامند ہوتا ہے جب بینک اس رقم کی واپسی کی ضمانت دے۔ لہٰذا اگر رقم رکھوانے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری یہ رقم بینک والوں کے پاس ''امانت'' کی حیثیت سے رہے گی، اگر یہ رقم بینک سے چوری ہو گئی یا تعدی (یعنی قواعد کی خلاف ورزی) کے بغیر ضائع ہو گئی تو بینک یہ رقم واپس نہیں کرے گا، تو اس صورت میں یہ شخص کبھی بھی اپنی رقم بینک میں رکھوانے پر رضامند نہیں ہوگا۔ اور اگر بینک کی طرف سے یہ واضح اعلان نہ ہوتا، یا

بینکوں کے مروجہ عرف میں یہ بات معروف نہ ہوتی کہ جو شخص بھی بینک میں رقم رکھوائے گا، بینک اس کا ضامن ہوگا، تو اس صورت میں بینک میں رقم رکھوانے والے بہت سے لوگ بینکوں میں اپنی رقم نہ رکھواتے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خود رقم رکھوانے والے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی رقم بینکوں میں ''مضمون'' رہے۔ یعنی اگر وہ ضائع ہو جائے تو بینک اس رقم کا ضامن ہو، صرف بطور ''امانت'' کے وہ رقم بینک کے پاس نہ رہے، اس لئے کہ ''امانت'' کی رقم مضمون نہیں ہوتی، البتہ ''قرض'' کی رقم مضمون ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ فقہی اعتبار سے رقم رکھوانے والوں کا مقصد بینک کو قرض دینا ہے، ''امانت'' رکھوانا نہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس قرضہ دینے سے ان حضرات کا بنیادی مقصد ''بینک کو ضامن بنا کر اپنی رقم کا تحفظ حاصل کرنا ہے، اپنی رقم کے ذریعہ بینک کی ضروریات میں تعاون کر کے بینک کے ساتھ کوئی تبرع اور احسان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور صرف اس مقصد کی وجہ سے یہ معاملہ ''قرض'' ہونے کی صفت سے خارج نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ''عقد قرض'' میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ ایک شخص دوسرے کو اپنا مال اس اجازت کے ساتھ دے کہ وہ جہاں چاہے اپنی ضروریات میں اس کو خرچ کرے۔ بشرطیکہ قرض دینے والا جب کبھی بھی اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے گا تو قرض لینے والا اس مال کے مثل اس کو واپس کرے گا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ وہ مال قرض لینے والے پر ''مضمون'' ہوگا (یعنی اگر ضائع ہو جائے تب بھی اس کے مثل ادا کرنا پڑے گا)۔

بینک میں رکھی جانے والی رقوم میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرض دینے والا اس قرض دینے سے قرض لینے والے پر تبرع اور احسان کرنے کا ارادہ کرے کہ اس قرض دینے سے میرا مقصد اس کی ضروریات میں تعاون کرنا ہے تو یہ مقصد کسی رقم کے ''قرض'' ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ''قرض'' کے بعض معاملات میں یہ مقصد پایا جاتا ہے اور بعض میں نہیں پایا جاتا۔ (لہٰذا اس مقصد کے پائے جانے اور نہ پائے جانے سے کسی رقم کے قرض ہونے یا نہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا)

چنانچہ روایات میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ لوگ ان کے پاس اپنی رقمیں بطور امانت رکھوانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور اس رقم رکھوانے سے ان کا مقصد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ اپنی رقم کی حفاظت مقصود ہوتی تھی۔ لیکن حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص ان کے پاس رقم لے کر آتا تو آپ اس سے اس رقم

میں تصرف کرنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ لیتے کہ یہ رقم میرے پاس ''مضمون'' ہوگی، اس اجازت اور شرط کے بعد اس رقم کو قبول فرماتے۔ چنانچہ جب آنے والا شخص ''امانت'' کے نام سے رقم پیش کرتا تو آپ فرماتے: "لا لکن ھو سلف" یہ رقم امانت نہیں، بلکہ ''قرض'' ہے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اس معاملے کو ''عقد سلف'' یعنی عقد قرض فرمایا، حالانکہ قرض دینے والوں کا مقصد اس قرض سے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون کرنا نہیں تھا، بلکہ اس قرض دینے سے صرف اپنے مال کی حفاظت مقصود تھی۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنے مال کی حفاظت کی نیت سے قرض دینا ''عقد قرض'' کے منافی نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ''عقد قرض'' اگرچہ ایک ''عقد تبرع'' ہی ہے، اس لئے کہ قرض دینے والا اپنی قرض دی ہوئی رقم سے زیادہ رقم کا مستحق نہیں ہوتا، لیکن یہ ''عقد قرض'' ایسا ''عقد مالی'' بھی ہے جس میں جانبین کا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے، چنانچہ کبھی قرض دینے والے کا یہ مفاد ہوتا ہے کہ اس قرض دینے کے نتیجے میں اس کو آخرت میں اجر و ثواب ملے گا (جب کہ ضرورت مند لوگوں کو قرض دیا جائے اور قرض دینے کا مقصد ان کے ساتھ تعاون ہو) اور کبھی یہ مفاد ہوتا ہے کہ قرض دینے کے نتیجے میں اس کی رقم قرض لینے والے کے ذمے ''مضمون'' ہو جائے گی (اور اس کے نتیجے میں وہ رقم محفوظ ہو جائے گی) یہی وہ مفاد ہے جس کی وجہ سے آج کل لوگ اپنی رقمیں بینکوں میں رکھواتے ہیں، اگر یہ مفاد نہ ہوتا تو لوگ اپنی رقم حفاظت کے لئے بینکوں میں نہ رکھواتے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ رقم رکھوانے والوں کا مقصد قرض دینا ہی ہے، مگر چونکہ عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اس غرض کے لئے بینک میں اس طرح قرض رکھوانے کے عمل کو فقہی اصطلاح میں ''اقراض'' کہا جاتا ہے، اس وجہ سے وہ لوگ اس عمل کو ''اقراض'' (یعنی قرض دینا) نہیں کہتے (جبکہ حقیقت میں یہ ''اقراض'' ہی ہے)۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھوائی جانے والی رقم ''قرض'' نہیں ہے بلکہ فقہی اعتبار سے ''امانت'' کے حکم میں ہے، البتہ رقم رکھوانے والوں نے بینک کو اس کی اجازت دے رکھی ہے کہ وہ یہ رقم دوسری رقموں کے ساتھ ملا کر رکھ دیں، اور اگر بینک اس رقم کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ اور ''امانت'' کو استعمال کر لینے کی اجازت سے یا اس کو اپنے دوسرے اموال میں خلط ملط کرنے کی اجازت سے وہ رقم ''امانت'' کے حکم سے نہیں نکلتی۔ لیکن فقہی اعتبار سے یہ تطبیق درست نہیں، اس لئے کہ رقم کا مالک جب امانت رکھنے والے کو اس کی

---

(۱) بخاری شریف، کتاب الجہاد، باب برکۃ فی مالہ، مع فتح الباری، ج۶، ص ۱۷۵۔

اجازت دیدے کہ وہ اس امانت کی رقم کو اپنی رقم کے ساتھ خلط ملط کر لے تو اس صورت میں یہ عقد ''امانت'' کی تعریف سے نکل کر ''شرکت الملک'' میں تبدیل ہو جائے گا اور وہ مال مخلوط دونوں کے درمیان مشترک ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء کرام نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ (۱)

اور یہ بات فقہ میں مصرح ہے کہ مشترک مال میں ایک شریک کا دوسرے شریک کے مال پر قبضہ ''قبضہ امانت'' ہوتا ہے، اگر وہ بلا تعدی ہلاک ہو جائے تو شریک پر ضمان نہیں آئے گا۔ لیکن جو لوگ بینکوں میں رقم رکھواتے ہیں وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ ہماری رقم پر بینک کا قبضہ ''قبضہ امانت'' ہو بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ یہ رقم بینک کے ذمے ''مضمون'' ہو۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ رقم رکھوانے والے لوگ بھی بینک کے ساتھ ''امانت'' کا معاملہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ ''قرض'' دینے کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ موجودہ عام بینکوں کے تینوں قسم کے اکاؤنٹس میں رکھی جانے والی رقوم ''قرض'' ہوتی ہیں، یہ قرض اکاؤنٹس ہولڈر بینک کو پیش کرتا ہے، لہٰذا اس پر ''قرض'' ہی کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

کیا عام بینکوں میں رقم رکھوانا جائز ہے؟

جب مندرجہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بینکوں میں رکھی جانے والی رقم ''قرض'' ہوتی ہے، اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے ان عام بینکوں میں جو سود کی بنیاد پر کام کرتے ہیں، ان میں اپنی رقم رکھوانا جائز ہے یا نہیں؟

جہاں تک ''فکس ڈیپازٹ'' اور ''سیونگ اکاؤنٹ'' کا تعلق ہے تو چونکہ بینک اکاؤنٹ ہولڈر کو اس کی رقم پر منافع بھی دیتا ہے، اور یہ بات طے ہے کہ ان اکاؤنٹس میں رکھی جانے والی رقوم بالاتفاق ''قرض'' ہوتی ہیں، لہٰذا بینک اکاؤنٹ ہولڈر کو اصلی رقم سے زیادہ جو رقم بھی ادا کرے گا وہ صراحتاً سود ہوگی جس کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' نے اپنے دوسرے اجلاس میں اس پر متفقہ قرارداد بھی منظور کر لی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی مندرجہ بالا اکاؤنٹس میں رقم رکھواتا ہے وہ بینک کے ساتھ سودی ''قرض'' کا معاملہ کرتا ہے جو کہ حرام ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لئے مندرجہ بالا دونوں اکاؤنٹس میں رقم رکھوانا جائز نہیں۔

البتہ موجودہ دور کے بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں اکاؤنٹس میں بھی رقم رکھوانا جائز ہے،

---

(۱) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار لابن عابدین، ج ۶، ص ۶۶۹۔

لیکن بینک اس پر جو منافع دے، اس منافع کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، بلکہ یا تو فقراء پر صدقہ کردے یا نیک کام میں صرف کردے۔

لیکن ہم اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس لئے کہ منافع حاصل کرنے کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانا، چاہے اس منافع کو کسی نیک کام میں صرف کرنے کی نیت ہو، تب بھی سودی معاملے کا ارتکاب کرنا ہے اور سودی معاملے کا ارتکاب کرنا نصاً حرام ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ سود کو کسی نیک کام میں صرف کرنے کا مشورہ یا حکم اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے جہالت اور شرعی مسائل سے ناواقفیت کی وجہ سے غیر شرعی طریقہ سے معاملہ کرلیا ہو اور اس کے نتیجے میں اس کو سود کی رقم حاصل ہو چکی ہو۔ یا اس شخص کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے جو تجارتی اور مالی معاملات میں اب تک شریعت کے احکام کی پابندی کا اہتمام نہیں کرتا تھا جس کے نتیجے میں اس کے پاس سود کی رقم آ چکی ہو، اور اب وہ اپنے گناہ سے توبہ کرنا چاہتا ہو اور سود کی اس رقم سے خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ تم ثواب کی نیت کے بغیر یہ رقم کسی نیک مصرف میں صرف کردو۔ لیکن اگر ایک شخص جو شریعت کے احکام کا پابند ہے وہ اگر اپنی رقم سودی اکاؤنٹ میں اس نیت سے رکھوائے کہ جو سود حاصل ہوگا اس کو کسی نیک مصرف میں صرف کروں گا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اس نیت سے گناہ کا ارتکاب کرے کہ بعد میں توبہ کرلوں گا، جب کہ ایک مسلمان پر واجب ہے کہ وہ گناہ کا ارتکاب ہی نہ کرے کہ بعد میں اس سے توبہ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

مندرجہ بالا تفصیل تو مسلم ممالک کے موجودہ عام بینکوں کے بارے میں ہے، جہاں تک غیر مسلم ممالک میں ان بینکوں کا تعلق ہے جن کے مالک بھی غیر مسلم ہیں تو ان کے بارے میں موجودہ دور کے علماء کا کہنا ہے کہ ان بینکوں میں رقم رکھوانا اور اس رقم پر وہ بینک جو منافع دے اس کو لینا جائز ہے۔ اس کی بنیاد امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول ہے کہ "یجوز اخذ مال الحربی برضاہ" یعنی کافر حربی کا مال اس کی رضامندی سے لینا جائز ہے، اور یہ کہ مسلمان اور حربی کے درمیان "سود" نہیں ہوتا۔

لیکن جمہور فقہاء نے بعض علماء کے مندرجہ بالا قول کو قبول نہیں کیا، حتیٰ کہ متاخرین حنفیہ نے اس کے مطابق فتویٰ بھی نہیں دیا، اس لئے کہ ربا کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور "ربا" کو نہ چھوڑنے والے کے خلاف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ لہٰذا عام حالات میں یہ مناسب نہیں کہ ایک مسلمان "ربا" کا معاملہ کرے اگرچہ وہ معاملہ کسی حربی کافر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ آج کے موجودہ دور میں عام اسلامی حکومتوں پر

مغربی ممالک ہی کا تسلط اور کنٹرول ہے، اور ان کے کنٹرول کے اہم عوامل میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے مسلم ممالک کی دولت کو یا تو غصب کرلیا ہے یا مسلم ممالک نے ان مغربی ممالک سے جو قرض لیا ہے، اس قرض پر سود کی صورت میں مسلمانوں کا مال حاصل کرلیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے جو بڑی بھاری رقمیں ان ممالک کے بینکوں میں رکھوائی ہیں ان رقموں پر بھی ان کا قبضہ ہے، اور اس رقم کو وہ اپنی ضروریات میں صرف کرتے ہیں، بلکہ اس رقم کو مسلمانوں ہی کے خلاف سیاسی اور جنگی اسکیموں کو پورا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر مسلمان اپنی رقم پر ملنے والے سود کو وہاں چھوڑ دیں تو اس کے ذریعے ان کفار کو تقویت ہوگی۔ ان حالات کی وجہ سے میرا رجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے بینکوں سے اپنی رقم پر ملنے والے سود کو وصول کر لینا جائز ہے، لیکن اس رقم کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ بلانیتِ ثواب کسی نیک مصرف میں خرچ کر دینا چاہئے۔ اس طرح جو مسلمان اپنی رقمیں ان کے بینکوں میں رکھوا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے کام میں ان کافروں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس تعاون میں کمی ہو جائے گی۔ بہر حال، یہ مسئلہ علماء کی خدمت میں پیش ہے کہ وہ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ فرمائیں۔

سودی بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانا

جہاں تک سودی بینک کے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے کا تعلق ہے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کر دیا کہ اس ''اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے والے کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا ہے، لہٰذا اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے سے سودی قرض کے معاہدے میں داخل ہونا لازم نہیں آتا، اس حیثیت سے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانا جائز ہونا چاہئے۔ لیکن بعض علماء معاصرین نے اس پر اشکال کیا ہے کہ اگرچہ یہ سودی قرض تو نہیں ہے لیکن اس صورت میں سودی معاملات میں بینک کے ساتھ اعانت تو پائی جا رہی ہے، اس لئے کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقم کو بینک منجمد کر کے نہیں رکھ دیتا، بلکہ بینک اس رقم کو بھی سودی قرضوں میں دے کر اس پر منافع حاصل کرتا ہے، لہٰذا رقم رکھوانے والا بینک کے ساتھ سودی معاملات میں معاون بن جائے گا۔

لیکن اس اشکال کو مندرجہ ذیل طریقوں سے دور کرنا ممکن ہے:

۱۔ بینکوں کا یہ معمول ہے کہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی گئی تمام رقموں کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے، بلکہ اس رقم کی ایک بڑی مقدار اپنے پاس اس غرض سے رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ رقم نکلوانے

والوں کی طلب کو روزانہ پورا کیا جا سکے، اور چونکہ بینک کے اندر تمام رقومات ایک ہی جگہ پر ملی جلی رکھی جاتی ہیں، اس لئے کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر کے لئے یہ یقین کرنا ممکن نہیں ہے کہ اس کی رقم کسی سودی معاملہ میں لگ چکی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ بینک کے پاس رقم لگانے کی بے شمار جگہیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب جگہیں شرعاً ممنوع نہیں ہوتیں بلکہ ان میں بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں خرچ کرنا اور رقم لگانا حرام نہیں ہوتا۔لہٰذا کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر کے لئے یقینی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اس کی رقم اس جگہ پر صرف ہوئی ہے جو شرعاً حلال نہیں ہے۔

۳۔ غیر سودی قرض کا معاملہ شرعاً جائز معاملہ ہے، اور ''نقود'' کا حکم یہ ہے کہ وہ ''عقود صحیحہ'' میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے۔

اور کرنٹ اکاؤنٹ میں جو شخص بھی کوئی رقم رکھواتا ہے تو بینک کو قرض دینے کے نتیجے میں وہ رقم اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے۔اب بینک اس رقم میں جو کچھ تصرف کرے گا وہ اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت میں تصرف کرنا نہیں ہوگا بلکہ اس کی اپنی ملکیت میں یہ تصرف ہوگا،لہٰذا اس تصرف کو اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ کسی معصیت پر اعانت کرنا اگرچہ حرام ہے، لیکن فقہاء کرام نے اس کے کچھ اصول بھی بیان فرمائے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ (۱)

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے، اور ''اعانت'' کے مسئلے میں جتنی نصوص فقہیہ آئی ہیں ان سب کو اس رسالے میں جمع فرمایا ہے۔ یہ رسالہ ''احکام القرآن'' عربی کی تیسری جلد کا جزء بن کر شائع ہو چکا ہے،اس رسالے کے آخر میں اس مسئلہ کا خلاصہ اس طرح تحریر فرمایا کہ:

"ان الاعانة على المعصية حرام مطلقا بنص القران اعنى قوله تعالى: ولا تعاونوا على الاثم والعدوان و قوله تعالى: فلن اكون ظهيرا للمجرمين ولكن الاعانة حقيقة هى ما قامت المعصية بعين فعل المعين، ولا يتحقق الا بنية الاعانة او التصريح بها او تعينها فى استعمال هذا الشئ

---

(۱) اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو ملاحظہ فرمائیں: درمختار مع ردالمحتار، جلد ۵، صفحہ ۲۷۲۔ تکملہ فتح القدیر، جلد ۸، صفحہ ۱۲۷۔ شرح المہذب، جلد ۹، صفحہ ۳۹۱۔ نہایۃ المحتاج، جلد ۳، صفحہ ۴۵۴۔ حواشی الشروانی علی تحفۃ المحتاج، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷۔ الفروق للقرافی، جلد ۲، صفحہ ۳۳۳۔ نیل الاوطار للشوکانی، جلد ۵، صفحہ ۱۵۴۔

بحيث لا يحتمل غير المعصية وما لم تقم المعصية بعينه لم يكن من الاعانة حقيقة بل من التسبب ومن اطلق عليه لفظ الاعانة فقد تجوز لكونه صورة اعانة كما مرمن السير الكبير.

ثم السبب ان كان سببا محركا وداعيا الى المعصية فالتسبب فيه حرام كالاعانة على المعصية بنص القران كقوله تعالى: لا تسبوا الذين يدعون مين دون الله وقوله تعالى فلا تخضعن بالقول وقوله تعالى: لا تبرجن الأية وان لم يكن محركا وداعيا بل موصلا محضا وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج فى اقامة المعصية به الى احداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من اهل الفتنة وبيع العصير ممن يتخذ خمرا وبيع الامرد ممن يعصى به واجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر او يتخذها كنيسة او بيت نار وامثالها فكله مكروه تحريما بشرط ان يعلم به البائع والاجر من دون تصريح به باللسان فانه ان لم يعلم كان معذورا وان علم وصرح كان داخلا فى الاعانة المحرمة.

وان كان سببا بعيدا بحيث لا يفضى الى المعصية على حالته الموجودة بل يحتاج الى احداث صنعة فيه كبيع الحديد من اهل الفتنة وامثالها فتكره تنزيها.»(۱)

''اعانت علی المعصیت نصِ قرآن کی رو سے مطلقاً حرام ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' ''یعنی گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو''،(۲) دوسری جگہ ارشاد ہے ''فلن اکون ظهیرا للمجرمین'' ''یعنی میں کبھی مجرموں کی مدد نہیں کروں گا''،(۳) لیکن حقیقت میں ''اعانت'' اس کو کہا جاتا ہے کہ مُعین یعنی مددگار کے عین فعل سے وہ معصیت قائم ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یا تو مددگار اعانت کرنے کی نیت بھی کرے یا اعانت کرنے کی تصریح کرے یا اس چیز کے استعمال کو اسی معصیت کے کام کے

(۱) احکام القرآن، ج ۳، ص ۴۷۔
(۲) سورۃ المائدہ: ۲۔
(۳) سورۃ القصص: ۱۷۔

لئے اس طرح متعین کر دے کہ غیر معصیت میں اس کے استعمال کا احتمال باقی نہ رہے۔لیکن اگر معصیت معین یعنی مددگار کے عین فعل کے ساتھ قائم نہ ہوتو اس کو حقیقۃً اعانت نہیں کہیں گے بلکہ اس کو معصیت کا ''سبب'' کہیں گے، اور جن حضرات نے اس پر''اعانت'' کے لفظ کا اطلاق کیا ہے انہوں نے مجازاً کیا ہے،اس لئے کہ یہ صورۃً اعانت ہے حقیقۃً اعانت نہیں جیسا کہ''السیر الکبیر'' کے حوالے سے پیچھے گزر چکا۔

پھر''سبب'' کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ''سبب'' معصیت کی طرف محرک اور داعی ہو تو اس کا سبب بننا بھی حرام ہے جیسا کہ اعانت علی المعصیت جو کہ نص قرآن سے حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لا تسبو الذين يدعون مين دون الله" (سورۃ الانعام: ۱۰۸) ''یعنی ان کو گالی مت دو جن کی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ پھر وہ لوگ ناواقفی سے حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے''۔دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "فلا تخضعن بالقول"[۱] ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا: "ولا تبرجن"[۲] اور اگر وہ ''سبب'' معصیت کے لئے محرک اور داعی تو نہ ہو بلکہ معصیت تک صرف پہنچانے والا ہو،اس کے ساتھ ساتھ وہ اس معصیت کے لئے اس لحاظ سے قریب بھی ہو کہ اس کے ذریعہ''معصیت'' انجام دینے کے لئے فاعل کو کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے، مثلاً فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا یا مثلاً شراب بنانے والے کو انگور کا شیرہ فروخت کرنا یا مثلاً امرد غلام ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو اس کو بدفعلی کے ارادے سے خرید رہا ہو یا مثلاً اس شخص کو مکان کرائے پر دینا جس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ اس مکان میں شراب کی تجارت کرے گا یا اس مکان کو وہ''کنیسہ'' (یہودیوں کی عبادت گاہ) بنائے گا یا اس مکان کو وہ مجوسیوں کی عبادت گاہ بنائے گا،ان تمام صورتوں میں فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی ہے بشرطیکہ بائع کو اور کرائے پر دینے والے کو زبانی تصریح کے بغیر ان باتوں کا علم ہو جائے،لیکن اگر بائع اور کرائے پر دینے والے کو ان باتوں کا علم نہ ہو تو اس صورت میں وہ معذور سمجھا جائے گا،اور اگر بائع اور آجر کو صراحتاً ان باتوں کا علم تھا اس کے باوجود اس نے بیع

(۱) الاحزاب:۳۲۔ (۲) الاحزاب:۳۳۔

کر دی یا کرایہ پر دے دیا تو اس صورت میں بائع اور آجر حرام کام پر اعانت کرنے والے ہو جائیں گے۔

اور اگر وہ سبب قریب نہیں ہے بلکہ سبب بعید ہے کہ موجودہ صورت میں اس سے معصیت صادر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ذریعہ معصیت کو انجام دینے کے لئے اس میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی مثلاً فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ لوہا فروخت کرنا وغیرہ تو یہ صورت مکروہ تنزیہی ہے۔ (۱)

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے ایک اُردو کے مقالے میں اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر کے بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

''اگر ''تسبب'' کے مفہوم کو مطلقاً سببیّت کے لئے عام رکھا جائے تو شاید دنیا کا کوئی مباح کام بھی مباح اور جائز نہیں رہے گا مثلاً زمین سے غلہ اور پھل اُگانے والا اس کا بھی سبب بنتا ہے کہ اس غلہ اور ثمرات سے اعداء اللہ (اللہ کے دشمنوں) کو نفع پہنچے۔ کپڑا بننا، مکان بنانا، ظروف اور استعمالی چیزیں بنانا، ان سب میں بھی یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک نیک اور فاجر ان کو خریدتا ہے اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے۔ اور سبب اس کا ان چیزوں کا بنانے والا ہوتا ہے۔ اگر اس طرح حرمت کو عام کیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی کام بھی جائز نہ رہے اس لئے ضروری ہے کہ سبب قریب اور بعید کا فرق کیا جائے۔ سبب قریب ممنوع اور سبب بعید مباح ہو۔ مذکورہ مثالیں سب کی سب سبب بعید کی مثالیں ہیں اس لئے وہ جائز رہیں گی۔

پھر سبب قریب کی بھی دو قسمیں ہیں:

ایک سبب جالب و باعث جو گناہ کے لئے محرک ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو صدورِ معصیت کے لئے کوئی اور ظاہری وجہ نہ تھی ایسے سبب کا ارتکاب گویا معصیت ہی کا ارتکاب ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے ''موافقات'' کی جلد اول کے مقدمہ میں ایسے ہی اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ "ایقاع السبب ایقاع للمسبب" (یعنی سبب کا ارتکاب مسبّب ہی کا ارتکاب ہے) چونکہ ایسے اسبابِ معصیت کا ارتکاب گویا خود معصیت ہی کا ارتکاب ہے اس لئے معصیت کی نسبت اس شخص کی طرف ہی کی

(۱) جواہر الفقہ، ج ۲، ص ۴۵۳ - احکام القرآن، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ج ۳، ص ۴۷۔

جائے گی جس نے اس کے سبب کا ارتکاب کیا، کسی فاعل مختار کے درمیان میں حائل ہونے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینے والے کے حق میں اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا کہا گیا ہے کیونکہ ایسا تسبّب للمعصیۃ بنص قرآن وحدیث خود ایک معصیت ہے۔

سبب قریب کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ سبب قریب تو ہے مگر معصیت کے لئے محرک نہیں ہے بلکہ صدورِ معصیت کسی دوسرے فاعل مختار کے اپنے فعل سے ہوتا ہے، جیسے بیع العصیر ممن یتخذ خمرا، یا اجارۃ الدار لمن یتعبد فیھا للاصنام وغیرہ، تو یہ بیع اور اجارہ اگرچہ ایک حیثیت سے معصیت کا سبب قریب مگر بذاتِ خود جالب اور محرک للمعصیۃ نہیں ہیں۔

ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد مشتری اور مستأجر کی اعانت علی المعصیۃ ہو تو یہ خود ارتکابِ معصیت اور اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہے۔ اور اگر بیچنے والے اور کرایہ پر دینے والے کا یہ مقصد نہ ہو تو پھر دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ بیچنے والے کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ شخص شیرۂ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب بنائے گا، اس صورت میں تو یہ بیع بلا کراہت جائز ہے، اور اگر بائع کو معلوم ہو کہ یہ شخص شیرۂ انگور سے شراب بنائے گا تو اس صورت میں بیچنا مکروہ ہے۔

پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں: ایک یہ کہ وہ مبیع کسی تغیر اور تبدیلی کے بغیر بعینہٖ معصیت میں استعمال ہوتی ہو تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہ تحریمی ہے، دوسری یہ کہ وہ مبیع کچھ تصرف اور تبدیلی کے بعد معصیت میں استعمال ہو سکے گی تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہ تنزیہی ہے۔"(۱)

لہٰذا جب مندرجہ بالا بنیاد پر بینک میں رکھی گئی رقوم میں غور کیا تو اس سے یہ بات سامنے آئی کہ کسی شخص کا ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانا سودی معاملات کا ایسا محرک اور سبب نہیں ہے کہ اگر یہ شخص بینک میں رقم نہیں رکھوائے گا تو بینک سودی لین دین کے گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا، لہٰذا ایسا شخص سبب قریب کی قسم ثانی میں داخل ہے۔ اور عام طور پر بینک میں رقم رکھوانے والے کا یہ مقصد نہیں ہوتا

(۱) جواہر الفقہ، ج۲، ص۴۶۰۔۴۶۲۔

کہ وہ سودی لین دین میں بینک کی مدد کرے بلکہ عام طور پر اپنی رقم کی حفاظت مقصود ہوتی ہے، اور پھر رقم رکھوانے والے کو یقینی طور پر یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کی رقم سودی لین دین میں لگائی جائے گی بلکہ اس کا بھی احتمال ہوتا ہے کہ اس کی رقم بینک میں محفوظ رکھی جائے اور اس کا بھی احتمال ہوتا ہے کہ اس کی رقم کسی جائز اور مشروع لین دین میں لگائی جائے، لیکن اگر بالفرض بینک نے اس کی رقم سودی کاروبار میں بھی لگا دی ہو تب بھی کرنسی کا اصول یہ ہے کہ وہ جائز عقود معاوضہ میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتی، لہٰذا سودی معاملات کو ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی گئی رقم کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا بلکہ ان معاملات کو اس رقم کی طرف منسوب کیا جائے گا جو اب بینک کی اپنی ملکیت ہو گئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانا مکروہ تنزیہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج بہت سے جائز معاملات بھی بینکوں کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں اور ان معاملات کی تکمیل کے لئے انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے۔ چونکہ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کی یہ ضرورت بالکل ظاہر ہے، اس ضرورت کے پیش نظر بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کی کراہت تنزیہی بھی انشاء اللہ ختم ہو جائے گی۔

اسلامی بینکوں میں رکھی گئی رقوم کی حیثیت

جہاں تک اسلامی بینکوں میں رقم رکھوانے کا تعلق ہے تو اگر اس کے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوائی ہے تو اس کا بعینہٖ وہی حکم ہے جو ہم نے عام بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کا حکم اوپر پیش کیا ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ رقم بینک کے ذمہ مالکان کا قرض ہوتی ہے، اور بینک اس رقم کا ضامن ہوتا ہے، اور اس پر قرض ہی کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔

لیکن اسلامی بینکوں کے ''فکس ڈیپازٹ'' اور ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے اس کا حکم عام بینکوں کے ''فکس ڈیپازٹ'' اور ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں رکھی جانے والی رقم سے مختلف ہے۔ اگرچہ عام بینکوں کے ان اکاؤنٹس میں رکھوائی جانے والی رقوم قرض ہوتی ہیں جو سودی منافع کی بنیاد پر بینک میں رکھوائی جاتی ہیں، لیکن اسلامی بینک سودی منافع کی بنیاد پر کام نہیں کرتے، بلکہ اسلامی بینک ان رقوم کو ان کے مالکان سے شرکت کی بنیاد پر لیتے ہیں کہ اگر منافع ہوگا تو وہ بینک کے ساتھ منافع میں شریک ہوں گے، لہٰذا یہ رقم اسلامی بینکوں میں قرض نہیں ہوتی بلکہ عقد مضاربت کا راس المال ہوتی ہے۔ اور رقم رکھوانے والا شخص بینک کے منافع میں ایک متناسب حصہ کا مستحق ہوتا ہے، اور اگر نقصان ہو جائے تو اس وقت نقصان میں بھی شریک ہوتا ہے، اور وہ رقم بینک پر مضمون نہیں ہوتی

لہٰذا بینک نہ تو اصل رأس المال کا ضامن ہوتا ہے اور نہ ہی منافع کا ضامن ہوتا ہے، البتہ اگر بینک کی طرف سے تعدی اور زیادتی پائی جائے تو اس صورت میں بینک تعدی اور زیادتی کے بقدر ضامن ہوگا

میرے خیال میں بینک میں بطور امانت رکھوانے والوں (ڈیپازیٹرز) اور بینک کے کاروبار میں حصہ دار بننے والوں (یعنی ڈائریکٹران اور اسپانسرز اور شیئر ہولڈرز) کی حیثیتوں میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ ''بینک'' اور ''ڈیپازیٹرز'' کے درمیان ''عقد مضاربت'' ہوتا ہے، جبکہ حصہ داروں کے درمیان آپس میں ''عقد شرکت'' ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حصہ داروں کو بینک کی عام میٹنگ میں اپنی آواز اٹھانے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے گویا کہ حصہ داروں نے اپنا مال اور اپنا عمل دونوں بینک کو پیش کر دیا ہے، چنانچہ شرکاء کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن ڈیپازیٹرز کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ بینک کی عام میٹنگ میں اپنی آواز اٹھائیں اور نہ ہی بینک کے کاموں کی منصوبہ بندی اور اس کو آسان بنانے میں ان کو کسی قسم کے تصرف کا اختیار ہوتا ہے، بلکہ یہ لوگ صرف اپنی رقم بینک کو پیش کر دیتے ہیں، چنانچہ یہی کیفیت عقد مضاربت میں رب المال کی ہوتی ہے۔

پھر یہ تمام بینک کے شرکاء یعنی شیئر ہولڈرز بحیثیت مجموعی ڈیپازیٹرز کے لئے ان کی امانتوں کے سرمایہ کے تناسب سے ان کے ''مضارب'' ہوتے ہیں، لہٰذا حصہ داروں کا آپس میں تعلق بمنزلہ ''شرکاء'' کے ہے اور ''ڈیپازیٹرز'' کے ساتھ ان کا تعلق بمنزلہ ''مضاربت'' کے ہے، اور اسلامی فقہ میں اس طرح کے دو قسم کے تعلقات کوئی غیر مانوس نہیں ہیں۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر مضارب مال مضاربت کے ساتھ اپنا مال مخلوط کر دے تو یہ جائز ہے اور اس صورت میں یہ نصف مال میں مضارب اور نصف مال میں مالک متصور ہوگا۔[1]

بینک میں رکھی گئی امانتوں کا ضامن

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ مروجہ بینکوں میں جو رقوم رکھوائی جاتی ہیں وہ بینک کے ذمہ قرض ہوتی ہیں۔ چاہے وہ رقم ''فکس ڈیپازٹ'' میں رکھی ہو یا ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں ہو یا ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں ہو۔ اور یہ تمام رقمیں بینک کے ذمے پر ہوتی ہیں اور ڈیپازیٹر کو وہ رقم واپس کرنا بینک کے ذمہ لازم ہوتا ہے، چاہے بینک کو اپنے کاروبار میں نفع ہو یا نقصان ہو۔ اس لئے کہ قرض ہر حال میں مستقرض پر مضمون ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں بھی رکھی گئی رقم قرض ہوتی ہے اور بینک کے ذمے مضمون ہوتی ہے۔

---

(۱) مبسوط للسرخسی، ۲۲: ۱۳۳۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قرضوں کا ضمان ''شرکاء بینک'' اور ڈیپازیٹرز دونوں پر ہوگا یا صرف ''شرکاء'' پر ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضمان صرف شرکاء پر ہوگا ڈیپازیٹرز پر نہیں ہوگا، اس لئے کہ قرض لینے والا ''بینک'' ہے اور ''شرکاء'' بینک کے مالک ہیں، جب کہ تمام ڈیپازیٹرز یعنی ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے والے بینک کو قرض دینے والے ہیں اور ایک قرض دینے والا دوسرے قرض دینے والے کے لئے قرض کا ضامن نہیں ہوتا۔اسی طرح مروجہ بینکوں کے ''فکس ڈیپازٹ'' اور ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے والے بینک کو قرض دینے والے ہوتے ہیں اور بینک ان سے قرض لینے والا ہوتا ہے۔

جو لوگ اسلامی بینکوں کے ''سرمایہ کاری اکاؤنٹ'' میں رقم رکھواتے ہیں، ان کے بارے میں ہم نے پیچھے عرض کیا تھا کہ یہ لوگ ''عقد مضاربت'' کے ''رب المال'' یعنی سرمایہ کار ہوتے ہیں، جب کہ ''بینک کے حصہ دار'' اپنے حصہ کی رقم کی نسبت سے شرکاء اور ''امانت رکھوانے والوں'' کے حصے میں ''مضارب'' ہیں۔

لہٰذا بینک کا سرمایہ ''حصہ داروں'' اور ''ڈیپازیٹرز'' کے درمیان مشترک اور مخلوط ہوگا اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے سرمایہ کے بقدر نفع ونقصان میں بھی شریک ہوگا۔البتہ چونکہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھوائی جانے والی رقم بینک کے ذمے قرض ہوتی ہے اور بینک اس رقم کو اپنے تمام معاملات میں استعمال کرتا ہے اور اس کا نفع بھی حصہ داراں اور امانت داراں کو پہنچتا ہے، لہٰذا جن قرضوں سے حصہ دار اور امانت دار دونوں نفع اٹھاتے ہیں تو اس قرض کے ضامن بھی دونوں ہی ہوں گے۔علامہ کاسائیؒ فرماتے ہیں:

"ولو استقرض (ای الشریك) ما لا لزمهما جمیعا، لانه تملك مال بالعقد فكان كالصرف، فیثبت فی حقه وحق شریكه."

یعنی اگر دو شریکوں میں سے ایک نے کسی سے قرض لیا تو وہ قرضہ دونوں شریکوں پر لازم ہو جائے گا، اس لئے کہ یہ عمل عقد کے ذریعے مال کا مالک بنتا ہے تو یہ بمنزلہ ''بیع صرف'' کے ہوگیا۔لہٰذا یہ مال قرض لینے والے اور اس کے شریک دونوں کے ذمے لازم ہو جائے گا۔

اور یہ اس مشہور اصول کی بنیاد پر ہے کہ الخراج بالضمان یعنی رسک کے بقدر نفع ہے اور الغنم بالغرم یعنی نقصان نفع کے اعتبار سے ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ بینک ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کے اعتبار سے قرض لینے والا ہے، اور بینک اپنے حصہ داروں اور ڈیپازیٹرز یعنی ''فکس ڈیپازٹ'' اور ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں رقم رکھوانے والوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے، اس لئے یہ دونوں فریق بینک کے ساتھ اس کی تمام کاروائیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور جن کاروائیوں میں یہ دونوں شریک ہوتے ہیں، ان کی تکمیل کے لئے ''کرنٹ اکاؤنٹس'' کی رقموں کو بطور قرض لیا جاتا ہے، اس لئے ان قرضوں کے ضامن بھی یہ دونوں ہوں گے۔ لہٰذا ''کرنٹ اکاؤنٹس'' میں رقم رکھوانے والے جب رقم کی واپسی کا مطالبہ کریں تو پہلے ان کے مطالبات کو پورا کیا جائے گا، اس کے بعد حصہ داروں اور ''سرمایہ کاری کے اکاؤنٹس'' میں رقم رکھوانے والوں کے درمیان نفع تقسیم کیا جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی وقت بینک کو ختم کرنا پڑے تو سب سے پہلے ''کرنٹ اکاؤنٹس'' میں رقم رکھوانے والوں کو ان کی رقمیں واپس کر کے ان کے قرض کو ادا کیا جائے گا، اس لئے کہ ان کی رقمیں بینک میں بطور قرض رکھی گئی تھیں اور بینک کے حصہ دار اور ''سرمایہ کاری اکاؤنٹس'' میں رقم رکھوانے والے اپنے اصل سرمایہ اور نفع کے اس وقت مستحق ہوں گے جب ''کرنٹ اکاؤنٹس'' والوں کا قرضہ مکمل ادا کر دیا جائے گا کیونکہ یہ دونوں اس رقم کے قرض لینے والے ہیں۔

البتہ اس پر ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ''سرمایہ کاری اکاؤنٹ'' میں ابھی داخل ہوا ہے حالانکہ اس سے پہلے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں بہت سے لوگ اپنی اپنی رقمیں بطور قرض رکھوا چکے ہیں، تو یہ شخص ان قرضوں کا کیسے ضامن ہوگا جو قرضے بینک نے اس وقت لیے تھے جب یہ شخص بینک کے ساتھ اس کے معاملات میں شریک بھی نہیں ہوا تھا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جو شخص کسی جاری تجارت میں بحیثیت شریک داخل ہوتا ہے تو وہ اس تجارت کے تمام دیون اور تمام منافع میں شریک ہوتا ہے، چاہے وہ دیون اس شخص کے تجارت میں داخل ہونے سے پہلے ہی کے ہوں۔ لہٰذا ''سرمایہ کاری اکاؤنٹس'' میں رقم رکھوانے والے بحیثیت ''شرکاء'' بینک کے کاروبار میں داخل ہوں گے تو بینک کے ساتھ تمام قرضوں کے ضمان کو بھی برداشت کریں گے۔

کرنٹ اکاؤنٹ سے ''رہن'' یا ''ضمان'' کا کام لینا

اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے ''کرنٹ اکاؤنٹ سے رہن کا کام لینے کا مسئلہ'' بھی اُٹھایا گیا یعنی ''کرنٹ اکاؤنٹ'' والے شخص کے لئے کیا جائز ہے کہ اس کی جو رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہے

اس کو اپنے کسی ایسے دین کے عوض رہن رکھوا دے جو دین کسی بھی سبب سے اس کے ذمے واجب ہو چکا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک صرف وہی چیز رہن بن سکتی ہے جو مال متقوم ہو اور اس کی بیع جائز ہو۔[1] لہٰذا دین کے اندر ''رہن'' بننے کی صلاحیت نہیں کیونکہ تیسرے آدمی کو دین فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی گئی رقم بینک کے ذریعے دین ہوتی ہے۔ لہٰذا جمہور فقہاء کے قول کے مطابق اس رقم کو رہن بنانا درست نہیں۔ البتہ فقہاء مالکیہ کے نزدیک مدیون اور غیر مدیون دونوں کے پاس دین کو رہن رکھنا جائز ہے، البتہ مدیون کے پاس دین کو رہن رکھوانے کی شرط یہ ہے کہ جو دین رہن ہے اس کے واپس لینے کی مدت اس دین کی مدت کے برابر یا اس سے زیادہ ہو جس دین کا یہ رہن بنا ہے۔ چنانچہ علامہ عدویؒ فرماتے ہیں:

"ویشترط فی صحة رهنه من الدین ان یکون اجل الرهن مثل اجل الدین الذی رهن او ابعد لا اقرب لان بقاء ہ بعد محله کالسلف فصار فی البیع بیعا وسلفا الا ان یجعل بید امین الی محل اجل الدین الذی رهن به"

''یعنی دین کو مدیون کے پاس رہن رکھوانے کی شرط یہ ہے کہ رہن والے دین کی ''مدت'' اس دین کی مدت کے مثل یا زیادہ ہو جس کی طرف سے وہ دین رہن رکھوایا ہے، اس سے پہلے نہ ہو، اس لئے مدت رہن پوری ہو جانے کے بعد دین کا مرتہن کے پاس رہنا ''قرض'' کی طرح ہے، اور عقد بیع کے اندر ''قرض اور بیع'' دو عقود داخل ہونا لازم آ جائے گا۔ البتہ اگر یہ طے ہو جائے کہ ''مدت رہن'' پوری ہونے کے بعد وہ دین مدت دین تک کسی تیسرے امانت دار شخص کے پاس رکھا جائے گا تو یہ معاملہ درست ہو جائے گا۔''(۲)

بہر حال، اس عبارت کی روشنی میں ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کو بطور ''رہن'' استعمال کرنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

ا۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اسی بینک کا دین اس شخص کے ذمے ہو جس کا ''کرنٹ اکاؤنٹ'' اس بینک میں موجود ہے، اور وہ شخص دین کی توثیق کے لئے اپنا کرنٹ اکاؤنٹ بینک کے پاس بطور رہن رکھوا دے۔ یہ صورت مالکیہ کے نزدیک جائز ہے بشرطیکہ ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کی مدت کو دین کی ادائیگی

(۱) المغنی لابن قدامة مع الشرح الکبیر، ج ۴، ص ۳۷۵۔
(۲) حاشیة العدوی بهامش الخرشی علی مختصر خلیل، ج ۵، ص ۲۳۶۔

کی مدت تک اس طرح مؤخر کر دیا جائے کہ کرنٹ اکاؤنٹ کے مالک کو دین کی مدت سے پہلے اپنے اکاؤنٹ سے بینک کے دین کی مقدار سے زیادہ رقم نکلوانے کا اختیار نہیں ہوگا۔ البتہ جمہور فقہاء کے قول کے مطابق کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم کو رہن رکھوانا درست نہیں، اس لئے کہ وہ رقم بینک کے ذمے دین ہے، اور دین ایسا ''عین'' نہیں جس کی بیع درست ہو۔ (اور رہن کا عین ہونا ضروری ہے)

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دائن بینک کے علاوہ کوئی تیسرا شخص ہو، اور پھر مدیون اپنے کرنٹ اکاؤنٹ کو اس دائن شخص کے پاس اس طرح رکھوائے کہ وہ جب چاہے اس اکاؤنٹ سے رقم نکلوا لے۔ یہ صورت بھی مالکیہ کے نزدیک جائز ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ البتہ جمہور فقہاء کے نزدیک چونکہ دین کا رہن جائز نہیں، اس لئے یہ صورت بھی ان کے نزدیک درست نہیں۔ البتہ اس صورت کو ''حوالہ'' کی بنیاد پر درست کرنا ممکن ہے۔ وہ اس طرح کہ کرنٹ اکاؤنٹ والا شخص اپنے قرض خواہ کو بینک کی طرف اس طرح حوالہ کر دے کہ وہ قرض خواہ جب چاہے اپنا دین بینک سے وصول کر لے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دائن بینک کے علاوہ کوئی اور ہو، اور وہ دائن مدیون سے یہ مطالبہ کرے کہ دین کی ادائیگی کی مدت آنے تک وہ مدیون بینک کے اندر موجود اپنے کرنٹ اکاؤنٹ کو منجمد کر دے (اور اس میں سے کوئی رقم نہ نکالے)۔ اس صورت کو فریق ثالث کے ہاتھ میں رہن رکھوانے کے مسئلے پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس فریق ثالث (بینک) کو فقہ اسلامی میں ''عدل'' کہا جاتا ہے اور اس ''عدل'' کا رہن پر قبضہ، قبضہ امانت ہوگا۔ اور ''عدل'' کے لئے اس رہن میں تصرف کرنا یا اپنے مصالح میں اس کو استعمال کرنا جائز نہیں، جب کہ یہ ظاہر ہے کہ بینک کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی گئی تمام رقموں کو اپنے تصرف میں لاتا ہے، اس لئے جو رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے گی اس کے بارے میں بینک کو ''عادل اور امین'' نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اس صورت کو فریق ثالث یعنی عادل کے ہاتھ میں رہن رکھوانے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا اِلا یہ کہ یہ کہا جائے کہ دائن اور مدیون دونوں نے فریق ثالث (بینک) کو ضامن ہونے کی شرط کے ساتھ شیٔ مرہون میں تصرف کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس کا صریح حکم تو کتبِ فقہ میں مجھے نہیں ملا لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت شرعاً جائز ہے، واللہ سبحانہ اعلم۔

بہر حال، یہ تفصیل تو اس صورت میں ہے جب کہ جس دین کے لئے رہن رکھوایا گیا ہے اس کی ادائیگی کی میعاد معین ہو، لیکن اگر یہ دین حال ہو یعنی میعاد مقرر نہ ہو مثلاً قرض ہو، جو حنفیہ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا یعنی کبھی بھی اس کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، تو اس صورت میں اس اکاؤنٹ کو منجمد کر کے ''حوالہ'' کی بنیاد پر ''رہن'' بنایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پیچھے

دوسری صورت کے بیان میں ذکر کر دیا۔

سرمایہ کاری کی رقموں کو رہن بنانا

جہاں تک ان رقموں (امانتوں) کا تعلق ہے جو عام بینکوں کے اندر سرمایہ کاری کے لئے جمع کرائی جاتی ہیں تو ان کا حکم بعینہ وہی ہے جو اوپر ہم نے ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کا تفصیل سے حکم بیان کیا، اس لئے کہ یہ رقم بھی بینک کے پاس بطور قرض ہوتی ہے جیسا کہ کرنٹ اکاؤنٹ کی رقمیں قرض ہوتی ہیں۔ البتہ جو رقمیں اسلامی بینکوں میں سرمایہ کاری کے لئے جمع کرائی جاتی ہیں وہ بینک کے پاس بطور قرض جمع نہیں ہوتیں بلکہ وہ رقمیں بینک کی مِلک میں داخل ہوکر سرمایہ کار کا ایک حصہ مشاع بن جاتی ہیں، لہٰذا جو فقہاء ''رہن المشاع'' کو جائز نہیں کہتے ان کے نزدیک اس رقم کو رہن بنانا جائز نہیں، چنانچہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک صحیح قول کے مطابق مشاع کا رہن جائز نہیں اگرچہ شریک کے پاس رکھا جائے۔(۱)

البتہ فقہاءِ شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک مشاع کا رہن رکھنا جائز ہے۔(۲)

لہٰذا ان فقہاء کے نزدیک اسلامی بینکوں کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقموں کو رہن بنانا جائز ہے۔

بینک کا کسی شخص کے اکاؤنٹ کو منجمد کرنا

''اسلامی فقہ اکیڈمی'' میں بحث و مباحثہ کے دوران ایک سوال یہ اٹھایا گیا کہ اگر بینک میں کسی کا کرنٹ اکاؤنٹ موجود ہو اور بینک کے ساتھ لین دین کے نتیجے میں اس پر بینک کا قرض چڑھ گیا ہو تو کیا بینک کو یہ اختیار ہے کہ اس کے اکاؤنٹ کی رقم کو روک دے اور اس کے اکاؤنٹ کو منجمد کر دے؟ اور بینک اپنے تمام مالی واجبات جو سرمایہ کاری کی کاروائیوں کے نتیجے میں اس پر واجب ہوئے ہیں وہ اس کے اکاؤنٹ سے وصول کر لے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اکاؤنٹ ہولڈر کی رضامندی سے بینک نے اس کے اکاؤنٹ کو منجمد کیا ہے تو اس صورت میں اس اکاؤنٹ پر ''رہن'' کے وہ تمام احکام جاری ہوں گے جس کی تفصیل ہم نے پہلے عرض کر دی۔ اسی طرح اگر بینک کرنٹ اکاؤنٹ سے اس کی رضامندی سے اپنا قرض وصول کر لے تو اس پر ''مقاصہ'' کے احکام جاری ہوں گے۔ لیکن اگر اکاؤنٹ ہولڈر کی اجازت کے

(۱) ردالمحتار، ج ۵، ص ۳۴۸۔ (۲) المغنی لابن قدامہ، ج ۴، ص ۳۷۵۔

بغیر بینک اپنا قرض اس کے اکاؤنٹ سے وصول کرنا چاہے، مثلاً بینک کا اکاؤنٹ ہولڈر کے ذمے قرض ہے اور ادائیگی کی تاریخ آنے کے باوجود اس نے قرض ادا نہیں کیا، اب بینک یہ چاہتا ہے کہ اس کا جو اکاؤنٹ بینک میں موجود ہے اسی میں سے اپنا قرض وصول کر لے تو کیا بینک کے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس صورت پر وہ مسئلہ صادق آتا ہے جو فقہاء اور محدثین کے نزدیک ''مسئلۃ الظفر'' کے نام سے مشہور ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ''دائن'' ''مدیون'' کا مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کیا دائن کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنا قرضہ اس مال سے وصول کر لے؟ اس کے بارے میں فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ اگر مدیون کسی جائز وجہ کی بنیاد پر دین کی ادائیگی نہ کر رہا ہو، مثلاً یہ کہ دین کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی، یا اس وجہ سے کہ وہ تنگدست ہے تو اس صورت میں دائن کے لئے اس کے مال سے دین وصول کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اگر مدیون ناحق دین کی ادائیگی سے مانع ہے لیکن دائن عدالت سے رجوع کر کے اپنا دین وصول کر سکتا ہے، تو اس صورت میں بھی دائن کے لئے مدیون کے مال سے از خود دین وصول کرنا جائز نہیں۔ اس بارے میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں، البتہ امام شافعیؒ ایک وجہ سے اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر دائن عدالت کے ذریعہ اپنا دین وصول کرنے پر قادر نہ ہو تو اس صورت میں مدیون کا مال لینے یا نہ لینے کے بارے میں فقہاء کے درمیان مندرجہ ذیل اختلاف ہے۔(۱)

۱۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر دائن مدیون کا مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دائن اپنا قرض اس مال میں سے وصول کر لے، چاہے وہ مال اس قرج کی جنس سے ہو یا خلاف جنس ہو۔ امام مالکؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر دائن مدیون کا مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی دائن اس مال سے اپنا قرض وصول نہ کرے بلکہ وہ مال مدیون کو واپس کرے، اور پھر اس سے اپنے دین کا مطالبہ کرے۔ امام مالکؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

۳۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر دائن مدیون کا مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ مال دین کی جنس کا ہے یا خلاف جنس ہے۔ اگر وہ مال دین کی جنس کا ہے تو اس صورت میں دائن کے لئے اس مال سے اپنا دین وصول کرنا جائز ہے۔ مثلاً دائن کے مدیون کے ذمے دراہم تھے اور دائن مدیون کے دراہم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس صورت میں ان

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: المغنی لابن قدامہ، ج ۲۲۹/۱۲، ۲۳۰۔ کتاب الدعاوی والبینات۔

دراہم سے دائن کو اپنا دین وصول کرنا جائز ہے۔ لیکن اگر وہ مال خلاف جنس ہے تو اس صورت میں دائن کو اپنا دین اس مال سے وصول کرنا جائز نہیں۔ مثلاً دین دراہم کی شکل میں تھا اور دائن مدیون کے دینار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اب دائن کو ان دینار سے اپنا دین وصول کرنا جائز نہیں۔

فقہاءِ حنفیہ کا اصل مذہب تو یہی ہے لیکن متاخرین فقہاءِ حنفیہ اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر دائن مدیون کا مال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دائن کو اس مال سے اپنا دین وصول کرنا جائز ہے، چاہے وہ مال دین کی جنس کا ہو یا خلاف جنس ہو۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ ''شرح القدوری للاخصب'' سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "ان عدم جواز الاخذ من خلاف الجنس کان فی زمانھم لمطاوعتھم فی الحقوق والفتوی الیوم علی جواز الاخذ عند القدرة من ای مال کان لاسیما فی دیارنا لمداومتھم الحقوق."

> ''یعنی دائن کے لئے خلاف جنس سے اپنا دین وصول کرنے کا عدم جواز کا حکم فقہاء متقدمین کے زمانے میں تھا جب کہ لوگ حقوق کی ادائیگی میں جلدی کرتے تھے۔ لیکن اب فتویٰ اس پر ہے کہ اگر دائن کو مدیون کے مال پر قدرت حاصل ہو جائے تو وہ اپنا دین وصول کر لے، چاہے وہ دین کی جنس سے ہو یا خلاف جنس ہو، خاص کر ہمارے دیار میں ایسا کرنا جائز ہے، اس لئے کہ آج کل لوگوں میں حقوق کی ادائیگی میں غفلت عام ہو چکی ہے۔''(۱)۔

۴۔　امام مالکؒ سے تینوں ائمہ کے اقوال کے مطابق تین قول منقول ہیں۔ اور ان کا چوتھا اور مشہور قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ذمے اس دائن ظافر کے دین کے علاوہ دوسرے کسی شخص کا دین نہیں ہے تو اس صورت میں اس دائن ظافر کو اپنے دین کے بقدر مال وصول کرنا جائز ہے، اور اگر مدیون کے ذمے کسی اور شخص کا بھی دین ہے تو اس صورت میں دائن ظافر کے لئے اس مال میں سے اپنا دین وصول کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ اگر یہ مدیون مفلس ہو جائے تو تمام دائنین اس کے مال میں برابر کے مستحق ہوں گے۔

جمہور فقہاء جو دائن ظافر کے لئے اپنا دین وصول کرنے کو جائز کہتے ہیں وہ حدیث ہند بنت عتبہ زوجہ ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے استدلال کرتے ہیں۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

---

(۱)　ردالمحتار لابن عابدین، کتاب الحجر، ج۵، ص۱۰۵، وکتاب الحدود، ج۳، ص۲۱۹، ۲۲۰، وکتاب الحظر والاباحۃ، ج۵، ص۳۰۰۔

"انها قالت یا رسول اللّٰہ ان اباسفیان رجل شحیح، لا یعطینی من النفقة ما یکفینی ویکفی بنیی الا ما اخذت من ماله بغیر علمه فهل علی فی ذلك من جناح؟ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: خذی من ماله بالمعروف ما یکفیك ویکفی بنیك."

"یعنی ہند بنت عتبہ زوجہ ابی سفیان رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے شوہر ابوسفیان بخیل آدمی ہیں۔ وہ مجھے اتنا خرچہ نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کافی ہو جائے۔ اگر میں ان کو بتائے بغیر ان کے مال میں سے لے لیا کروں تو اس میں مجھے کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم مناسب طریقے سے اتنا مال حاصل کرلیا کرو جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو جائے۔"(۱)

اس حدیث کی بنیاد پر حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ بینک کے لئے مدیون کے کرنٹ اکاؤنٹ سے اپنا کل دین یا بعض دین وصول کرلینا جائز ہے۔

مندرجہ بالا فقہی اختلاف دور کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ جب بینک کسی کلائنٹ کے ساتھ ایگریمنٹ کرے تو اس ایگریمنٹ میں ایک شق کا اور اضافہ کرے، اور اس شق میں اس بات کی صاف صراحت ہو کہ اگر کلائنٹ وقت مقررہ پر بینک کے واجبات ادا کرنے سے قاصر رہے گا تو بینک اس کلائنٹ کے بینک میں موجود کرنٹ اکاؤنٹ سے اپنا حق وصول کرے گا۔ اور جب کلائنٹ اس ایگریمنٹ کی اس شق پر دستخط کر دے گا تو یہ اس کی رضامندی کی دلیل ہوگی کہ بینک اپنے واجبات کا اس کے کرنٹ اکاؤنٹ یا سرمایہ اکاؤنٹ سے مقاصہ کر لے۔ اب اس صورت میں یہ مسئلہ "مسئلة الظفر" سے نکل جائے گا اور اس پر "مقاصہ بالتراضی" کے احکام جاری ہوں گے۔ یہ "مقاصہ بالتراضی" تمام فقہاء کے نزدیک بلا اختلاف جائز ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، باب قضیة ہند، امام بخاریؒ بھی صحیح بخاری میں اس حدیث کو متعدد مقامات پر لائے ہیں مثلاً: کتاب البیوع، باب ما اجری الامصار علی ما یتعارفون بینهم، حدیث نمبر ۲۲۱۱، کتاب المظالم، باب قصاص المظلوم اذا وجد مال ظالمه، حدیث نمبر ۲۴۶۰، کتاب النفقات، حدیث نمبر ۵۳۵۹، ۵۳۶۴، اور میں نے اس مسئلہ کے بارے میں اپنی کتاب "تکملة فتح الملهم شرح صحیح مسلم" میں فقہاء کے مذاہب اور ان کے دلائل وغیرہ کے ساتھ تفصیل سے بحث کی ہے۔

بینکوں میں رکھی گئی رقموں کی آڈیٹنگ کا طریقہ

آج کل عام بینکوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اپنے ڈیبٹ اور کریڈٹ کی ایک بیلنس شیٹ تیار کرتے ہیں۔''کریڈٹ'' میں ان رقوم کو شامل کیا جاتا ہے جو یا تو بینک کے پاس موجود ہیں یا مستقبل میں بینک کو حاصل ہونے والی ہیں۔مثلاً وہ سرمایہ جو بینک نے اپنے کلائنٹ کو دیا ہوا ہے اور بینک کو یہ اُمید ہے کہ وہ سرمایہ نفع (سود) کے ساتھ بینک کو واپس مل جائے گا۔اور''ڈیبٹ'' میں ان رقوم کو شامل کیا جاتا ہے جن رقوم کا دوسروں کو بینک سے مطالبہ کرنے کا حق ہوتا ہے اور بینک کے ذمے ان مطالبات کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔چنانچہ عام بینکوں کا طریقہ یہ ہے کہ اکاؤنٹس کے اندر رکھی گئی تمام امانتوں کو''ڈیبٹ'' کے خانے میں درج کرتے ہیں،اس لئے کہ''کرنٹ اکاؤنٹ'' اور''سیونگ اکاؤنٹ'' میں رکھی گی رقموں کو تو اکاؤنٹس ہولڈرز کے مطالبے کے وقت واپس کرنا بینک کے ذمے لازم ہوتا ہے،اور فکس ڈیپازٹ میں رکھی گئی امانتوں کو ان کی مدت پوری ہونے پر واپس کرنا ضروری ہوتا ہے۔اور وہ سرمایہ جو بینک اپنے کلائنٹ کو دیتا ہے اس کو''کریڈٹ'' کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے،اس لئے کہ بینک کو''نفع'' کے ساتھ اس رقم کی واپسی کی اُمید ہوتی ہے۔

جہاں تک اسلامی بینکوں کا تعلق ہے تو اس کی بیلنس شیٹ تیار کرنے میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا،البتہ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کی رقم کو عام بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی''ڈیبٹ'' کے خانے میں درج کر سکتے ہیں۔وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ''کرنٹ اکاؤنٹ'' میں رکھی جانے والی رقومات بینک کے ذمے قرض ہوتی ہیں،اور اکاؤنٹ ہولڈر کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اپنی رقم بینک سے نکلوا لے۔لیکن چونکہ اسلامی بینکوں میں''سرمایہ کاری اکاؤنٹ'' میں رکھی جانے والی رقمیں بینک کے ذمے قرض نہیں ہوتیں بلکہ وہ یا تو''مال مضاربت'' ہوتی ہیں یا''مال شرکت'' ہوتی ہیں جو بینک کی دوسری رقموں کے ساتھ مخلوط کر دی جاتی ہیں،اور یہ رقمیں بینک کے ضمان میں نہیں ہوتیں۔اس لئے حقیقت میں ان رقموں کو''ڈیبٹ'' کے خانے میں درج کرنا درست نہیں۔ اسی طرح وہ رقمیں جو بطور سرمایہ کے بینک نے اپنے کلائنٹ کو دی ہوئی ہیں ان تمام رقموں کو''کریڈٹ'' کے خانے میں درج کرنا ممکن نہیں،کیونکہ جو سرمایہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر کسی کو دیا جاتا ہے وہ غیر مضمون ہوتا ہے،اس لئے''کلائنٹ'' کے نفع کا ضامن ہونا تو دور کی بات ہے وہ تو اصل سرمایہ کا بھی ضامن نہیں ہوتا،البتہ اگر بینک نے کوئی بیع''مرابحہ'' کی ہے تو اس کا ثمن یا کوئی چیز اجرت پر دی ہے تو اس کا کرایہ بینک کے''کریڈٹ'' کے خانے میں درج کیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا فرق کی بنیاد پر اسلامی بینک کی بیلنس شیٹ عام بینکوں کی بیلنس شیٹ کی مانند اسی طرح بنانا کہ اس کی ڈیبٹ اور کریڈٹ کی رقموں کے اندراجات بالکل برابر ہو جائیں ممکن نہیں ہے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کی بیلنس شیٹ تجارتی کمپنی کی بیلنس شیٹ کی طرح بنائی جائے، اور یہ چیز اسلامی بینک کے مزاج کے زیادہ مطابق ہے، اس لئے کہ ''اسلامی بینک'' صرف قرض کے لین دین کرنے والا ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک تجارتی ادارہ ہے جو ملکی تجارت کے نفع و نقصان میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

اگر اسلامی بینک بھی اپنی بیلنس شیٹ عام بینکوں کی طرح اس طرح بنائے کہ ''سرمایہ کاری اکاؤنٹ'' کی رقموں کو ''ڈیبٹ'' کے خانے میں درج کر لے اور جو سرمایہ کلائنٹ کو فراہم کیا ہے اس کو ''کریڈٹ'' کے خانے میں درج کر لے تو اس صورت میں یہ ''بیلنس شیٹ'' تقریبی اور تخمینی بنیاد پر تو درست ہوگی، لیکن یقینی بنیاد پر درست نہیں ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

''سرمایہ کاری اکاؤنٹس'' کے اکاؤنٹ ہولڈرز کے درمیان نفع کی تقسیم کا طریقہ

بینک ڈیپازٹس کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ اس رقم پر حاصل ہونے والے نفع کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔

اس مسئلہ میں مشکل اس لئے پیش آتی ہے کہ ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کا اصل میں جو تصور ہے وہ تو یہ ہے کہ یہ ایک سادہ قسم کی تجارت ہے جس میں دو یا چند افراد مل کر آپس میں تجارت کریں گے اور تمام شرکاء اس تجارت میں ابتداء سے شریک رہیں گے یہاں تک کہ تمام مالِ تجارت نقد کی شکل میں حاصل ہو جائے اور پھر تمام شرکاء کے درمیان نفع کی تقسیم ہو جائے۔ اس صورت میں نفع و نقصان کے حساب میں کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہتا۔

لیکن آج کل جو بڑی بڑی شراکتی کمپنیاں ہیں، ان میں سینکڑوں لوگ شریک ہوتے ہیں، روزانہ بے شمار افراد اس شراکتی کمپنی سے نکلتے ہیں اور دوسرے بے شمار افراد داخل ہوتے ہیں۔ اور اس بات نے اس مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ اور دشوار بنا دیا کہ موجودہ بینکوں میں ہر شخص کے اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقم میں روزانہ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے آج بینک میں اکاؤنٹ کھولا اور چند روز کے بعد اس کو اپنے اکاؤنٹ میں سے کچھ رقم نکلوانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ پھر چند روز کے بعد اس نے

اپنے اکاؤنٹ میں کچھ رقم اور جمع کرادی۔ یہ صورتِ حال صرف کرنٹ اکاؤنٹ میں پیش نہیں آتی بلکہ سیونگ اکاؤنٹ میں بھی پیش آتی ہے حتیٰ کہ "فکس ڈیپازٹ" میں بھی یہ صوررت پیش آتی رہتی ہے، اس لئے کہ "فکس ڈیپازٹ" میں اگر چہ مدت مقرر ہوتی ہے اور اکاؤنٹ ہولڈر کو مدت پوری ہونے سے پہلے اپنی رقم اکاؤنٹ سے نکلوانے کا اختیار نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اکثر بینکوں میں یہ معمول ہے کہ وہ فکس ڈیپازٹ ہولڈر کو بھی ضرورت کے وقت اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے کی اجازت دے دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں بینک ان ایام کا نفع کم کر دیتا ہے جتنے ایام مدت پوری ہونے میں باقی رہتے ہیں۔

دوسری طرف "فکس ڈیپازٹ" کے تمام اکاؤنٹس ایک دن اور ایک تاریخ میں نہیں کھولے جاتے بلکہ ہر شخص کے اکاؤنٹ کھولنے کی تاریخ مختلف ہوتی ہے، اسی طرح ہر شخص کے اکاؤنٹ کی مدت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے ہر شخص کی رقم رکھوانے کا پیریڈ دوسرے شخص سے مختلف ہوتا ہے بلکہ ان کے درمیان اتنا تضاد ہوتا ہے کہ ان سب کو کسی ایک پیریڈ کے ساتھ موافق کرنا ممکن نہیں، لہٰذا جب اس معاملہ کو "عقد شرکت" یا "عقد مضاربت" کی طرف تبدیل کیا جاتا ہے تو اس وقت یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی ہر ہر رقم پر کاروبار سے جو نفع یا نقصان حاصل ہوا ہے اس کی تحدید یا تعیین شراکت یا مضاربت کے معروف طریقہ سے کس طرح کی جائے گی؟

بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اسلامی بینک بھی رقمیں وصول کرنے میں وہی طریقہ اختیار کرے جو عام بینکوں نے اختیار کیا ہوا ہے، وہ یہ کہ "سیونگ اکاؤنٹ" اور "فکس ڈیپازٹ" میں رقمیں رکھوانے کے لئے ایک تاریخ اور مدت مقرر کر دے کہ اس اکاؤنٹ میں فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک رقمیں وصول کی جائیں گی، اور اتنی مدت کے لئے رقم رکھی جائے گی تاکہ تمام رقمیں رکھوانے والوں کا پیریڈ ایک ہی تاریخ میں شروع ہو اور ایک ہی تاریخ پر ختم ہو تاکہ بینک کو اس رقم پر حاصل ہونے والے نفع کی تعیین شراکت کے معروف طریقے کی بنیاد پر کرنا ممکن ہو۔

لیکن اس تجویز پر بینک کے لئے عمل کرنا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ بینک کے ذریعے ہونے والے لین دین کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص کا اکاؤنٹ رقم نکلوانے اور رقم رکھوانے کے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہو، لہٰذا اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے اور نکلوانے کے عمل کو اگر کسی خاص دن اور تاریخ کے ساتھ مقید کر دیا جائے گا تو اس صورت میں موجودہ دور کے تیز رفتار کاروبار میں مشکلات پیش آئیں گی اور لوگوں کی بچتوں کی بہت بڑی مقدار تجارت میں نہیں لگ سکے گی، حالانکہ لوگوں کی بچتوں کو صنعتی اور تجارتی کاموں میں لگانا بھی بذاتِ خود ایک صحیح مقصد ہے جو شریعتِ اسلامیہ کے مقاصد کے بھی موافق ہے،

اور ان بچتوں کا بے مصرف پڑا رہنا اجتماعی ضرر کا باعث ہے جس کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔

بعض حضرات نے ایک دوسری تجویز پیش کی ہے وہ یہ کہ بینک میں جو رقمیں رکھوائی جائیں ان کو حصص کی طرح چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں تقسیم کر دیا جائے اور جو شخص بھی بینک میں اپنی رقم رکھوانے کے لئے آئے تو وہ شخص اپنی رقم کے حساب سے وہ یونٹ خرید لے۔ پھر بینک اپنے اثاثوں اور اپنی امانتوں کی بنیاد پر روزانہ ان یونٹوں کی قیمت کا اعلان کرے کہ آج ایک یونٹ کی قیمت یہ ہے۔ پھر جو شخص بینک سے اپنی کچھ رقم نکلوانا چاہے تو اسی حساب سے اپنے یونٹ بینک کو فروخت کر دے اور بینک اپنے ذمے یہ لازم کر لے کہ جب بھی کوئی شخص یونٹ فروخت کرنے کے لئے آئے گا تو بینک اس روز کی اعلان کردہ قیمت پر وہ یونٹ خرید لے گا، اور بینک کے اثاثوں کی قیمت میں اضافے سے یونٹ کی قیمت میں یومیہ جو اضافہ ہوگا وہ اضافہ اس یونٹ پر حاصل ہونے والا نفع سمجھا جائے گا، اور بینک کے اثاثوں کی قیمت کم ہونے کے نتیجے میں یونٹ کی قیمت میں یومیہ جو کمی واقع ہوگی وہ اس یونٹ پر خسارہ تصور کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا تجویز پر بینک کے علاوہ دوسری سرمایہ کار کمپنیوں میں تو عمل کرنا ممکن ہے لیکن بینکوں میں اس تجویز پر عمل کرنا مندرجہ ذیل وجوہ سے بہت مشکل اور دشوار ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ موجودہ بینکوں کی کاروائیاں اس بات کا تقاضہ کرتی ہیں کہ معاملات کو تیزی سے نمٹایا جائے اور یہ تجویز اس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، اور اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے اور نکلوانے کو خاص مقدار کے یونٹ کے ساتھ مقید کرنا بھی ان معاملات میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے جب کہ وہ یونٹ بعض اوقات بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور عام طور پر اکاؤنٹ ہولڈر اپنے ذمے واجبات کی ادائیگی کے لئے بینک کا چیک ہی استعمال کرتا ہے اور بینک کے چیک ہی کے ذریعے رقم نکلواتا ہے۔ اب اگر ان واجبات کو ان یونٹوں پر تقسیم کر دیا جائے کہ اکاؤنٹ ہولڈر ان یونٹوں کی مقدار کے حساب سے اپنے واجبات ادا کرے تو اس صورت میں شدید دشواری پیش آئے گی، اس لئے کہ ہر شخص کے واجبات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، یونٹوں کے حساب سے ان کی ادائیگی ممکن نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس تجویز کا تقاضہ یہ ہے کہ بینک کے تمام اثاثوں کی بازاری نرخ کی بنیاد پر یومیہ قیمت نکالی جائے (تاکہ اس کی بنیاد پر ان یونٹوں کی قیمت روز روز متعین ہوتی رہے) ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک دشوار عمل ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ بینک کے اکثر اثاثے عام طور پر نقود اور دیون کی شکل میں ہوتے ہیں، اور موجودہ دور کے علماء کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ کسی کمپنی کے حصص کی خرید و فروخت اس وقت

تک جائز نہیں جب تک اس کمپنی کے فکسڈ اثاثے نقود اور دیون کے مقابلے میں زیادہ نہ ہوں، لہٰذا ان علماء کے نزدیک اگر بینک کے اکثر اثاثے نقود اور دیون کی شکل میں ہوں تو اس صورت میں بینک یونٹوں کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

حنفیہ کے قول کے مطابق اس مسئلہ کی بنیاد ''مسئلہ مد عجوۃ'' ہے، جس کی رو سے اگر کمپنی کے بعض اثاثے عروض کی شکل میں ہوں تب بھی ''حصص'' کی بیع جائز ہے، چاہے اس کمپنی کے اکثر اثاثے نقود اور دیون ہی کی شکل میں ہوں، بشرطیکہ اس ''حصے'' کی قیمت ان نقود اور دیون سے زائد ہو جو نقود اور دیون اس ''حصے'' کے مقابلے میں ہیں تاکہ زائد قیمت ''عروض'' کے عوض میں ہو جائے۔

بہرحال مندرجہ بالا وجوہ کی وجہ سے اس تجویز کی بنیاد پر نفع کی تحدید کے مسئلے کو حل کرنا مشکل ہے۔

میں نے فقہاء کی کتابوں میں یہ مسئلہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ اگر مشترکہ کاروبار کا کوئی ایک شریک اپنے مال کا کچھ حصہ اس کاربار سے واپس نکالنا چاہے یا رب المال اپنی رقم کا کچھ حصہ کاروبار سے نکالنا چاہے تو اس وقت نفع کا حساب کس طرح کیا جائے گا؟ یہ مسئلہ کسی اور جگہ تو نہیں ملا، البتہ اس مسئلہ کے بارے میں علامہ نوویؒ ''منہاج'' میں کتاب القراض کے آخر میں فرماتے ہیں:

> "ولو استرد المالك بعضه قبل ظهور ربح وخسران رجع راس المال الى الباقي وان استرد بعد الربح فالمسترد شائع ربحا وراس مال۔
>
> مثاله: راس المال مائة والربح عشرون واسترد عشرين فالربح سدس المال فيكون المسترد سدسه من الربح فليستقر للعامل المشروط منه وباقيه من راس الامل، وان استرد بعد الخسران فالخسران موزع على المسترد والباقي بلا يلزم جبر حصة المسترد لو ربح بعد ذلك۔
>
> مثاله: المال مائة والخسران عشرون ثم استرد عشرين فربع العشرين حصة المسترد ويعود راس المال الى خمسة وسبعين." (۱)

''یعنی اگر مالک تجارت میں نفع اور نقصان ظاہر ہونے سے پہلے اپنا کچھ مال اس تجارت سے واپس نکال لے تو بقیہ مال رأس المال بن جائے گا۔ اگر تجارت میں نفع ظاہر ہونے کے بعد واپس نکال لے تو اس صورت میں نکالا جانے والا مال نفع اور رأس المال دونوں کو شامل ہوگا۔

---

(۱) مغنی المحتاج للشربینی الخطیب، ج۲، ص۳۲۰، ۳۲۱۔

مثلاً رأس المال سو روپے تھا اور بیس روپے اس میں نفع کے ہوئے، اور اس کے بعد مالک نے اس میں سے بیس روپے نکال لیے تو اس صورت میں چونکہ نفع کُل مال کا چھٹا حصہ تھا لہٰذا واپس نکالے جانے والے مال کا چھٹا حصہ (یعنی ۳.۳۳ روپے سرمایہ کار کا نفع ہے اور ۱۶.۶۷ روپے اصل سرمایہ واپس ہوا ہے) عامل کے لئے عقد کے اندر جو نفع دینا مشروط تھا وہ ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے گا وہ رأس المال ہو جائے گا۔ اور اگر تجارت میں نقصان ہو جانے کے بعد مالک نے کچھ مال واپس اس تجارت سے نکال لیا تو اس صورت میں نقصان کو نکالے جانے والے مال اور باقی رہ جانے والے مال دونوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ پھر اگر بعد میں اس تجارت کے اندر نفع ہو جائے تو اس نفع سے اس مال کی تلافی نہیں کی جائے گی جو مال مالک نے واپس نکال لیا ہے۔

مثلاً کُل رأس المال سو روپے تھا اور بیس روپے کا نقصان ہو گیا۔ پھر مالک نے اس رأس المال میں سے بیس روپے نکال لیے تو اس صورت میں نقصان کا ربع یعنی پانچ روپے واپس نکالے جانے والے مال کے مقابلے میں ہوں گے اور اب رأس المال پچھتر روپے ہو جائے گا۔"

بہر حال، مندرجہ بالا طریقہ سے اس تجویز کی صرف ایک شکل کا حل نکلتا ہے، وہ یہ کہ رب المال کا مالِ مضاربت میں سے کچھ مال واپس نکال لینا۔ لیکن اگر رب المال اپنا نکالا ہوا کُل مال یا اس کا کچھ حصہ دوبارہ مالِ مضاربت میں داخل کرنا چاہے یا یہ صورت ہو کہ رب المال مندرجہ بالا مسئلہ میں تو صرف ایک تھا اور نفع نقصان بھی بالکل ظاہر تھا، لیکن اگر رب المال ایک کے بجائے ہزاروں ہوں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مال کا کچھ حصہ کبھی نکال لے اور کبھی واپس جمع کرا دے تو اس صورت میں اتنی باریک بینی سے حساب لگانا تقریباً محال ہے۔

ڈیلی پروڈکٹس (یومیہ پیداوار) کا حساب اور نفع کی تعیین میں اس سے کام لینا

ان مشکلات کا حل اس صورت میں موجود ہے جس کو آجکل کی اکاؤنٹنگ کی اصطلاح میں ''ڈیلی پروڈکٹس کا حساب'' (Daily Products) کہا جاتا ہے، اور جس کو عربی میں ''حساب

النمر'' اور''حساب الانتاج الیومی'' کہا جاتا ہے۔ شرکت اور مضاربت میں اس سے کام لینے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر مقررہ پیریڈ کے اختتام پر سرمایہ کاری سے تمام سرمایہ پر جو منافع حاصل ہوا اس کو اجمالی طور پر متعین کیا جائے کہ کتنا منافع حاصل ہوا۔ پھر اس منافع کو سرمایہ کاری کے تمام اموال پر اور سرمایہ کاری کی مدت کے مجموعی ایام پر اس طرح تقسیم کیا جائے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایک روپیہ پر یومیہ کتنا منافع حاصل ہوا؟ پھر ہر شریک کو ہر روپیہ پر اس حساب سے منافع دیا جائے جتنے ایام تک اس کا روپیہ سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں مصروف رہا۔ اگر ایک کا روپیہ کئی روز تک سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں مصروف رہا تو اس پر اس کو زیادہ نفع دیا جائے گا اور اگر کم دنوں تک اس کا روپیہ مصروف رہا تو اس پر اس کو کم نفع حاصل ہوگا۔

مثلاً ''ڈیلی پروڈکٹس حساب'' کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ ہر روپے پر یومیہ ایک پیسہ کا نفع حاصل ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک روپے پر سو دنوں میں سو پیسوں کا نفع حاصل ہوا ہے، چاہے وہ روپیہ مسلسل سو دنوں تک اکاؤنٹ میں موجود رہا ہو یا متفرق ایام میں سو دنوں تک رہا ہو۔ لہٰذا جس شخص کا ایک روپیہ سو دن مسلسل یا متفرق طور پر اس مدت کے دوران اکاؤنٹ میں مشغول رہا تو وہ شخص منافع کے سو پیسوں کا مستحق ہو گیا اور جس شخص کا ایک روپیہ دوسو دن تک مشغول رہا یا جس شخص کے دو روپے سو دن تک اکاؤنٹ میں مشغول رہے تو ان میں سے ہر ایک منافع میں سے دوسو پیسوں کا مستحق ہو گیا۔

بہرحال، اس صورت میں سرمایہ کار اپنے سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں اس مخصوص مدت کے دوران جتنی رقم چاہیں نکلوائیں اور جتنی رقم چاہیں واپس داخل کرائیں، ان کا استحقاق منافع میں اس طرح متعین ہوگا کہ اس مدت کے مجموعی ایام میں سے کتنے ایام تک کتنے روپے سرمایہ کاری میں مصروف رہے۔ (۱)

یہ طریقہ ایک واحد حل ہے جس کے ذریعہ اسلامی بینکوں میں رکھے گئے سرمایہ پر منافع کی تقسیم کا حساب عملی طور پر ظاہر ہو کر سامنے آ جاتا ہے، لیکن اس طریقہ حساب کو اس طرح شریعت کے ہم آہنگ بنانے کی ضرورت ہے کہ اسلامی فقہ کا مزاج اس طریقہ حساب کو قبول کر لے۔ اور فقہ اسلامی میں شرکت اور مضاربت کا جو تصور ہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس طریقہ حساب کو ان کے ساتھ تطبیق دینے میں چند رکاوٹیں ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس طریقہ حساب کی مزید تفصیل اور مثالوں کے لئے دیکھئے: محاسبۃ الشرکات والمصارف فی النظام الاسلامی'' صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۱، طبع قاہرہ، ۱۴۰۴ھ۔

۱۔ پہلی رکاوٹ یہ ہے کہ فقہاء کرام کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ کسی مشترکہ کاروبار کے حقیقی نفع کا معلوم کرنا اس پر موقوف ہے کہ اس شرکت کے تمام اثاثوں کو نقد کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے، حتیٰ کہ نقد میں تبدیل کرنے سے پہلے جو منافع تقسیم کیا جائے گا وہ علی الحساب بطور پیشگی دیا جائے گا، اور مدت کے اختتام پر تمام اثاثوں کو نقد میں تبدیل کرنے کے بعد جو تصفیہ ہوگا یہ منافع اس تصفیہ کے تابع ہوگا۔ لیکن جہاں تک بینکوں کے معاملات کا تعلق ہے تو سال کے اختتام پر بھی کلی طور پر نقد کی شکل میں اثاثوں کی تبدیلی کا تصور بھی نہیں ہے، اس لئے کہ بینکوں میں ہونے والے معاملات مسلسل جاری رہتے ہیں (کسی مرحلے پر اختتام پذیر نہیں ہوتے)۔

میرے نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہے، واللہ اعلم، کہ ہر سال کے آخر میں کمپنی کے تمام اثاثوں کی قیمت لگا کر ایک تخمینی نقد کی بنیاد پر تصفیہ کیا جائے۔ حاصل اس طریقہ کار کا یہ ہے کہ سرمایہ کاری کے عمل کے دوران بینک سال کے آخر تک جتنے اثاثوں کا مالک بن گیا ہے ان تمام اثاثوں کو بینک کے حصہ دار سرمایہ کاری کی رقم سے خرید لیں گے اور اس خریداری کے نتیجے میں جو قیمت حاصل ہوگی اس کو نقد سرمایہ کے ساتھ ملا دیا جائے گا اور پھر اس نقد سرمایہ کی بنیاد پر منافع تقسیم کیا جائے گا، اور اس مرحلے پر رواں سال کے عقود مضاربت اور عقود شرکت اپنی انتہاء کو پہنچ جائیں گے۔ اور پھر نئے سال کے آغاز میں حصہ داروں اور سرمایہ کاروں کے درمیان دوبارہ نئے سرے سے عقود شرکت منعقد ہوں گے، اور اس وقت کمپنی کے اثاثوں کی جو قیمت ہوگی وہ حصہ داروں کی طرف سے اس نئے عقد شرکت کے لئے راس المال تصور کیا جائے گا۔ اور جب حصہ داران اثاثوں کی قیمت سرمایہ کاری کی امانتوں میں شامل کر کے ان اثاثوں کے مالک بن گئے تو اب دوبارہ جدید ''عقد شرکت'' کے وقت اپنے اثاثوں کو دوبارہ سرمایہ کی شکل میں شامل کر کے حصہ دار بن جائیں گے۔ اس صورت میں اگرچہ ''شرکت بالعروض'' کی خرابی لازم آئے گی، لیکن مالکیہ اور بعض حنابلہ کے نزدیک ان عروض کی قیمت کی بنیاد پر یہ شرکت مطلقاً جائز ہے، اور شافعیہ کے نزدیک اگر وہ ''عروض'' ذوات الامثال میں سے ہوں تو ''شرکت'' جائز ہے۔ (۱)

اور حنفیہ کے نزدیک اگر عروض کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا جائے تو بھی شرکت جائز ہے۔ (۲)

اور لوگوں کی آسانی کے لئے مالکیہ کے قول کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۳)

---

(۱) المغنی لابن قدامہ، ج ۵، ص ۱۲۴، ۱۲۵۔ (۲) بدائع الصنائع للکاسانی، ج ۶، ص ۵۹۔

(۳) امداد الفتاویٰ للتھانوی، ج ۳، ص ۴۹۵۔

۲۔ دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ عام عقدِ شرکت اور عقدِ مضاربت کے مزاج کا تقاضہ یہ ہے کہ پورا مالِ شرکت اور مضاربت کا پورا رأس المال ایک ہی دفعہ میں تجارت کے اندر لگا دیا جائے، حتیٰ کہ فقہاء کرام نے یہاں تک بیان فرمایا ہے کہ اگر رب المال اتنے وقفے کے بعد دوسرا مالِ مضاربت مضارب کو دے کہ پہلا مال تجارت کے اندر لگ چکا ہے تو اس صورت میں اس دوسرے مال کے اندر مضاربت نہیں ہوگی۔ چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

”لو دفع اليه الفا قراضا ثم الفا وقال: ضمه الى اول، لم يجز القراض فى الثانى ولا الخلط لان الاول استقر حكمه بالتصرف ربحا وخسرانا وربح كل مال وخسرانه يختص به.“

”یعنی اگر کسی شخص نے دوسرے کو ایک ہزار روپے مضاربت کے طور پر دیئے، اس کے بعد ایک ہزار روپے اور دیئے اور مضارب سے کہا کہ اس ایک ہزار کو پہلے والے ایک ہزار کے ساتھ ملا دو، تو اس صورت میں اس دوسرے ایک ہزار روپے میں نہ تو مضاربت جائز ہوگی اور نہ ہی اس کو پہلے والے ایک ہزار کے ساتھ ملانا جائز ہوگا۔ اس لئے کہ تصرف کرنے کے بعد نفع ونقصان کا حکم پہلے والے ایک ہزار روپے کے ساتھ ثابت ہو چکا، اور اب کُل مال کا نفع اور نقصان اسی پہلے والے ہزار کے ساتھ مخصوص ہوگا۔“(۱)

اور مندرجہ بالا حکم اس صورت میں ہے جب دونوں رأس المال ایک ہی شخص مضارب کو دے رہا ہو۔ اور اگر دو مختلف اشخاص یہ مال دینے والے ہوں تو پھر بطریقِ اولیٰ یہی حکم ہوگا، اس لئے کہ دونوں کے منافع بھی جدا جدا ہوں گے۔

بینکوں کے اندر سرمایہ کاری کے طور پر جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں وہ سب نہ تو ایک وقت میں رکھوائی جاتی ہیں اور نہ ہی ان رقوم کو سرمایہ کاری کی مختلف اسکیموں کے اندر ایک ہی وقت میں لگایا جاتا ہے بلکہ مختلف اوقات میں لگایا جاتا ہے، لہٰذا اس صورت کو عام شرکت اور مضاربت کی بنیاد پر منطبق کرنا ممکن نہیں۔

۳۔ تیسری رکاوٹ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میعاد پوری ہونے سے پہلے اپنی کچھ رقم اکاؤنٹ میں سے نکال لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی رقم اکاؤنٹ سے نکالی ہے، اس حد تک شرکت فسخ ہو جائے۔ اور جو رقم نکالی گئی ہے، اس رقم میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ اب تک کوئی نفع نہ ہوا ہو، اور

(۱) روضۃ الطالبین للنووی، ج ۵، ص ۱۴۸۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس نکالی ہوئی رقم پر منافع اس سے زیادہ ہوا ہو اور منافع ڈیلی پروڈکٹس کے حساب کے ذریعہ سامنے آیا ہے۔ پہلی صورت میں جب کہ اس سے نکالی گئی رقم پر منافع بالکل نہیں ہوا، ڈیلی پروڈکٹس کے حساب سے جو منافع دیا جائے گا، حقیقت میں وہ منافع دوسری رقموں کا ہوگا۔ اور دوسری صورت میں جب کہ اس نکالی گئی رقم پر ڈیلی پروڈکٹس کے حساب سے آنے والے منافع کی نسبت سے زیادہ منافع ہوا، اس صورت میں اس رقم کا منافع دوسری رقموں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا رکاوٹوں کو دور کرنے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ یہ کہا جائے کہ یہ ''اجتماعی شرکت جاریہ'' ہے جو موجودہ دور میں شرکت کی ایک جدید قسم ہے۔ اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ شرکت العنان یا شرکت مضاوضہ کے تمام عناصر اس میں پائے جائیں، اس لئے کہ یہ شرکت کی ایک مستقل قسم ہے۔ البتہ شرکت کے جواز کی جو شرائط منصوص ہیں، اگر ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی جائے گی تو اس وقت اس پر عدم جواز کا حکم لگا دیا جائے گا، ورنہ عدم جواز کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن و حدیث میں ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے جو شرکت مشروعہ کو شرکت کی صرف ان اقسام میں منحصر کر دے جو فقہاء کرام نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں، بلکہ فقہاء کرام نے اپنے زمانے اور ماحول میں رائج شدہ شرکت کی مختلف اقسام کی تحقیق کر کے انہیں بیان کر دیا ہے۔ اور شرکت کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو تجارت میں لوگوں کی ضروریات کی بنیاد پر وجود میں آئی ہیں، مثلاً ''شرکت التقبل'' اور ''شرکت الوجوہ'' یہ شرکت کی ایسی قسمیں ہیں کہ قرآن و حدیث کی نصوص میں ان کا کہیں ذکر نہیں، لیکن فقہاء کرام نے ضرورت کی وجہ سے ان دونوں کو جائز کہا ہے۔ لہٰذا اگر شرکت کی کوئی جدید قسم وجود میں آ جائے تو صرف اس وجہ سے کہ چونکہ کتبِ فقہ میں ذکر کردہ شرکت کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم میں داخل نہیں ہے، شرکت کی اس جدید قسم کو باطل اور ناجائز نہیں کہا جائے گا جب تک کہ وہ جدید قسم قرآن و حدیث میں بیان کردہ شرکت کے بنیادی قواعد کے معارض نہ ہو۔

لہٰذا مندرجہ بالا اصول کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ''اجتماعی شرکت جاریہ'' شرکت کی ایک جدید صورت ہے جو موجودہ دور کے رائج معاملات میں لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ اور اس جدید صورت کو صرف اس وجہ سے ناجائز نہیں کہا جائے گا کہ فقہاء کی ذکر کردہ بعض فروعی جزئیات اس صورت پر منطبق نہیں ہو رہی ہیں۔ دیکھنے سے یہ نظر آتا ہے کہ اس شرکت میں تمام شرکاء کی رقمیں مخلوط ہوتی ہیں اور ہر شریک نفع و نقصان دونوں برداشت کرنے کے لئے اپنی رقم شرکت میں لگاتا ہے، اور کسی بھی شریک کے لئے نفع میں سے کوئی مخصوص مقدار کی رقم طے شدہ نہیں ہوتی ہے، بلکہ ہر

شریک نفع ونقصان میں برابر کا شریک ہوتا ہے اور کسی شریک کو دوسرے پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا شرکت کی اس جدید قسم میں شرکت کی تمام بنیادی باتیں موجود ہیں۔

جہاں تک ''ڈیلی پروڈکٹس'' کی بنیاد پر نفع کی تقسیم کا تعلق ہے تو اگرچہ یہ تقسیم ہر ہر مال پر حاصل ہونے والے واقعی نفع کی تقسیم نہیں ہے، بلکہ ایک پیریڈ کے دوران پورے مال پر حاصل ہونے والے تخمینی نفع کی تقسیم ہے، اور شرکت کی بنیاد رکھتے وقت ہی نفع کی تقسیم کا یہ طریقہ تمام شرکاء کی رضامندی سے طے ہو جاتا ہے، جبکہ اس جیسے معاملات میں نفع کی تقسیم کے اس طریقے کے علاوہ کوئی اور منصفانہ طریقہ بھی موجود نہیں ہے۔

شرکت کی قدیم قسموں میں بھی مندرجہ بالا تخمینی نفع کی تقسیم کی دو نظیریں موجود ہیں:

پہلی نظیر ''شرکت الاعمال'' ہے جس کو ''شرکت الابدان'' اور ''شرکت التقبل'' بھی کہا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ دو آدمی اس بنیاد پر شرکت کرتے ہیں کہ وہ دونوں لوگوں سے کام وصول کریں گے اور جو کچھ اجرت ملے گی وہ دونوں کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم ہوگی۔ فقہاء کرامؒ نے شرکت کی اس صورت کو صراحتاً جائز کہا ہے، اگرچہ دونوں کے کاموں میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے فرق ہو، لہٰذا اگر دونوں شریک یہ طے کرلیں کہ جو اجرت ملے گی وہ ہم آپس میں نصف نصف تقسیم کریں گے تو اس صورت میں ہر شریک نصف اجرت کا مستحق ہوگا چاہے اس نے نصف اجرت کے مقابلے میں کم کام کیا ہو، اس لئے کہ شرکت کام کی ضمانت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور دونوں نصف نصف کام کے ضامن ہیں۔

دوسری نظیر یہ ہے کہ احناف کا مسلک ہے کہ شرکت کی صحت کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ شرکاء کے اموال کو ضرور خلط ملط کیا جائے۔ لہٰذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر دو شرکاء ہوں، ایک کے پاس دینار ہوں اور دوسرے کے پاس درہم ہوں، اور دونوں شریک اپنی اپنی رقم ملائے بغیر شرکت کا معاہدہ کر لیں، اور پھر ہر شریک اپنی اپنی رقم سے اس معاہدہ شرکت کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ مال تجارت خرید لے، تو اس صورت میں یہ شرکت درست ہو جائے گی۔ اور دونوں شرکاء ایک دوسرے کے مال کے نفع میں شریک ہوں گے۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"واختلاط الربح يوجد وان اشترى كل واحد منهما بمال نفسه على حدة، لان الزيادة وهي الربح تحدث على الشركة."

''یعنی اگر دو شرکاء اپنی اپنی رقم سے علیحدہ علیحدہ مال تجارت خرید لیں تو اس صورت میں بھی نفع میں اختلاط پایا جائے گا، اس لئے کہ نفع شرکت کی بنیاد پر ہوا ہے۔''(۱)

---

(۱) بدائع الصنائع، ج۶ ص۶۰۔

مندرجہ بالا دو نظیروں کا مقتضی یہ ہے کہ شرعاً یہ ضروری نہیں ہے کہ شرکاء میں سے ہر شریک کا نفع اس کے مال یا عمل کی شرکت کی بنیاد پر حاصل ہونے والے واقعی نفع کی بنیاد پر ہو، بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں شرکاء آپس میں نفع کی تقسیم کے لئے کسی اور بنیاد پر اتفاق کر کے اس کے مطابق آپس میں نفع تقسیم کر لیں۔

لہٰذا اگر شرکاء ڈیلی پروڈکٹس کی بنیاد پر آپس میں نفع تقسیم کرنے پر اتفاق کر لیں تو یہ صورت شریعتِ اسلامیہ کی نصوص میں سے کسی بھی نص سے متصادم نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ ایک مخصوص حسابی طریقہ ہے جس کو اجتماعی جاری شرکت کے شرکاء نے صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس کے علاوہ نفع کی تقسیم کی کوئی دوسری عملی بنیاد موجود نہیں ہے، اور مسلمانوں کو آپس میں اپنے درمیان شرائط طے کرنا جائز ہے، اِلا یہ کہ وہ شرط ایسی ہو جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دے۔ (تو ایسی شرط آپس میں طے کرنا جائز نہیں)۔

واللہ سبحانہ وتعالی اعلم وعلمہ اتم واحکم واخر
دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اسلامی بینکنگ کے چند مسائل اور ان کا حل

اسلامی بینکنگ کے چند مسائل اور ان کا حل

بینک کا قرض کی فراہمی پر آنے والے اخراجات کو ''سروس چارج'' کے نام سے ایک معین رقم وصول کرنا

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک اپنے رکن ممالک کو بنیادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے غیر سودی قرضے فراہم کرتا ہے، اور قرض جاری کرنے پر جو دفتری مصارف آتے ہیں، بینک ''سروس چارج'' کے نام سے ایک متعین رقم بطور مصارف کے وصول کرتا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ''اسلامی ترقیاتی بینک'' اپنے ممبر ممالک کو ان کے بنیادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے جو قرضے فراہم کرتا ہے، وہ طویل المیعاد ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی ۱۵ سال سے ۳۰ سال کے دوران کرنی ہوتی ہے۔ قرض کے اس معاملے میں شریعتِ اسلامیہ کے احکام کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے، چنانچہ بینک ان قرضوں پر کوئی سود وصول نہیں کرتا، البتہ اس قرض کے جاری کرنے پر بینک کے جو ادارتی مصارف آتے ہیں، ان مصارف کو بینک اپنے بنیادی دستورالعمل کے مطابق بطور ''سروس چارج'' وصول کرتا ہے۔

اب بینک یہ چاہتا ہے کہ جن منصوبوں کی تکمیل کے لئے وہ ممبر ممالک کو سرمایہ فراہم کرے گا، ان کی پلاننگ اور نگرانی پر جو ادارتی مصارف آئیں گے، ان مصارف کو سامنے رکھتے ہوئے بینک ''سروس چارج'' کی تحدید کرے ـــــ لیکن چونکہ بینک جن منصوبوں کی تکمیل کے لئے سرمایہ فراہم کرے گا، ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ جو واقعی ادارتی مصارف آ رہے ہیں، ان کی تحدید کرنا مشکل ہے، اس مشکل کے حل کے لئے بینک نے کہا کہ تمام قرضے جاری کرنے پر جو ادارتی مصارف آتے ہیں، ان کا حساب لگایا، اور پھر ان مصارف کو جاری کیے جانے والے قرضوں پر تقسیم کیا تو وہ مصارف اصل قرض کی نسبت سے ڈھائی سے تین فیصد بنے۔ لہٰذا اب بینک یہ چاہتا ہے کہ ہر قرض پر دفتری اخراجات کا علیحدہ حساب کرنے کے بجائے قرض کی رقم کی نسبت سے جو تقریبی مصارف آتے

ہیں ان کو متعین کر کے ''سروس چارج'' کے نام سے وصول کر لے۔ کیا بینک کے لئے اس طرح ''سروس چارج''، متعین کر کے وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:

قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور ''سروس چارج'' کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئے ہیں۔ البتہ اگر پوری احتیاط کے ساتھ ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکامِ شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی، اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہوگا۔

اور اگر ہر منصوبہ کے علیحدہ علیحدہ اخراجات کی تحدید ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بینک کے لئے ان سے واقعی اخراجات طلب کرنے کے بجائے قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی دفتری کاروائی کی اجرت وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو۔ اس لئے کہ قرض دینے کا عمل بذاتِ خود ایک ایسا عمل ہے جس پر نفع کا مطالبہ کرنا یا اجرت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں۔ لہٰذا قرض جاری کرنے پر آنے والے مصارف کو اندازے سے لم سم وصول کرنا جائز نہیں۔ لیکن اس قرض کے اجراء پر پیش آنے والے حقیقی دفتری اخراجات کا بلا معاوضہ ہونا شرعاً کوئی ضروری نہیں۔

البتہ بینک کے لئے قرض لینے والوں سے قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے اجرت وصول کرنے کی گنجائش ہے جو قرض جاری کرنے پر آنے والے دفتری اخراجات کو پورا کر سکے۔ بشرطیکہ اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے، ایک یہ کہ یہ اجرت اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل کے برابر ہو، دوسرے یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصولِ نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے۔

اس مسئلہ کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت طلب کرنا جائز نہیں۔ لیکن مفتی کے لئے فتویٰ تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اور بشرطیکہ اس کو نفس فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے پر اجرت لینے کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنایا جائے۔

البتہ قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے ''سروس چارج'' وصول کرنے پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ قرض کی مقدار کی کمی اور زیادتی پر دفتری امور میں یا اس قرض کے اندراجات میں کوئی کمی یا زیادتی واقع نہیں ہوتی۔ (چنانچہ ایک ہزار کے اندراج کے مقابلے میں دو ہزار کے اندراج میں کوئی زیادتی واقع نہیں ہوتی) اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ ''سروس چارج'' کی رقم ہر قرض لینے والے سے برابر وصول کی جانی چاہئے، قرض کی مقدار کی کمی اور زیادتی سے اس پر کوئی فرق واقع نہ ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اجرتِ مثل ہمیشہ کام کرنے کی اس مشقت کے بقدر ہونا ضروری نہیں ہے، جو عامل نے برداشت کی ہے بلکہ بعض اوقات اس میں کام کی نوعیت اور اس کی معنوی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات مستاجر کو حاصل ہونے والے نفع کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، اسی لئے بعض اوقات معمولی مشقت کے کام پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے، اور بعض اوقات زیادہ مشقت کے کام پر تھوڑی اجرت دی جاتی ہے۔

چنانچہ درمختار میں علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

یستحق القاضی الاجر علی کتب الوثائق والمحاضر، والسجلات قدر ما یجوز لغیرہ کالمفتی، فانہ یستحق اجر المثل علی کتابۃ الفتویٰ، لان الواجب علیہ الجواب باللسان، دون الکتابۃ بالبنان، ومع ھذا الکف اولی، احترازًا عن القیل والقال، وصیانۃ لماء الوجہ عن الابتذال۔

قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے پر اس قدر اجرت وصول کرنا جائز ہے جس قدر دوسرے شخص کو ایسے عمل پر اجرت لینا جائز ہے، جس طرح مفتی کے لئے فتویٰ تحریر میں لانے کی اجرتِ مثل وصول کرنا جائز ہے، اس لئے کہ مفتی کے ذمے صرف زبان سے جواب دینا واجب ہے، لکھ کر جواب دینا واجب نہیں، لیکن جائز ہونے کے باوجود عوام کے قیل وقال اور اپنے کو حقارت اور ذلت سے دور رکھنے کے لئے اجرت نہ لینا ہی افضل ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ اس کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں:

قال فی الجامع الفصولین: للقاضی ان یاخذ ما یجوز لغیرہ، وما قیل فی کل الف خمسۃ دراھم، لا نقول بہ، ولا یلیق ذلك بالفقہ، وای مشقۃ للکاتب فی کثرۃ الثمن؟ وانما اجد مثلہ بقدر مشقتہ او بقدر عملہ فی صنعتہ ایضًا، کحکاك وثقاب یستاجر باجر کثیر فی مشقۃ قلیلۃ قال

بعض الفضلاء: افهم ذلك جواز اخذ الاجرة الزائدة وان كان العمل مشقته قليلة، ونظر هم لمنفعة المكتوب له۔ اھ: قلت: ولا يخرج ذلك عن اجرة مثله، فان من تفرغ لهذا العمل، كثقاب اللآلى مثلًا، لا ياخذ الاجر على قدر مشقته فانه لا يقوم بمؤونته، ولو الزمناه ذلك لزم ضياع هذه الصنعة فكان ذلك اجر مثله۔ (۱)

جامع الفصولین میں ہے کہ قاضی کو (دستاویزات لکھنے اور اندراجات کرنے پر) اس قدر اجرت لینا جائز ہے جس قدر کہ دوسرا شخص اتنی مقدار پر لکھنے پر تیار ہو، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ایک ہزار پر پانچ درہم وصول کرے، ہم اس کو جائز نہیں کہتے، اور فقہی اعتبار سے بھی یہ مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ بڑی مقدار کی رقم لکھنے میں کاتب کی مشقت میں کونسا اضافہ ہو جاتا ہے؟ اور کسی کام کی اجرت مثل یا تو کام کی مشقت کے اعتبار سے ہوتی ہے یا کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہوتی ہے، مثلاً سونے کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے والے اور (موتیوں میں) سوراخ کرنے والے کو معمولی مشقت پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے۔

چنانچہ بعض فقہاء اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر چہ کسی عمل میں مشقت کم ہو، تب بھی اس پر (عمل کی نوعیت کی وجہ سے) زیادہ اجرت لینا جائز ہے، (لہٰذا قاضی اور مفتی کو بھی زیادہ اجرت لینا جائز ہے) اس لئے کہ ان فقہاء کی نظر اس تحریر میں مکتوب لہ کو حاصل ہونے والے نفع کی طرف مبذول ہوئی ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ (سونا پرکھنے والا اور موتیوں میں سوراخ کرنے والا جو اجرت لیتا ہے) وہ اجرت مثل سے خارج نہیں ہے۔ اس لئے جس شخص نے اپنے آپ کو صرف اسی کام کے لئے مثلاً موتیوں میں سوراخ کرنے کے لئے فارغ کر لیا ہے، وہ مشقت کے بقدر اجرت وصول نہیں کرتا ہے، اور اگر ہم اس پر یہ لازم کر دیں کہ وہ صرف مشقت کے بقدر اجرت وصول کیا کرے تو وہ کام چھوڑ بیٹھے گا، اور اس طرح اس صنعت کو بند کرنا لازم آ جائے گا، پس یہی اس کے لئے اجر مثل ہے۔ (۲)

---

(۱) ردالمحتار، ج۵، ص۹۲، کتاب الاجارۃ، مسائل شتی۔

(۲) درمختار، ج۵، ص۹۲، کتاب الاجارۃ، مسائل شتی۔

اور یہ بات تو مشہور ہے کہ بہت سے فقہاء نے دلال کے کمیشن کو مبیع کی قیمت میں فیصد کے تناسب سے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ بخاری شریف کی شرح میں لکھتے ہیں:

وهذا الباب فيه اختلاف العلماء، فقال مالك: يجوز ان يستاجره على بيع سلعته اذا بين لذلك اجرًا قال: وكذلك اذا قال له: بع هذا الثوب، ولك درهم انه جائز، وان لم يوقت له ثمنًا، وكذلك ان جعل له فى كل مائة دينار شيئًا، وهو جعل، وقال احمد: لا باس ان يعطيه من الالف شيئًا معلومًا، وذكر ابن المنذر عن حماد والثورى انهما كرها اجره، قال ابوحنيفة: ان دفع له الف درهم يشترى بها بزا باجر عشرة دراهم فهو فاسد، وكذلك لو قال: اشتر مائة ثوب فهو فاسد، فان اشترى فله اجر مثله، ولا يجاوز ماسمى من الاجر.(۱)

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سامان فروخت کرنے کے لئے دلال کو اجرت پر رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی اجرت بیان کردے۔ مزید فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے دلال سے کہا: یہ کپڑا بیچ دو، تمہیں ایک درہم دیا جائے گا، تو یہ جائز ہے، اگرچہ اس کپڑے کا ثمن متعین نہ کرے، اور دلال کے لئے ہر سو دینار پر بطور کمیشن کے کچھ رقم مقرر کردینا بھی جائز ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ دلال کے لئے ہر ہزار پر کچھ کمیشن مقرر کرنا جائز ہے، اور علامہ ابن المنذر حمادؒ اور ثوریؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک دلال کی اجرت مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے دلال کو کپڑا خریدنے کے لئے ایک ہزار روپے دیئے۔ اور دس درہم اجرت مقرر کردی تو یہ اجارہ فاسد ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے دلال سے کہا کہ میرے لئے سو کپڑے خریدلو (دس درہم اجرت دیں گے) یہ اجارہ بھی فاسد ہے، اور اس صورت میں اگر دلال نے کپڑے خرید لیے تو اسے اجرت مثل دی جائے گی، بشرطیکہ اجرت مثل اجرت مسمّی سے زیادہ نہ ہو۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) عمدۃ القاری، کتاب الاجارۃ، باب اجر السمسرۃ۔

ویجوز ان یستاجر سمسارًا یشتری له ثیابًا، ورخص فیه ابن سیرین، وعطاء، والنخعی، وکرهه الثوری، وحماد، ولنا انها منفعة مباحة تجوز النیابة فیها، فجاز الاستئجار علیها، کالبناء، ...... فان عین العمل دون الزمان، فجعل له من کل الف درهم شیئًا معلومًا صحیح ایضا۔

کپڑے کی خریداری کے لئے دلال کو اجرت پر رکھنا جائز ہے، امام ابن سیرین، امام عطاء، امام نخعی رحمہم اللہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں، البتہ امام ثوری، امام حماد رحمہما اللہ نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ ایک مباح منفعت ہے، جس میں نیابت جائز ہے، لہٰذا استئجار بھی جائز ہے، جیسا کہ تعمیر میں جائز ہے ...... اور اگر مستاجر نے دلال کے لئے کام تو معین کر دیا، لیکن وقت معین نہیں کیا اور بطور اجرت کے ہر ہزار درہم پر کوئی متعین کمیشن مقرر کر دیا تب بھی یہ معاملہ درست ہے۔(۱)

بہرحال، اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک فیصد کے حساب سے دلال کی اجرت مقرر کرنا جائز ہے، اور علامہ عینیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا جو مسلک نقل کیا ہے، متاخرین حنفیہ نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

قال فی التاتر خانیة: وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل، وما تواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا، فذاك حرام علیهم، وفی الحاوی: سئل محمد بن مسلمة عن اجرة السمسار، فقال: ارجوانه لا باس به، وان کان فی الاصل فاسدا، لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس الیه، کدخول الحمام۔

تاتر خانیہ میں ہے کہ دلالی میں اجرت مثل واجب ہوتی ہے اور اگر عاقدین اس پر اتفاق کریں کہ ہر دس دینار پر اتنا کمیشن ہوگا، تو یہ صورت ان کے لئے حرام ہے۔ اور حاوی میں ہے کہ محمد بن مسلمہ سے دلالی کے کمیشن کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: میرا خیال یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ اصلاً یہ معاملہ فاسد تھا، لیکن کثرتِ تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس کی بہت سی صورتیں ناجائز بھی ہیں، لیکن فقہاء نے ضرورۃً اس کو جائز قرار دیا ہے، جیسے کہ دخولِ حمام کے مسئلہ میں ضرورۃً جائز کہا ہے۔(۲)

---

(۱) المغنی لابن قدامۃ، ج۵، ص۴۶۶۔ (۲) ردالمحتار، ج۶، ص۶۳۔

چنانچہ بہت سے متاخرین فقہاءِ حنفیہ نے دلالی کے کمیشن کو فیصد کے لحاظ سے متعین کرنے پر جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ جیسا کہ برصغیر کے مشہور بزرگ اور حنفی فقیہہ حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے جو ہندوستان کے فقہاءِ حنفیہ میں سرفہرست شمار ہوتے ہیں۔ (۱)

اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ثمن کی کمی اور زیادتی سے اکثر اوقات دلالی میں محنت اور مشقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن اس کے باوجود ان فقہاءِ متاخرین کے نزدیک فیصد کے اعتبار سے دلالی کا کمیشن مقرر کرنا جائز ہے ـــــ لہٰذا دلالی کے کمیشن پر قیاس کرتے ہوئے زیرِ بحث مسئلے میں قرض کے اجراء پر آنے والے دفتری اخراجات کو قرض کی مقدار پر فیصد کے لحاظ سے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ دونوں کے درمیان مابہ الفرق کوئی چیز نہیں ہے۔

البتہ فیصد کے اعتبار سے وصول کیے جانے والے اخراجات کی مقدار بہت معمولی ہونی چاہئے، تاکہ واقعۃً اس کے ''سروس چارج'' ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور یہ ''سروس چارج'' اجرت مثل سے زیادہ وصول کرنا کسی حال میں جائز نہیں، ورنہ "کل قرض جر نفعًا" کے تحت داخل ہو کر یقینی طور پر حرام ہو جائے گی۔

فیصد کے اعتبار سے اتنا ''سروس چارج'' وصول کرنا جائز تو ہے جو اجرت مثل سے تجاوز نہ کرے، لیکن اجرت مثل سے زیادہ ہونے کا احتمال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اور اس کا بھی احتمال موجود ہے کہ کہیں ''سروس چارج'' کو سود وصول کرنے کے لئے ایک آلہ کار نہ بنالیا جائے، اس لئے اسلامی بینک کو چاہئے کہ وہ یہ طریقہ اختیار کریں کہ پہلے ایک سال میں قرضوں کے اجراء پر جتنے دفتری اخراجات آئیں، ان کا مجموعہ نکال لیں، اور اس کو ایک سال میں جاری کیے گئے تمام قرضوں پر تقسیم کر دیں، اس طرح ان قرضوں کے اجراء پر آنے والے اخراجات کا فیصد کے حساب سے تعین ہو جائے گا، اور پھر وہ اخراجات تمام قرض داروں سے ان کے قرض کی مقدار کے لحاظ سے بطور ''سروس چارج'' کے وصول کرلے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے ہر ہر قرض پر آنے والے اخراجات کا علیحدہ حساب نہیں کرنا پڑے گا۔

واللہ اعلم

---

(۱) ملاحظہ ہو: امداد الفتاویٰ، ج ۳، ص ۳۶۳ تا ۳۶۶، سوال نمبر ۳۳۳۔

بینک کا اپنے گاہک کو اولاً سامان کی خریداری کا وکیل بنانا، اور پھر اس کے ساتھ کرایہ داری کا معاملہ کرنا، اور پھر اسی گاہک کے ہاتھ وہ چیز فروخت کرنا۔

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک کرایہ پر دینے کا جو معاملہ کرتا ہے، وہ اس طرح کرتا ہے کہ مثلاً ذرائع نقل وحمل جیسے آئل ٹینکر، جہاز وغیرہ کی خریداری اور پھر ان کو آگے کرایہ پر دینے کے لئے سرمایہ کاری کرتا ہے، یا بعض اوقات ممبر ممالک کے لئے ان کے صنعتی منصوبوں کے اسباب اور سامان کی خریداری اور پھر ان کو کرایہ پر دینے کے لئے سرمایہ کاری کرتا ہے۔

چنانچہ اسلامی ترقیاتی بینک مندرجہ ذیل بنیادوں پر کرایہ کا معاملہ کرتا ہے:

(الف) جس پروجیکٹ میں بینک ''کرایہ داری'' کے طریقے پر سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے، جب اس پروجیکٹ میں بینک کو مالی یا فنی فائدے کے حصول کا یقین ہو جاتا ہے، اس وقت وہ بینک اس پروجیکٹ کو چلانے والی کمپنی (مستاجر) کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیتا ہے، اور بینک اس کمپنی کو اپنے نام پر مطلوبہ سامان خریدنے کی اجازت دے دیتا ہے (جس کی تعیین اور تخمین مصارف کی تحدید ا یگریمنٹ میں طے شدہ ہوتی ہے) اور معاہدہ کے مطابق بینک سپلائرز کو سامان کی قیمت ایگریمنٹ میں طے شدہ مدتوں کے مطابق براہِ راست ادا کر دیتا ہے۔

(ب) اس کے بعد کمپنی (مستاجر) بینک کی طرف سے نائب بن کر اس سامان پر قبضہ کرتی ہے، اور ایگریمنٹ میں بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں یقین حاصل کر لیتی ہے، اور پھر اگر اس مشینری کو نصب کی ضرورت ہو تو اس کی تنصیب کی نگرانی کرتی ہے، تاکہ ایگریمنٹ کے مطابق پورا کام صحیح طور پر انجام پائے۔

(ج) پروجیکٹ پر کام کرنے والی کمپنی کی معلومات کے مطابق اور کمپنی اور بینک کے فنی ماہرین کے اندازوں کے مطابق سامان کی خریداری اور اس کی تنصیب کی عملی تنفیذ جس کے بعد اس مشینری سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکے، ان دونوں کاموں کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کی تحدید ''ایگریمنٹ'' کرے گا، تاکہ اس کی بنیاد پر جو وقت مقرر کیا گیا ہے، اس کے بعد ''کرایہ داری''

کی ابتداء ہو سکے، اور اس کے بعد سامان کرایہ پر دینے کے قابل ہو سکے، اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

(د) مدت کرایہ داری کے دوران کرایہ دار عقد کرایہ داری میں طے شدہ قسطیں ادا کرتا رہے گا، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کمپنی بینک کے مفاد کی خاطر سامان کی حفاظت اور اس کی انشورنس کی ذمہ داری بھی لے گی۔

(ہ) ایگریمنٹ کے مطابق بینک اس بات کا پابند ہوگا کہ مدت کرایہ داری پوری ہونے کے بعد بینک اس سامان کو معمولی قیمت پر کرایہ دار کمپنی کو فروخت کر دے گا، اور کرایہ دار طے شدہ تمام قسطیں اور دوسرے تمام التزامات ایگریمنٹ کے مطابق ادا کرے گا۔

کیا بینک کے لئے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کرایہ داری کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

کسی چیز کو کرایہ پر دینے کا معاملہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بینک اشیاء اور سامان خود خریدے، اور پھر بطور مالک کے اس پر قبضہ بھی کرے، اور پھر بینک وہ چیز مدت معلومہ اور اجرت معلومہ پر اپنے گاہک کو کرایہ پر دے دے۔ اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اشیاء اور سامان دوبارہ بینک کے قبضہ میں آ جائے گا۔ اور پھر فریقین کو اختیار ہوگا۔ چاہیں تو دوبارہ جدید عقد اجارہ کر لیں، یا فریقین آپس میں اس وقت کوئی ثمن طے کر کے عقد بیع کر لیں، اور بینک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اشیا اور سامان کو دوسرے گاہک کو کرایہ پر دے دے، اور یا دوسرے گاہک کے ہاتھ فروخت کر دے۔

مذکورہ بالا طریقہ شرعاً بالکل جائز ہے۔ اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

۲۔ دوسری صورت جس کے بارے میں سوال بھی کیا گیا ہے، وہ یہ کہ بینک ایسی اشیا اور سامان کرایہ پر دے جو عقد اجارہ کے وقت اس کی ملکیت میں نہیں ہے بلکہ عقد اجارہ کرنے کے بعد بینک وہ سامان سپلائر سے اپنے گاہک کے نام ہی پر خریدے، اور پھر بینک اپنے گاہک کو اس سامان پر قبضہ کرنے اور اس کو وصول کر کے اپنے یہاں نصب کرنے کا وکیل بنا دے، اور بینک ایک تاریخ مقرر کر دے گا کہ فلاں تاریخ پر عقد بیع مکمل ہو کر عقد اجارہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مقرر تاریخ کے بعد بینک اس چیز کا کرایہ گاہک سے وصول کرتا رہے گا، یہاں تک کہ عقد اجارہ کی مدت معاہدہ کے مطابق پوری ہو جائے اور بینک اپنے تمام واجبات گاہک سے وصول کر لے تو پھر بینک وہ سامان معمولی ثمن پر

اسی گاہک کے ہاتھ فروخت کردے گا۔

اس دوسری صورت میں فقہی اعتبار سے چند امور قابل غور ہیں:

۱۔ جس وقت بینک عقد اجارہ کرتا ہے، وہ اس چیز کا مالک بھی نہیں ہوتا، اس پر قبضہ ہونا تو دور کی بات ہے، اور جس چیز کا انسان مالک نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے۔ اسی طرح جو چیز انسان کے قبضے میں نہ اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اس لئے کہ یہ "ربح ما لم یضمن" کی قبیل سے ہے، جو حدیث کی رو سے منہی عنہ ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ کی الشرح الکبیر میں ہے:

وكذلك لا يصح هبته ولا رهنه، ولا دفعه اجرة، وما اشبه ذلك، ولا التصرفات المنعقدة الى القبض، لانه غير مقبوض، فلا سبيل الى اقباضه۔ (۱)

اسی طرح ہبہ، رہن اور اجارہ اور دوسرے معاملات جو قبضہ کے ساتھ تام ہوتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ چیز قبضہ میں نہیں ہے، لہٰذا آگے دوسرے کو اس پر قبضہ کرانا بھی ممکن نہیں ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومنها (اى من شرائط صحة الاجارة) ان يكون مقبوض المؤجر اذا كان منقولًا، فان لم يكن فى قبضه فلا تصح اجارته۔ (۲)

اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اگر وہ چیز منقول ہے تو موجر کے قبضے میں ہو، اگر وہ چیز موجر کے قبضے میں نہیں ہے تو پھر عقد اجارہ درست نہیں۔

شوافع کا بھی صحیح قول یہی ہے۔ (۳)

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جس وقت بینک اور گاہک کے درمیان معاہدہ ہو اس وقت عقد اجارہ کو منعقد نہ مانا جائے، بلکہ اس معاہدہ کو عقد اجارہ کے لئے محض ایک وعدہ تصور کیا جائے۔ پھر جب گاہک سپلائر سے سامان وصول کر کے اپنے قبضے میں لے آئے اور اپنے یہاں نصب کرنے کا کام مکمل ہو جائے اس کے بعد بینک اپنے گاہک کے ساتھ اس تاریخ پر بالمشافہہ یا تحریری مراسلت کے ذریعہ عقد اجارہ کرے، اور عقد اجارہ کی اس تاریخ سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا۔ لہٰذا اگر

(۱) الشرح الکبیر لابن قدامہ، ج ۴، ص ۱۱۹۔ (۲) الفتاوی الہندیۃ، ج ۴، ص ۴۱۱۔
(۳) دیکھئے: مغنی المحتاج، ج ۲، ص ۶۸، ۶۹۔

اس دوران وہ سامان تباہ ہو جائے تو بینک کا نقصان ہوگا۔ اور اس تاریخ تک سامان پر گاہک کا قبضہ، قبضہ امانت شمار ہوگا، لہٰذا اگر وہ سامان بلا تعدی کے ہلاک اور ضائع ہو جائے تو گاہک ضامن نہیں ہوگا۔

۲۔ اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ کی چیز پر آفاتِ سماویہ آ جائے تو اس صورت میں مستاجر ضامن نہ ہوگا، جب تک مستاجر اس چیز کی حفاظت میں تعدی سے کام نہ لے، اس اصول کے پیش نظر مدۃ اجارہ کے دوران حوادث اور آفات سے حفاظت کے لئے اس سامان کا انشورنس کرنا مستاجر کے ذمے واجب نہیں ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اگر انشورنس کرنا ضروری ہو تو بینک بحیثیت مالک کے اس کا انشورنس کرائے۔

یہ انشورنس بھی اس وقت جائز ہے جب وہ تعارفی اور جائز انشورنس ہو۔ اگر وہ انشورنس دھوکہ، سود، قمار وغیرہ پر مشتمل ہو تو ایسا انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں۔

۳۔ سوال میں جو عقد اجارہ مذکورہ ہے، اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد موجودہ سامان معمولی قیمت پر مستاجر کو فروخت کر دے گا۔

فقہی اعتبار سے اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس سامان کی بیع اجارہ کے ختم کے ساتھ معلق کر دی جائے، اس صورت میں بیع دو چیزوں کے ساتھ مشروع ہوگی۔ ایک یہ کہ مدت اجارہ پوری ہو جائے اور دوسرے یہ کہ مستاجر کا ذمہ تمام واجبات سے فارغ ہو جائے۔ یہ صورت شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے، اور مستقبل کے کسی زمانے کی طرف عقد بیع کی اضافت کرنا بھی درست نہیں ہے۔

علامہ خالد الاتاسی شرح المجلہ میں فرماتے ہیں:

واما الذی لا یصح تعلیقه بالشرط شرعًا فضابطه کل ما کان من التملیکات .... کالبیع والاجارة۔ (۱)

شرعاً جن عقود کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ ہر وہ عقد جن کا تعلق تملیکات سے ہو .... مثلاً عقد بیع اور عقد اجارہ۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس وقت بیع نہ کی جائے، بلکہ وعدہ بیع کر لیا جائے جو عقد اجارہ کے اندر مشروط ہو۔

اس صورت میں یہ ایسی شرط ہوگی جو مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اور اس جیسی شرط حنفیہ اور

---

(۱) شرح المجلۃ العدلیۃ، ج ۱، ص ۲۳۴۔

شوافع کے نزدیک عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ جہاں تک مالکیہ اور حنابلہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک بہت سی شرطیں جو اگرچہ مقتضاء عقد کے تو خلاف ہوں لیکن وہ شرطیں عقد کو فاسد نہیں کرتیں۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی صفقہ میں اجارہ کے اندر بیع کی شرط لگانا جائز ہوگا۔

چنانچہ شرح الخرشی علی مختصر الخلیل میں ہے:

ان الاجارة اذا وقعت مع الجعل فی صفقة واحدة فانها تكون فاسدة لتنافر الاحكام بينهما، لان الاجارة لا يجوز فيها الغرر، وتلزم بالعقد، ويجوز فيها الاجل، ولا يجوز شئ من ذلك فی الجعل— بخلاف اجتماع الاجارة مع البيع فی صفقة واحدة، فيجوز سواء كانت الاجارة فی نفس المبيع، كما لو باع له جلودًا على ان يخرزها البائع للمشترى نعالًا، او كانت الاجارة فی غير البيع، كما لو باع له ثوبًا بدراهم معلومة على ان ينسج له ثوبًا آخر.(۱)

اگر عقد اجارہ اور عقد جعل ایک ہی صفقہ میں کیا جائے تو یہ صورت فاسد ہے، اس لئے کہ ''اجارہ'' اور ''جعل'' کے درمیان تنافر ہے۔ اس لئے کہ عقد اجارہ کے اندر ''غرر'' جائز نہیں، معاملہ کرنے سے اجارہ لازم ہو جاتا ہے، اور اجارہ کے اندر مدت کی تعیین جائز ہے۔ جبکہ ''جعل'' میں ان میں سے کوئی بھی چیز جائز نہیں بخلاف اس کے کہ اجارہ کو بیع کے ساتھ ایک صفقہ میں جمع کر دیا جائے۔ یہ صورت جائز ہے، چاہے وہ اجارہ اسی مبیع میں ہو جس کی بیع ہوئی ہے، مثلاً کوئی شخص کھال اس شرط پر فروخت کرے کہ بائع مشتری کے لئے اس کھال کے جوتے کاٹ بنا کر دے گا— یا یہ صورت ہو کہ عقد اجارہ مبیع کے علاوہ کسی دوسری چیز میں ہو۔ مثلاً کوئی شخص معین دراہم میں اس شرط پر کپڑا فروخت کرے کہ وہ اس کے لئے دوسرا کپڑا بن کر دے گا (تو یہ صورت شرعاً جائز ہیں)

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ جواز اس وقت ہے جب بیع بھی حالا ہو، مؤجل نہ ہو، اور اس بیع کے اندر جو اجارہ مشروط ہو وہ بھی حالا ہو، لیکن زیرِ بحث مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اس میں اجارہ تو حالا ہے، لیکن اسی اجارہ کے اندر جو بیع مشروط ہے، وہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد منعقد

(۱) الخرشی علی مختصر خلیل، ۷:۴۰۔

ہوگی۔اس مسئلہ کا صریح حکم اگرچہ مالکیہ کی کتابوں میں تو مجھے نہیں ملا، لیکن ان کتابوں کی عبارات سے یہ مفہوم ہورہا ہے کہ ان کے نزدیک عقد کے اندر شرط لانا بنیادی طور پر جائز ہے، اور صرف دو صورتوں کے علاوہ کوئی شرط بھی عقد کو فاسد نہیں کرتی۔ایک یہ کہ وہ شرط اس عقد کے منافی ہو، مثلاً بائع اپنی چیز فروخت کرتے وقت یہ شرط لگادے کہ مشتری اس چیز میں کوئی تصرف نہیں کرے گا۔یا موجر اس شرط پر ایک چیز کرایہ پر دے کہ مستاجر اس سے نفع نہیں اٹھائے گا۔چونکہ یہ دونوں شرطیں مقتضاء عقد کے خلاف ہیں، اس لئے یہ عقد فاسد ہو جائے گا۔دوسرے یہ کہ وہ شرط ایسی ہو جس کی وجہ سے ثمن مجمول ہو جائے۔یا تو ثمن میں زیادتی ہو جائے یا کمی ہو جائے۔اس قسم کی شرط سے عقد فاسد ہو جائے گا۔(۱)

ظاہر یہ ہے کہ موجر کا مدت اجارہ کے ختم کے ساتھ بیع کی شرط لگانا مندرجہ بالا دو صورتوں میں داخل نہیں ہے، اس لئے یہ صورت مالکیہ کے نزدیک جائز معلوم ہوتی ہے، واللہ سبحانہ اعلم

بہر حال! مندرجہ بالا تفصیل کے بعد مالکیہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے اس مسئلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک وعدہ بیع ہے جو اجارہ کے ساتھ مشروط ہے، لیکن اس صورت میں مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد بیع منعقد ہوگی، لہٰذا جب مدت اجارہ ختم ہو جائے اس وقت فریقین مستقل ایجاب و قبول کے ذریعہ بیع کا معاملہ کریں۔اب چاہے وہ ایجاب وقبول بالمشافہ ہو یا خط وکتابت کے ذریعہ ہو۔

زیرِ بحث مسئلہ کے جواز کی ایک تیسری شکل اور بھی ہو سکتی ہے جو میرے خیال میں چاروں ائمہ کے مسلک کے مطابق درست ہوگی، وہ یہ کہ وعدہ بیع کو اجارہ کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے، بلکہ وہ وعدہ مستقل علیحدہ کیا جائے۔اس کی صورت یہ ہوگی کہ فریقین کے درمیان ایک وعدہ اگریمنٹ میں ہو جائے، جس میں اسی بات کا وعدہ ہو کہ فریقین پہلے عقد اجارہ کریں گے، اور پھر بیع کریں گے۔پھر وعدہ کے مطابق وقت مقرر پر فریقین کے درمیان اجارہ ہو جائے، جس میں بیع کا کوئی ذکر نہ ہو۔اس کے بعد جب اجارہ کی مدت ختم ہو جائے تو مستقل بیع کر لی جائے، جس میں کوئی شرط وغیرہ نہیں ہو۔ اس طرح دونوں عقد مستقل اور غیر مشروط ہو جائیں گے، اور اس طرح فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہوگا وہ تین باتوں پر مشتمل ہوگا۔

۱۔ بینک گاہک کو سامان خریدنے کا وکیل بنائے گا۔

۲۔ گاہک یہ وعدہ کرے گا کہ وہ سامان وصول کرنے اور اس کو اپنے قبضے میں لانے اور نصب کرنے کے بعد اس کو کرایہ پر لے لے گا۔

---

(۱) دیکھئے: مواہب الجلیل للحطاب، ج۴، ص۳۷۳، ۳۷۵۔ الخرشی، ج۵، ص۸۰، ۸۱۔ بدایۃ المجتہد، ج۲، ص۱۳۳، ۱۳۴۔

۳۔ بینک یہ وعدہ کرے گا کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ سامان اس گاہک کو فروخت کر دے گا۔ اس معاہدہ کے مکمل ہو جانے کے بعد گاہک صرف سامان خریدنے کے سلسلے میں بینک کا وکیل ہو جائے گا۔ پھر وکالت کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد وعدہ کے مطابق عقدِ اجارہ مستقل طور پر اپنے وقت پر منعقد ہوگا، اور پھر وعدہ کے مطابق اجارہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان مستقل طور پر بیع منعقد ہو جائے گی۔

اور گاہک کی طرف سے اجارہ پر لینے کا وعدہ اور بینک کی طرف سے فروخت کرنے کا وعدہ کو دیانۃً تو پورا کرنا فریقین کے ذمے بالا جماع واجب ہے، جہاں تک قضاءً اس وعدہ کے ایفاء کا تعلق ہے تو مالکیہ کے مذہب کے مطابق اگر وعدہ کرنے والے نے وعدہ کر کے موعود لہ کو کسی ایسے معاملے میں داخل کر دیا ہے جو اس وعدہ کی وجہ سے اس پر لازم ہوا ہے تو اس صورت میں قضاءً اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے، اور اگر وعدہ کرنے والا وعدہ خلافی کرے، اور اس وعدہ خلافی کی وجہ سے موعود کو کوئی مالی نقصان ہو جائے تو وعدہ کرنے والا اس مالی نقصان کا ضامن ہوگا۔

چنانچہ علامہ قرآفی مالکیؒ اپنی کتاب ''الفروق'' میں فرماتے ہیں:

قال سحنون: الذی یلزم من الوعد بقوله: اهدم دارك، وانا اسلفك ما تبنی به واخرج الی الحج وانا اسلفك او اشتر سلعة او تزوج امراة، وانا اسلفك، لانك ادخلته بوعدك فی ذلك۔ اما مجرد الوعد فلا یلزم الوفاء به، بل الوفاء به من مکارم الاخلاق.(۱)

امام سحنون فرماتے ہیں کہ وہ وعدہ جو لازم ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص دوسرے سے یہ وعدہ کرے کہ تم اپنے گھر کو منہدم کر دو، میں اس کو دوبارہ بنانے کے لئے قرض فراہم کروں گا، یا یہ کہے کہ تم حج کے لئے چلو، میں تمہیں خرچ کے لئے قرضہ دوں گا، یا یہ کہے کہ تم یہ سامان خرید لو، یا فلاں عورت سے شادی کر لو، میں خرچ کے لئے قرضہ دوں گا (اس قسم کے وعدہ کو پورا کرنا قضاءً لازم ہے) اس لئے کہ اس وعدہ کے ذریعہ تم نے اس کو اس معاملے میں داخل کیا ہے، البتہ اگر محض وعدہ ہو، جس کے ذریعہ موعود لہ کو کسی معاملے کے اندر داخل نہ کرے تو اس وعدہ کو پورا کرنا قضاءً تو لازم نہیں، البتہ اس وعدہ کو پورا کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے۔

شیخ علیش مالکیؒ اپنے فتاویٰ میں وعدہ کے لازم ہونے کے بارے میں تین اقوال ذکر کرنے کے بعد

(۱) کتاب الفروق للقرافی، ج ۴، ص ۲۴، ۲۵۔

فرماتے ہیں:

والرابع: یقضی بها ان کانت علی سبب، ودخل الموعود بسبب العدة فی شیء، وهذا هو المشهور من الاقوال ...... قال اصبغ سمعت اشهب سئل عن رجل اشتری من رجل کرما، فخاف الوضیعة فاتی لیستوضعه فقال له: بع وانا ارضیك قال: ان باع براس ماله او بربح فلا شی علیه وان باع بالوضیعة کان علیه ان یرضیه ...... وهذا القول الذی شهره ابن رشد فی القضاء بالعدة اذا دخل بسببها فی شیء قال الشیخ ابوالحسن فی اول کتاب الاول انه مذهب المدونة، لقولها فی اخر کتاب الغرر، وان قال: اشتر عبد فلان وانا اعینك بالف درهم فاشتراه لزمه ذلك الوعد اه وهو قول ابن القاسم فی سماعه من کتاب العاریة وقول سحنون فی کتاب العدة. (۱)

چوتھے یہ کہ اس وعدہ کو قضاءً لازم ہونے کا حکم دیا جائے گا، اگر یہ وعدہ کسی معاملے پر مبنی ہو، اور اس وعدہ کی وجہ سے موعود لہ اس معاملے کو اختیار کرلے، یہی قول زیادہ مشہور ہے...... اصبغ فرماتے ہیں کہ میں نے اشہب سے یہ مسئلہ سنا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے انگور خریدے، لیکن خریدنے کے بعد مشتری کو نقصان کا اندیشہ ہوا، چنانچہ وہ اس کی قیمت کم کرانے کے لئے بائع کے پاس آیا تو بائع نے اس سے کہا کہ تم یہ انگور آگے فروخت کردو، اگر تمہارا نقصان ہوا تو میں اس کی تلافی کرکے تمہیں راضی کردوں گا۔ اس صورت میں اگر وہ مشتری وہ انگور اسی قیمت پر آگے فروخت کردے تو اس صورت میں بائع کے ذمے کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔ لیکن اگر مشتری نقصان کے ساتھ فروخت کرے تو اس صورت میں بائع کے ذمے لازم ہے کہ وہ نقصان کی تلافی کرکے مشتری کو راضی کرے...... علامہ ابن رشدؒ نے اسی قول کو لیا ہے کہ قضاءً ایسا وعدہ پورا کرنا لازم ہے جس وعدہ کے ذریعہ موعود لہ کسی معاملے میں مبتلا ہو جائے، شیخ ابوالحسنؒ کتاب اول کے ابتداء میں فرماتے ہیں کہ ''مدونہ'' کا بھی یہی مسلک ہے اس لئے کہ کتاب الغرر کے آخر میں ہے کہ اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ تم فلاں شخص کا غلام خریدلو، میں ایک ہزار دراہم کے

(۱) فتح العلی المالک، ج۱، ص۲۵۵۔

ذریعہ تمہارے ساتھ (ثمن کی ادائیگی میں) تعاون کروں گا۔ اگر اس نے وہ غلام خرید لیا تو اس صورت میں اس وعدہ کرنے والے کے ذمے ایک ہزار درہم لازم ہو جائیں گے۔ کتاب العاریۃ میں ابن القاسم کا یہی قول مذکور ہے، امام سحنون کا بھی کتاب العدۃ میں یہی قول مذکور ہے۔

حنفیہ کے اصل مسلک میں وعدہ اگرچہ قضاءً لازم نہیں ہوتا، لیکن متاخرین فقہاءِ حنفیہ نے کئی مقامات پر وعدہ کو لازم قرار دیا ہے

چنانچہ ردالمحتار میں ''شرط فاسد'' کے بیان میں ہے کہ:

وفی جامع المفصولین ایضا: لو ذکر البیع بلا شرط ثم ذکر الشرط علی وجہ العدۃ جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد، اذا المواعید قد تکون لازمۃ فیجعل لازمًا لحاجۃ الناس.

جامع المفصولین میں بھی ہے کہ اگر بیع بلا شرط کی جائے اور پھر شرط کا ذکر بطور وعدہ کے کیا جائے تو اس صورت میں وہ بیع جائز ہو جائے گی، اور اس وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ وعدے کبھی لازم بھی ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس وعدہ کو بھی لازم کیا جائے گا۔

اس کے بعد علامہ رملیؒ کے فتاوی خیریہ سے نقل کیا ہے کہ:

فقد صرح علماء نا بانھما لو ذکر البیع بلا شرط ثم ذکر الشرط علی وجہ العدۃ جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد۔

ہمارے علماء نے اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر عاقدین بلا شرط کے بیع کرلیں، اور پھر بطور وعدہ کے کوئی شرط لگالیں تو اس صورت میں بیع درست ہو جائے گی، اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا۔

پھر اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

وقد سئل الخیر الرملی عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقدہ وعقد البیع خالیًا عن الشرط فاجاب بانہ صرح فی الخلاصۃ والفیض والتتار خانیۃ وغیرھا بانہ یکون علی ما تواضعا۔

علامہ خیرالدین رملیؒ سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر دو آدمی عقد سے پہلے بیع الوفا کے انعقاد پر معاہدہ کرلیں اور پھر عقد بیع غیر مشروط طور پر کرلیں (تو یہ جائز ہے یا

نہیں؟) علامہ رملیؒ نے جواب دیا کہ خلاصہ فیض اور تتار خانیہ وغیرہ میں صراحت کے ساتھ یہ موجود ہے کہ اگر عاقدین اس طرح عقد کرلیں تو یہ عقد اسی طرح منعقد ہو جائے گا جس طرح عاقدین نے معاہدہ کیا تھا۔(۱)

چنانچہ علماءِ حنفیہ نے ان عبارات فقہیہ میں اسی بات کی تصریح کی ہے کہ ''وعدہ'' بعض اوقات لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علامہ خالد الاتاسی نے ''بیع الوفاء'' کی بحث میں فتاویٰ خانیہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ:

وان ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة فالبيع جائز، ويلزم الوفاء بالوعد لان المواعيد قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس.(۲)

اگر بیع غیر مشروط طور پر کی جائے، اور پھر بطور وعدہ کے شرط کا ذکر کیا جائے تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی، اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہوگا، اس لئے کہ وعدے بھی لازم ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کی ضرورت کے لئے اس وعدہ کو لازم کیا جائے گا۔

لہٰذا فقہاء کے مندرجہ بالا اقوال کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ مستقبل میں ہونے والے اجارۃ اور بیع کے ایگریمنٹ میں فریقین آپس میں جو وعدہ فی الحال کرلیں تو وہ وعدہ قضاءً بھی لازم ہوگا۔

جواب کا خلاصہ

اوپر ہم نے جو تفصیلی جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بینک کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس تفصیلی جواب کے بالکل ابتداء میں ہم نے جو پہلا طریقہ بیان کیا تھا، اس کے مطابق بینک گاہک کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرے، اس لئے کہ اس طریقے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے۔ اور اختلاف اور شبہات سے دور رہنا زیادہ بہتر ہے۔

البتہ اگر کسی وجہ سے اس طریقہ پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو پھر بینک نے جو صورت پیش کی ہے، اس کو شرعی طور پر جائز کرنے کے لئے اس میں مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔ بینک اور گاہک کے درمیان جو ایگریمنٹ لکھا جائے، اس میں گاہک کو سامان خریدنے کے

(۱) ردالمحتار، ج۴، ص ۱۳۵، باب البیع الفاسد مطلب فی الشراء الفاسد اذا ذکر بعد العقد اوقبلہ۔

(۲) شرح المجلۃ لخالد الاتاسی، ج۲، ص ۴۱۵۔

لئے وکیل بنانے کا معاملہ تو قطعی اور یقینی ہو، لیکن اس ایگریمنٹ میں اجارہ اور بیع کا تذکرہ صرف بطور وعدہ کے ہو، قطعی اور فیصلہ کن طریقہ پر ان کا عقد نہ کیا جائے۔

۲۔ جب گاہک سامان خرید کر اس پر قبضہ کر لے، اور اس کو اپنے یہاں نصب کر لے، اس کے بعد عقد اجارہ بالمشافہہ یا مراسلت کے ذریعہ کیا جائے، اور اس عقد اجارہ کے وقت بیع کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

۳۔ سامان کی خریداری کے بعد اور عقد اجارہ ہونے سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا۔

۴۔ مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد پھر بیع قطعی طور پر کی جائے۔

۵۔ ایگریمنٹ میں فریقین کی طرف سے اجارہ اور بیع کا جو وعدہ ہوگا، قضاءً اور دیانۃً اس وعدہ کو پورا کرنا فریقین پر لازم ہوگا۔

۶۔ اگر فریقین میں کوئی ایک وعدہ اجارہ یا وعدہ بیع کی خلاف ورزی کرے گا تو اس وعدہ خلافی کے نتیجے میں فریقِ ثانی کو جو مالی نقصان ہوگا فریقِ اول اس نقصان کی تلافی کرے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اسلامی ترقیاتی بینک کا ممبر ممالک کے ساتھ اُدھار بیع کا معاملہ کرنا

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک اپنے ممبر ممالک کی ترقی اور مصلحت کی خاطر صنعتی پروجیکٹس اور دوسرے سامان کی خرید وفروخت کے لئے کرایہ داری کے معاملات کے علاوہ ''ادھار بیع'' کا معاملہ بھی کرتا ہے، اور ممبر ممالک کو پروجیکٹس میں جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو بازار سے خرید کر پھر ممبر ممالک کو فروخت کرنے کے لئے بینک ''ادھار بیع'' کے معاملے کو اضافی وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کا طریقِ کار یہ ہے کہ بینک اس ممبر ملک کو اپنی طرف سے اس سامان کی خریداری کا وکیل بنا دیتا ہے، اور بینک خریدے ہوئے سامان کی قیمت براہِ راست سپلائر کو ادا کر دیتا ہے، اور اس سپلائر کے ساتھ بینک یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ براہِ راست وہ سامان اس ممبر ملک کو بھیج دے، پھر جب وہ ممبر ملک بینک کی طرف سے وکیل بن کر اس سامان پر اس کے تمام اوصاف کے مطابق قبضہ کر لیتا ہے، تو اس کے بعد بینک وہ سامان ممبر ملک کو خریداری کی قیمت سے کچھ زائد قیمت پر اس شرط پر فروخت کر دیتا

ہے کہ وہ ممبر ملک اس سامان کی قیمت طے شدہ قسطوں کے مطابق ادا کر دے گا۔ جو قسطیں تین سال سے دس سال کے درمیان ہوں گی۔

کیا اس طریقے پر ادھار معاملہ کر کے قسطوں پر قیمت وصول کرنا بینک کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

اس معاملے میں فقہی اعتبار سے صرف ایک بات قابلِ غور ہے، وہ یہ کہ بیع کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ مبیع بائع یا اس کے وکیل کے قبضے میں ہو ـــــ پھر حنابلہ نے اس شرط کو طعام کی بیع کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک طعام کے علاوہ دوسری اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہے۔ اور مالکیہ نے قبضہ میں ہونے کی شرط کو کیلی اور وزنی چیزوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک کیلی اور وزنی چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی بیع میں قبضہ شرط نہیں ہے۔ امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک مبیع کا بائع کے قبضہ میں ہونا تمام مبیعات میں ضروری ہے، چاہے وہ طعام ہو یا کیلی وزنی چیز ہو، یا زمین ہو۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک زمین کے علاوہ باقی اشیاء میں آگے فروخت کرنے کے لئے بائع کا قبضہ ضروری ہے۔ (1)

قبضہ سے پہلے مبیع کو آگے بیچنے کی ممانعت میں بہت سی احادیث مروی ہیں، صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ابتاع طعامًا فلا يبعه حتى يستوفيه۔ قال ابن عباس: واحسب كل شئ مثله۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فرمایا کہ جو شخص غلہ بیچنے کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ قبضہ میں لانے سے پہلے فروخت نہ کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حکم غلہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام چیزوں میں عام ہے۔

ابوداؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قصے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

فان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى ان تباع السلع حيث تبتاع حتى يحوز التجار الى رحالهم۔

(1) فتح القدیر لابن الهمام، ج ۵، ص ۲۶۶۔ المغنی لابن قدامۃ، ج ۴، ص ۱۱۳۔

یعنی حضور اقدس ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ جو چیز جہاں خریدی ہے، وہیں فروخت کر دی جائے، جب تک کہ اس چیز کو تجار اپنے کجاؤں میں نہ لے آئیں۔ (۱)

امام بیہقیؒ نے حکیم بن حزام سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

قلت یا رسول الله! انی ابتاع هذه البیوع فما یحل لی منها؟ وما یحرم علی؟ قال: یا ابن اخی لا تبیعن شیئًا حتی تقبضه۔

فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں خرید و فروخت کرتا رہتا ہوں، میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اے بھتیجے قبضہ کرنے سے پہلے کسی چیز کو آگے فروخت مت کرنا۔ (۲)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند حسن اور متصل ہے، اور ابن القیم تہذیب السنن میں فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند شیخین کی شرائط پر ہے، سوائے ایک راوی عبداللہ بن عصمۃ کے، مگر ان کو ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے، اور امام نسائی نے ان کو قابلِ استدلال سمجھا ہے۔ (۳)

سنن ترمذی میں ہے کہ:

عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: "لا یحل سلف و بیع ولا شرطان فی بیع، ولا ربح ما لم یضمن۔"

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ قرضہ اور بیع (کو جمع کرنا) حلال نہیں، اور نہ بیع میں دو شرطیں لگانا، اور نہ ایسی چیز کا نفع حاصل کرنا حلال ہے جو ابھی ضمان میں نہیں آئی۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے "ربح ما لم یضمن" یعنی ایسی چیز کا نفع لینے سے منع فرمایا جو چیز نفع لینے والے کے ضمان میں نہیں آئی اور قبضہ سے پہلے آگے فروخت کرنا اس میں داخل ہے، اس لئے کہ جب تک مشتری مبیع پر قبضہ نہ کر لے، اس وقت تک وہ مبیع اس کے ضمان میں نہیں آتی، لہٰذا اگر مشتری مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے آگے نفع پر فروخت کر دے تو یہ "ربح ما لم یضمن" ہو جائے گا، جو جائز نہیں۔

---

(۱) ابوداؤد، حدیث نمبر ۳۴۹۶۔ المستدرک للحاکم، ج ۲، ص ۴۰۔

(۲) سنن بیہقی، ج ۵، ص ۳۱۳۔ (۳) تہذیب السنن، ج ۵، ص ۱۳۱۔

لہٰذا اگر وہ سامان کیلی اور وزنی نہ ہو تو اس صورت میں حنابلہ اور شوافع کے نزدیک اگرچہ بیع جائز ہے، مگر مندرجہ بالا احادیث عام ہیں اور ہر قسم کی مبیع کو شامل ہیں، لہٰذا ان احادیث کے عموم کی طرف نظر کرتے ہوئے، اور اختلاف سے بچتے ہوئے مناسب یہ ہے کہ بینک اس سامان کو گاہک کے ہاتھ فروخت کرنے سے پہلے یا تو بذاتِ خود اس پر قبضہ کر لے، یا اپنے وکیل کے ذریعے اس پر قبضہ کرائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بینک اس گاہک کے شہر ہی میں اپنا کوئی نمائندہ یا ایجنٹ مقرر کر دے جو بینک کی طرف سے وکیل بن کر اس سامان پر قبضہ کرے، اور پھر مشتری کو فروخت کر دے۔ اور یہ صورت بھی ممکن ہے کہ بینک جہاز راں کمپنی کو اس سامان پر قبضہ کرنے کا وکیل بنا دے، اس صوت میں اس سامان کو جہاز پر سوار کرنے کے بعد مشتری کی بندرگاہ تک پہنچنے سے پہلے بھی بینک عقد بیع کر سکتا ہے۔

اور اگر بینک اسی گاہک کو جو اس سامان کو خریدنا چاہتا ہے، اس بات کا وکیل بنا دے کہ وہ اپنے شہر کی بندرگاہ پر بینک کے وکیل کے طور پر اس سامان پر قبضہ کر لے، تو اس صورت میں بینک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے گاہک سے بیع کا معاملہ فون پر یا خط و کتابت کے ذریعہ اس وقت کرے جب وہ اس سامان پر قبضہ کر لے، اور اس عقد بیع سے پہلے صرف وعدہ بیع کا معاملہ ہوگا۔ البتہ اس وعدہ کو پورا کرنا گاہک کے ذمے قضاءً لازم ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے مسئلے میں تفصیل سے بیان کیا ــــ اور بیع کے انعقاد سے پہلے اور وکیل کے قبضے کے بعد وہ سامان بینک ہی کے ضمان میں رہے گا، چاہے اس سامان پر بحیثیت وکیل کے قبضہ کرنے والا وہی گاہک ہو جو اسی مال کو خریدنے والا ہے، یا کوئی اور ہو۔ لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان تباہ ہوگیا تو وہ بینک کا نقصان ہوگا، بشرطیکہ اس وکیل نے (جو بعد میں وہ سامان خریدنے والا ہے) اس کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی ہو۔

بینک کا اپنے ممبر ممالک کے ساتھ ادھار اور قسطوں پر بیع مرابحہ کا معاملہ کرنا

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک خارجی تجارت میں سرمایہ کاری کے لئے ممبر ممالک کے ساتھ ادھار اور قسطوں پر بیع مرابحہ کا معاملہ کرتا ہے، اور یہ معاملہ ممبر ممالک کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انجام دیتا ہے۔

خارجی تجارت کے معاملات میں اصل یہ ہے کہ بینک کا کوئی ممبر ملک جب ترقیاتی نوعیت کا

کوئی سامان خریدنا چاہتا ہے تو اسلامی ترقیاتی بینک اس ملک کی طلب دیکھنے اور اس سے آرڈر حاصل کرنے کے بعد وہ سامان بازار سے خریدتا ہے، اور پھر اس ممبر ملک کو فروخت کر دیتا ہے ـــــ اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ بینک اس مقصد کے لئے ایک معاہدہ کرتا ہے۔ اس معاہدے کے فریق بینک کے علاوہ ممبر ملک (خریدار پارٹی) اور اسی ممبر ملک میں بینک کی طرف سے مقرر کردہ ایک وکیل بھی ہوتا ہے، جس کو بینک مطلوبہ سامان خریدنے اور پھر بینک کی طرف سے وکیل بن کر اس پر قبضہ کرنے اور ممبر ملک کو فروخت کرنے کے لئے متعین کرتا ہے۔ چنانچہ وہ وکیل اس ممبر ملک کو وہ سامان اس قیمت پر بینک کی طرف سے فروخت کر دیتا ہے جو قیمت بینک مقرر کرتا ہے ـــــ اور عام طور پر یہ اس قیمت خرید میں بینک اپنا متعین نفع بھی شامل کر لیتا ہے، جو قیمت اس نے اپنے وکیل کے ذریعے معاہدے کے مطابق سپلائر کو ادا کی ہے ـــــ اور عام طور پر خارجی تجارت کے معاہدوں میں بینک کی طرف سے معین کردہ وکیل ہی ثمن کی ادائیگی کا ضامن ہوتا ہے۔

کیا بینک کے لئے اس طریقے سے بیع مرابحہ کا معاملہ کرنا جائز ہے؟

جواب:

بیع مرابحہ کا جو طریقہ سوال میں مذکور ہے، یہ طریقہ شرعاً جائز ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں بیع بعد القبض ہوگی، اور مبیع پر قبضہ بینک کا وکیل کرے گا، جس کو بینک نے مشتری کے شہر ہی میں اپنا وکیل مقرر کیا ہے ـــــ اور اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے کہ بینک کا وکیل مشتری کی طرف سے بھی اداء ثمن کا کفیل بن جائے ـــــ اور ایگریمنٹ میں یہ بات طے شدہ ہوگی کہ عقد بیع کے انعقاد سے پہلے وہ بیع نہیں ہوگی، بلکہ وعدہ بیع ہوگی، اور فریقین کے لئے اس وعدہ کو قضاءً پورا کرنا لازم ہوگا، جیسا کہ دوسرے سوال کے جواب میں ہم نے تفصیل سے ذکر کیا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بینک نے جس ریٹ پر اس سامان کو خریدا ہے، اس پر معین نفع کی زیادتی کے ساتھ مشتری کو فروخت کرے گا، اور ثمن ایک معین مدت کے بعد وصول کرے گا، تو شرعاً اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک اس قسم کا عقد جائز ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:

وقد فسر بعض اهل العلم۔ قالوا: بیعتین فی بیعة ان یقول: ابیعك هذا الثوب بنقد بعشرة، وبنسیة بعشرین، ولا یفارقه احد البیعین فاذا فارقه علی احدهما فلا باس اذا كانت العقدة علی احد منهما۔

بعض فقہاء "بیعتین فی بیعة" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مثلاً بائع یہ کہے کہ میں یہ کپڑا نقد دس درہم میں اور ادھار بیس درہم میں فروخت کرتا ہوں، لیکن پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کرتے ہوئے فریقین کے درمیان جدائی نہ ہوئی (تو یہ صورت ناجائز ہے، اور بیعتین فی بیعة میں داخل ہے) البتہ اگر فریقین ایک بیع پر یعنی نقد یا ادھار پر اتفاق کرتے ہوئے جدا ہو گئے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں۔ (۱)

امام عبدالرزاق نے مصنف عبدالرزاق میں امام زہری، طاؤس اور سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے یہ حضرات فرماتے ہیں:

لا باس بان یقول: ابیعك هذا الثوب بعشرة الی شهر، او بعشرین الی شهرین، فباعه علی احد هما قبل ان یفارقه فلا باس به، وهکذا عن قتادة. (۲)

اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ بائع یہ کہے کہ میں یہ کپڑا ایک ماہ کے ادھار پر دس درہم میں اور دو ماہ کے ادھار پر بیس درہم میں فروخت کرتا ہوں۔ اور پھر جدائی سے پہلے ایک صورت پر اتفاق کر کے کپڑا بیچ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، امام قتادہ سے بھی یہی منقول ہے۔

امام محمد بن حسن شیبانیؒ فرماتے ہیں:

قال ابوحنیفة فی الرجل یکون له علی الرجل مائة دینار الی اجل، فاذا حلت قال له الذی علیه الدین، بعنی سلعة یکون ثمنها مائة دینار نقدًا، بمائة وخمسین الی اجل، ان هذا جائز، لانها لم یشترطا شیئًا ولم یذکرا امرًا یفسد به الشراء. (۳)

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کے دوسرے کے ذمے سو دینار دین تھے، جو معین تاریخ پر ادا کرنے تھے۔ جب وہ معین تاریخ آئی تو اس شخص نے دوسرے شخص سے جس پر دین تھا یہ کہا کہ فلاں سامان جس کی قیمت نقد کے اعتبار سے سو

---

(۱) جامع ترمذی، ج۴، ص۵۳۳، باب ماجاء فی النہی عن بیعتین فی بیعۃ، حدیث نمبر ۱۲۳۱۔
(۲) مصنف عبدالرزاق، ج۸، ص۱۳۶۔
(۳) کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ، ج۲، ص۶۹۴، باب مایجوز فی الدین ومالا یجوز فیہ۔

دینار ہے، مجھے ادھار ایک سو پچاس دینار میں فروخت کر دو ــــ یہ صورت جائز ہے، اس لئے کہ اس عقد کے اندر فریقین نے کوئی شرط نہیں لگائی، اور نہ ہی فریقین نے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا ہے، جو اس معاملے کو فاسد کر دے۔

غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں سے حاصل ہونے والے سود کو استعمال میں لانا

علماء اور بینک کے ماہرین کی رپورٹ میں غور و خوض

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ کی نگراں بورڈ کا اجلاس مؤرخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا مقصد اسلامی ترقیاتی بینک کو غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں میں رکھی ہوئی رقم پر حاصل ہونے والے سود کو استعمال میں لانے کے بارے میں شرعی نقطہ نظر سے غور و خوض کرنا تھا۔

چنانچہ فاضل علماء کی رپورٹ میں پیش کردہ تجاویز کی روشنی میں بینک کی نگران بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عالمی بینک سے حاصل ہونے والے سود کا پچاس فیصد ''اسپیشل فنڈ'' کے طور پر رکھا جائے۔ یہ اسپیشل فنڈ عالمی مارکیٹ میں کام کرنے والے بینکوں کی شاخوں میں رکھی ہوئی امانتوں کا پچاس فیصد ہوگا، اور اس ''اسپیشل فنڈ'' کا مقصد یہ ہے کہ بینک میں امانت کے طور پر رکھی ہوئی کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کے نتیجے میں بینک کے سرمائے کی قیمت میں جو خسارہ اور نقصان ہوگا، اس کی تلافی کے لئے یہ ''اسپیشل فنڈ'' مختص ہوگا۔

اور دوسرے پچاس فیصد سود کو ''معونۃ خاصہ'' کے لئے مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا۔

نگراں بورڈ کے فیصلے کے نتیجے میں اس ''معونۃ خاصہ'' کو مندرجہ ذیل اغراض میں صرف کیا جائے گا:

(الف) ممبر ممالک کی معاشی، مالی، اور بینکاری کی سرگرمیوں کو اعتدال میں رکھنے کے سلسلے میں تربیت و تحقیقات میں شریعت کے احکام کے مطابق اس کو صرف کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۱ء) میں جدہ "المعهد الاسلامی للبحوث والتدريب" کی

بنیاد رکھی گئی ہے۔اس وقت یہ ادارہ تحقیقات اور تربیت کے میدانوں میں اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

(ب) ناگہانی حوادث اور آفات کی صورت میں ممبر ممالک اور اسلامی سوسائٹیوں کو سامان اور مناسب خدمات کی شکل میں بطور اعانت اس ''معونۃ خاصہ'' میں سے رقم ادا کی جائے گی۔

(ج) اسلامی مسائل کی تائید اور ان کو انجام دینے کے لئے ممبر ممالک کو مالی امداد کی فراہمی اس ''معونۃ خاصہ'' سے کی جائے گی۔

(د) ممبر ممالک کو فنی امداد کی فراہمی بھی اس ''معونۃ خاصہ'' سے کی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں سے حاصل ہونے والے سود کو مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق ''اسپیشل فنڈ'' یا ''معونۃ خاصہ'' میں رکھ کر اس سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

اس سلسلے میں علماءِ شریعت کا جو اجتماع مؤرخہ ۱۳۹۹/۳/۱۱ھ کو ہوا تھا، اس میں ان علماء نے جو متفقہ سفارشات پیش کی تھیں، ہم بھی ان سفارشات کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ان بینکوں کا سود بھی حقیقت میں عین ربا ہی ہے، اور جمہور فقہاء کا صحیح اور مختار قول یہی ہے کہ سود حرام ہے، اگرچہ وہ کسی حربی سے لیا جائے۔لہٰذا مسلمان کے لئے اس سود کو وصول کر کے اپنے ذاتی کاموں میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

لیکن دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ موجودہ حالات کے لحاظ سے غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں سود کی بھاری رقم کو چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔اس لئے ان علماء نے اس سے بچنے کے لئے یہ صورت نکالی کہ اولاً تو بینک اس بات کی پوری کوشش کرے کہ جتنا جلد ممکن ہو اپنی رقم سودی بینکوں میں رکھوانے سے کسی طرح خلاصی حاصل کریں۔لیکن جب تک یہ عمل مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک بینک کو جو سود اس رقم پر ملے وہ اس کو علیحدہ اکاؤنٹ میں رکھے، اور پھر اس کو فقراء اور غریبوں پر خرچ کرے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سودی بینکوں سے حاصل ہونے والی سود کی نصف رقم اسپیشل فنڈ میں رکھ دی جائے تو میرے نزدیک یہ صورت شرعاً جائز نہیں، اس لئے کہ اسپیشل فنڈ بینک کے تمام اثاثوں ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔اور بعض اوقات ہنگامی طور پر سرمایہ کی قیمت میں کمی کی وجہ سے بینک

کو جو نقصان ہوتا ہے، اس کی تلافی اس اسپیشل فنڈ سے کی جاتی ہے۔ اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ بینک کے سود سے انتفاع کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

لہٰذا اسلامی بینک کو چاہئے کہ وہ غیر اسلامی بینک سے حاصل ہونے والے سود کو صرف معونتہ خاصہ کے مقصد کے لئے مختص کر دے۔

لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کا اجرت یا کمیشن لینا

سوال:

جو لوگ باہر سے مال منگواتے ہیں، ان کو کسی بینک میں ایل سی کھلوانی پڑتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بینک اس کے لئے ''لیٹر آف کریڈٹ'' جاری کرتا ہے۔ اور جس میں بینک اس شخص کی ضمانت لیتا ہے۔ اور پھر بینک اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بینک کے لئے اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:

اس موضوع پر میں نے ڈاکٹر رفیق مصری کی تجاویز کا جائزہ لیا۔ لیکن اس مسئلے میں میرا وہی جواب ہے جو ''سروس چارج'' کے مسئلے میں عرض کیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ کفالت یا ضمانت پر اجرت لینا شرعاً حرام ہے۔ میرے علم کے مطابق کسی ایک فقیہہ نے بھی اس کو جائز نہیں کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی اجرت ہے جو کسی مال یا عمل کے عوض میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں کفالت کو عقد تبرع میں شمار کیا جاتا ہے۔ عقود معاوضہ میں شمار نہیں ہوتا اور یہ ایسی واضح بات ہے جس کے لئے دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ''کفیل'' کے لئے نفس کفالت پر تو اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر کفیل کو اس کفالت پر کچھ عمل بھی کرنا پڑتا ہے، مثلاً اس کے بارے میں اس کو لکھنا پڑھنا پڑتا ہے، اور دوسرے دفتری امور بھی انجام دینے پڑتے ہیں، یا مثلاً کفالت کے سلسلے میں اس کو ''مضمون لہ'' (جس کے لئے ضمانت لی گئی ہے اور ''مضمون عنہ'' جس کی طرف سے ضمانت لی ہے) سے ذاتی طور پر یا خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ کرنا پڑتا ہے، اس قسم کے دفتری امور کو تبرعاً انجام دینا ضروری نہیں، بلکہ کفیل کیلئے مکفول لہ سے یا مکفول عنہ سے ان تمام امور کے انجام دینے پر اجرت مثل کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

آج کل جو بینک کسی کی ضمانت لیتے ہیں تو وہ صرف زبانی ضمانت نہیں لیتے، بلکہ اس ضمانت پر بہت سے دفتری امور بھی انجام دیتے ہیں، مثلاً خط و کتابت کرنا، کاغذات وصول کرنا، پھر ان کو سپرد کرنا، رقم وصول کرنا، پھر اس کو بھیجنا وغیرہ، اور ان کاموں کے لئے اسے ملازمین، عملہ، دفتر، عمارت اور دوسری ضروری اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب بینک جو یہ تمام امور انجام دے رہا ہے یہ فری فنڈ میں مفت انجام دینا اس کے لئے واجب نہیں ہے۔ چنانچہ ان امور کی انجام دہی کے لئے بینک کے لئے اپنے گاہکوں سے مناسب اجرت لینا جائز ہے، البتہ نفس ضمانت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اور پھر بینک بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بھی بنتا ہے، اور بحیثیت دلال یا وکیل کے بہت سے امور انجام دیتا ہے، اور شرعاً دلالی اور وکالت پر اجرت لینا جائز ہے، لہٰذا ان امور کی ادائیگی میں بھی بینک کے لئے اپنے گاہک سے اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

چنانچہ اب بینک کے لئے گاہک سے دو قسم کی اجرتوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

۱۔ لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کو جو دفتری امور انجام دینے پڑتے ہیں ان امور پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

۲۔ وکالت یا دلالی پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

البتہ بینک اپنے گاہک سے یہ دو قسم کی جو اجرتیں وصول کرے گا، اس میں یہ ضروری ہے کہ وہ اجرت ان کاموں کی اجرت مثل سے زائد نہ ہو، اس لئے کہ اگر یہ اجرت مثل سے زائد ہوگی تو پھر یہ تو نفس ضمان پر اجرت وصول کرنے کا ایک حیلہ بن جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے سوال نمبر ایک کے جواب میں تفصیل سے عرض کر دیا ہے۔

بہر حال، جب بینک کو یہ دو قسم کی اجرتیں حاصل ہوگئیں تو اب نفس ضمان پر اجرت لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جہاں تک ڈاکٹر رفیق مصری کی اس تجویز کا تعلق ہے کہ چونکہ پہلے زمانے میں ایک شخص محض تبرعاً و احساناً دوسرے شخص کی ضمانت دیتا تھا مگر چونکہ اب ضمانت دینا ایک منظم پیشہ اختیار کر گیا ہے اس لئے نفس ضمانت پر اجرت لینا ان حالات میں جائز ہونا چاہئے، ہم قابل احترام ڈاکٹر رفیق صاحب کی اس تجویز سے کسی طرح بھی اتفاق نہیں کر سکتے۔ اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم ابتداءً ہی اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اگر کوئی شخص انفراداً کوئی ایسا عمل کرے جس پر اس کو اجرت لینا جائز نہ ہو لیکن اگر وہی عمل منظم پیشے کی شکل میں اختیار کر لے تو اس پر اجرت لینا جائز ہو جائے گا، اگر ہم اس دلیل کو درست تسلیم کر لیں تو پھر اس دلیل کی بنیاد پر یہ بھی کہا جائے گا کہ چونکہ پہلے زمانے میں قرض دینے کا معاملہ صرف قرض دینے والے متبرعین تک منحصر تھا،

اس لئے کسی شخص کو بطور قرض کے بہت بڑی رقم کی ضرورت تو ہوتی نہیں تھی، اس کے علاوہ اس زمانے میں تبرعاً قرض دینے والے افراد بہت ہوتے تھے، مگر چونکہ آج کے دور میں لوگوں کو بطور قرض بڑی بڑی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے، اور تبرعاً قرض دینے والے لوگ بھی اب موجود نہ رہے، اس لئے اب قرض دینے کا معاملہ ایک پیشہ اختیار کر گیا ہے جس کے لئے بینک قائم کیے گئے ہیں، لہٰذا اب نفس قرض پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہونا چاہئے۔

اب ظاہر ہے کہ قرض کے معاملے میں اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ قرض پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے، اسی طرح ''ضمانت'' کے معاملے میں بھی اس دلیل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

جہاں تک امام، موذن اور معلم وغیرہ کی اجرت کا تعلق ہے، تو یہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ تھا، بہت سے فقہاء مثلاً امام شافعیؒ وغیرہ نے اس اجرت کو شروع سے جائز کہا ہے، اور اس کے جواز پر بعض احادیث سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ جب ضرورت زیادہ ہوئی، اور ان خدمات کے لئے متبرعین کا فقدان ہو گیا تو ضرورۃً فقہاء حنفیہ نے اس اجرت کو جائز قرار دیا ـــــ لیکن جہاں تک ''ضمانت'' پر اجرت کا تعلق ہے تو یہ کوئی مجتہد فیہ مسئلہ نہیں ہے، (بلکہ متفقہ مسئلہ ہے) اس لئے ''ضمانت'' پر اجرت لینے کے مسئلے کو طاعات پر اجرت لینے پر قیاس کرنا درست نہیں۔

جہاں تک لکڑیاں کاٹنے کے لئے یا شکار کرنے کے لئے کسی کو اجرت پر لینے کا تعلق ہے تو یہ اصلاً جائز ہے۔ اور لکڑیاں اور شکار کیے ہوئے جانور اجرت پر لینے والے کی ملکیت ہوں گے، اجیر (مزدور) کے نہیں ہوں گے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ اجرت پر لینے والا کوئی فرد ہو یا تجارتی کمپنی ہو۔

۲۔ بہر حال، جب اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ بینک کے لئے اپنے گاہک سے دو قسم کی اجرت لینا جائز ہے، ایک دفتری امور کی انجام دہی پر اجرت لینا، دوسرے وکالت پر اجرت لینا، لہٰذا اب ''عمل ضمانت'' پر اجرت لینے کو جائز کرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ ان دونوں قسم کی اجرت کی مقدار کی تعیین کو بینک پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہٰذا بینک کو اس کی گنجائش ہے کہ ان دونوں کاموں کی اتنی اجرت مقرر کر دے جو موجودہ دور کے عرف مطابق ان خدمات کے لئے کافی ہو جو خدمات بینک نے انجام دینی ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم